اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کے لازوال سرچشمے .... آزادی کے ۷۰ سال

اُردو ڈائجسٹ

اگست ۲۰۱۷ء

ہندوستان میں مسلمانوں کا دینی تشخص خطرے میں تھا

الطاف حسن قریشی کا یادگار انٹرویو ۳۱

اسرائیل اور بھارت کا گٹھ جوڑ

دو مسلم دشمن ایٹمی طاقتوں کا خفیہ اتحاد بے نقاب ۸۶

شہزادہ محمد بن سلمان ۴۰

طاقتور اسلامی مملکت کا یہ جوشیلا ولی عہد کیا اپنے وژن سے عالم اسلام کو متحد کر پائے گا؟

گہرے اثرات کا حامل عدالتی فیصلہ ۹

شمع زیرہ Jetzy ۱۰۷
کی خالق عالمی شہرت یافتہ پاکستانی خاتون

ہمالیہ کا پُراسرار باسی
دیوہیکل ییٹی کی داستانِ عجب ۱۳۵

ققنس ۱۷۵
لافانی زندگی کی علامت ایک طلسماتی پرندہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

نماز کی اہمیت

"آپ میرے ایمان والے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہ نماز کی پابندی رکھیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ خفیہ اور اعلانیہ خیرات بھی کیا کریں اس دن کے آنے سے پہلے پہلے کہ جس دن نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی (کہ کوئی چیز دے کر نیک اعمال خرید لیے جائیں) اور نہ ہی اس دن کوئی دوستی کام آئے گی (کہ کوئی دوست تمہیں نیک اعمال دے دے)۔

(سُورۃ ابراھیم: آیت ۳۱)

رسول ﷺ کا فرمان

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں ایسے عمل نہ بتلاؤں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹاتے ہیں اور درجے بلند فرماتے ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ضرور بتلائیے۔ ارشاد فرمایا: ناگواری و مشقت کے باوجود کامل وضو کرنا، مساجد کی طرف کثرت سے قدم اُٹھانا اور ایک نماز کے بعد دوسری کے انتظار میں رہنا یہی حقیقی رِباط ہے۔

(رواہ مسلم، حدیث ۵۸۷)



اُردو ڈائجسٹ

اگست 2017ء
ذیقعد/ذی الحجہ 1438ھ
جلد نمبر 57 شمارہ نمبر 08

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
ڈپٹی ایڈیٹر: سیّد عاصم محمود
سب ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان، ذیشان محمد بیگ
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
پروف خواں: ارم ناز
ڈیزائنر و کمپوزر: فیصل ایوب، کاشف شہزاد

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0300-4005579
لاہور: ندیم حامد

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk
فون: +92-42-35290707
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں
بیرون ملک 100 امریکی ڈالر
اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk editor@urdu-digest.com

قیمت: 100 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر من آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ



آزادی کے تقاضے

میں اہل خانہ کے ساتھ میسی ساگا سے ٹورنٹو شہر جانے بس سٹاپ پر کھڑا تھا۔ بس آئی تو وہاں کھڑے سبھی لوگوں نے خود بخود قطار بنالی۔ وہیل چیئر پر براجمان ایک عمر رسیدہ خاتون بھی موجود تھی۔ بس ڈرائیور نے جیسے ہی اُسے دیکھا، ایک بٹن دبایا اور خودکار سیڑھی کھل گئی تاکہ وہ اوپر چڑھ سکے۔ جب خاتون نشست پر بیٹھ گئی، تو ڈرائیور نے پھر بٹن دبایا مگر سیڑھی ساکت رہی۔ ڈرائیور تیزی سے مختلف بٹن دبانے لگا لیکن سیڑھی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ہر بار ٹک کی آواز آتی اور سیڑھی حرکت کرنے سے انکار کر دیتی۔

تمام مسافر صبر سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بوڑھی عورت کچھ پشیمان لگتی تھی کہ اس کی وجہ سے بھی مسافروں کو انتظار کرنے کی زحمت اٹھانا پڑی۔ اس دوران پیچھے دو اور بسیں آ کھڑی ہوئیں۔ آخر پچھلی بس کے ڈرائیور نے مدد کی اور خودکار سیڑھی اپنی جگہ واپس چلی گئی۔ بس روانہ ہوئی۔ کینیڈین شہر ٹورنٹو میں ائرکنڈیشنڈ اور آرام دہ سرکاری بسیں سفر کا بڑا سستا اور آسان ذریعہ ہیں۔

پندرہ منٹ بعد معذور خاتون کا سٹاپ آ گیا۔ خودکار سیڑھی کھولی گئی۔ جب خاتون اتر گئیں، تو پھر سیڑھی نے اپنی جگہ واپس جانے سے انکار کر دیا۔ ڈرائیور پہلو بدل بدل کر مختلف بٹن دبانے لگا۔ مجھ سمیت سبھی مسافر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور آخر اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا۔ سیڑھی بند ہوتے ہی بس چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد بس میں ڈرائیور کی آواز گونجی: ”میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ سبھی کو انتظار کرنا پڑا۔ میں تجربے کار ڈرائیور ہوں۔ مگر اس بس میں نئی خودکار سیڑھی لگائی گئی ہے جس کے استعمال سے میں ناواقف تھا۔ آپ کو جو کوفت ہوئی، اس پر دوبارہ معذرت خواہ ہوں۔ کوشش ہوگی کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔“

اس واقعے نے بحیثیت پاکستانی مجھے از حد متاثر کیا۔ یہ اجاگر کر گیا کہ مغربی معاشروں میں معذور افراد کو وی آئی پی جیسا درجہ حاصل ہے اور انہیں بے شمار سہولیات میسر ہیں۔ یہ شہریوں کے صبر و تحمل اور نظم و ضبط کی بھی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ ڈرائیور نے اپنے ہوش و حواس بحال رکھے اور اپنی کوتاہی کھلے دل سے تسلیم کرتے ہوئے ہم سے معذرت کا طلبگار بھی ہوا۔ دینِ اسلام نے ہم مسلمانوں کو بھی یہی اعلیٰ معاشرتی اقدار اپنانے کا حکم دیا ہے مگر افسوس، وطن عزیز میں ان کا چلن عام دکھائی نہیں دیتا۔

کینیڈا جیسی انسان دوست اور فلاحی ریاست کی ترقی بعض بنیادی نکات اپنا کر ہی ممکن ہوئی۔ اول یہ کہ اس کا حکمران طبقہ وطن سے محبت رکھتا اور ہر صورت وفادار رہتا ہے۔ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے دیوانہ وار کام کرتا اور اپنی مثبت و تعمیری سرگرمیوں سے مملکت کو معاشی، عسکری و معاشرتی طور پر مضبوط بناتا ہے۔ اس کے ذاتی مفادات کبھی ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ یہی وجہ ہے، جس ملک کو اہل و دیانت دار قیادت ملی، وہ ایک عشرے میں بام دنیا پر جا پہنچا۔ ۱۹۴۷ء سے ہمارا دیس بھی ایسے ہی باصلاحیت، بے لوث اور خوف خدا رکھنے والے حکمرانوں کا شدت سے منتظر ہے جو سخت فیصلے کرنے کی بھی ہمت رکھتے ہوں۔

اہل قیادت کے بعد دوسرا اہم نکتہ مملکت میں عدل و انصاف کی فراوانی اور قانون کی حکمرانی ہے۔ اگر کسی مملکت میں امیر و بارسوخ قانون کی گرفت سے بچنے لگے، تو اس کا معاشرہ ناانصافی، کرپشن، اقربا پروری اور نااہل حکمران طبقے کے سبب تباہ و برباد ہونے لگتا ہے۔ انسان پھر نیکی اور بدی میں تمیز کھو بیٹھتا ہے اور برائی معاشرے میں سرتاپا رچ بس جاتی ہے۔ افسوس کہ پاکستانی معاشرے میں بھی غریب کو انصاف میسر نہیں جبکہ بااثر قانون کا کھلے عام مذاق اڑاتا اور کرپشن کرتا ہے۔

مغربی ممالک نے اکثر معاشرتی اصول و ضوابط دین اسلام سے لیے اور اپنے معاشروں کو انسانی فلاح و بہبود کی معراج پر پہنچا دیا۔ پاکستان کا تو قیام ہی اس لیے عمل میں آیا کہ یہاں اسلامی تعلیمات پر مبنی عظیم معاشرہ تشکیل پائے۔ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی فکر و عمل بھی ہمارے لیے مشعل راہ تھی۔ مگر ہمارے لیڈر پہلے مفاداتی سیاست کے گرداب میں پھنسے اور پھر کرپشن کے گڑھے میں جا گرے۔

آزادی کی ۷۰ ویں سالگرہ پر جذبہ حب الوطنی ہم سے تقاضا کر رہا ہے کہ قیام پاکستان کی حقیقی روح کے مطابق سبھی پاکستانی مل جل کر ترقی و خوشحالی کا ایسا ایجنڈا ترتیب دیں جس کے ذریعے آج تمام سنگین اندرونی و بیرونی چیلنجوں کا مقابلہ بخوبی کیا جا سکے۔

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے، اُمید بہار رکھ

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

اس شمارے میں

فہرست

۸۶

حالاتِ حاضرہ

اسرائیل اور بھارت کا گٹھ جوڑ



ذیشان محمد بیگ

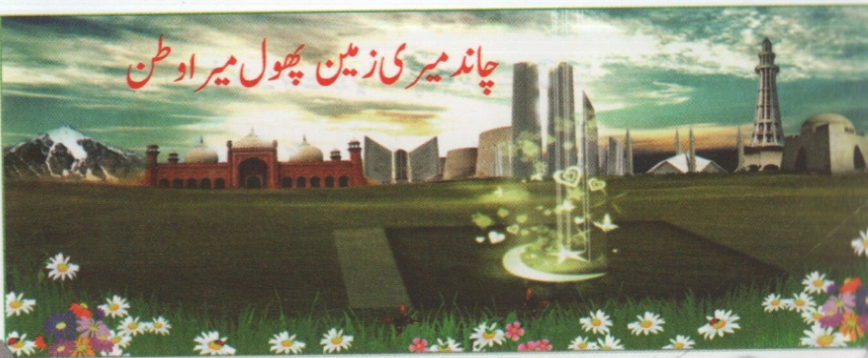
دو مکار ترین اسلام دشمن طاقتوں کو کھلے عام یکجا ہونے کا سنہری موقع مل گیا

یادداشتیں

مونٹریال کا عبداللہ شاہ غازی

محمد ذاکر علی خاں

کینیڈا کے ایک بزرگ پاکستانی سیاح کو حیران



گہرے اثرات کا حامل عدالتی فیصلہ

۲۸ جولائی کو بارہ بجے دوپہر فاضل جسٹس آصف سعید کھوسہ کی سربراہی میں سپریم کورٹ کے پانچ رکنی بنچ کی طرف سے جب پاناما مقدمے کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا، تو کھچا کھچ بھرے کمرۂ عدالت میں ایک طرف آنکھوں سے خوشی کے فوارے چھوٹ رہے تھے، تو دوسری طرف بے اختیار آنسو بہہ نکلے تھے۔ وزیراعظم نواز شریف 'صادق اور امین' نہ رہنے کے باعث نااہل قرار دیے گئے تھے اور ان کے لیے فوری طور پر اپنا منصب چھوڑنے کا حکم ہوا تھا۔ اِسی کے ساتھ نواز شریف، اُن کے دونوں بیٹوں حسین اور حسن، اُن کی بیٹی مریم، اُن کے داماد کیپٹن (ر) صفدر اور اُن کے سمدھی اسحٰق ڈار کے خلاف نیب کو چھ ہفتوں کے اندر جے آئی ٹی کی رپورٹ کی روشنی میں ریفرنس دائر کرنے کی عدالتی ہدایات جاری ہوئیں اور ان میں یہ پابندی بھی عائد کی گئی کہ احتساب کی عدالتیں چھ ماہ میں مقدمات کی سماعت مکمل کر کے فیصلے سنائیں گی۔ فیصلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ فاضل عدالت کا ایک جج اس پوری کارروائی کی مانیٹرنگ کرے گا۔ فاضل عدالت کا تفصیلی فیصلہ ابھی آنا باقی ہے جس میں اہم قانونی اور آئینی نکات زیرِ بحث آئیں گے۔

پاکستان کی سب سے بڑی عدالت کے اس تہلکہ خیز فیصلے پر ملا جلا ردِعمل دیکھنے میں آیا ہے۔ مقدمہ جیتنے والوں نے اسے تاریخ ساز، قانون کی بالادستی اور انصاف کی فتح کا مظہر قرار دیا ہے اور اس یقین کا برملا اظہار کیا ہے کہ کرپشن کے اختتام کا بڑا آغاز ہو گیا ہے، کیونکہ آگے چل کر بڑے بڑے ڈاکو قانون کی گرفت میں آئیں گے اور انصاف کا بول بالا ہو گا۔ مختلف وکلا راہنماؤں نے فاضل ججوں کو سلام عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنا یہ عزم دہرایا ہے کہ وہ عدلیہ کی آزادی کا نعرہ بلند کرتے رہیں گے۔ وہ عوامی حلقے جو قانون کی باریکیوں سے پوری طرف واقف نہیں، انہوں نے عدالتی فیصلے کا والہانہ خیرمقدم کیا ہے کہ آئندہ ملک استحصال اور کرپشن سے پاک ہو جائے گا، زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں گی اور لوٹ کھسوٹ کے جملہ کاروبار بند ہو جائیں گے۔ متوسط گھرانوں کے اندر بھی اِس فیصلے سے خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے کہ اس سے احتساب کے ادارے مضبوط ہوں گے اور قوم کی دولت لوٹنے والے پابہ جولاں دکھائی دیں گے۔ عام آدمی یہی

سمجھ رہا ہے کہ فاضل عدلیہ نے طاقت ور حکمرانوں پر ہاتھ ڈال کر بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ ملکی اور غیر ملکی ذرائعِ ابلاغ اور سوشل میڈیا پر چھایا رہا۔ بی بی سی، سی این این، این بی سی اور دیگر یورپی نشریاتی اداروں نے وزیرِاعظم نواز شریف کی نااہلی کی خبر خصوصی طور پر نشر کی۔ ردِعمل کے طور پر چین، روس اور بعض دوسرے ممالک نے اسے پاکستان کا اندرونی معاملہ قرار دیا اور یہ اُمید بھرا پیغام بھیجا کہ معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں گے۔

ان عمومی اثرات کے برعکس پاکستان کی سیاسی تاریخ کا گہرا شعور اور دستور اور قانون کے تقاضوں کا پورا اِدراک رکھنے والے اہلِ وطن اس عدالتی فیصلے پر غیر معمولی تشویش اور اضطراب کا اظہار کر رہے ہیں۔ اُن کی رائے کے مطابق، اس فیصلے میں اصول قانون کی صریحاً خلاف ورزیاں ہوئی ہیں جن کے منفی اثرات ہماری پوری قومی زندگی پر مرتب ہوں گے جو سیاسی، جمہوری اور عدالتی ارتقا کے لیے مہلک ہو سکتے ہیں۔ اُن کے نزدیک آرٹیکل ۱۸۴(۳) کے تحت سپریم کورٹ کی طرف سے ایک ایسی درخواست سماعت کے لیے منظور کی گئی جسے رجسٹرار صاحب 'لغو' قرار دے چکے تھے، کسی طرح ایک اچنبھے سے کم نہیں تھا۔ یہی گمان گزرا کہ کوئی دباؤ یا کوئی اشارہ کام کر گیا ہے۔ فاضل جسٹس آصف سعید کھوسہ کی سربراہی میں پانچ رکنی بنچ تشکیل دیا گیا جس نے کئی ماہ کی سماعت اور غور و خوض کے بعد پانچ سو صفحات پر مبنی عدالتی فیصلہ تحریر کیا۔ اس میں دو جج صاحبان نے فیصلہ دیا کہ وزیرِاعظم نواز شریف 'صادق اور امین' نہیں رہے جبکہ اکثریتی فیصلے میں یہ کہا گیا کہ ہمارے سامنے جو ثبوت پیش کیے گئے ہیں وہ نااہلی کے لیے کافی نہیں۔ اس پر پانچوں جج صاحبان نے جے آئی ٹی قائم کرنے کا فیصلہ صادر کیا اور تینوں اکثریتی ججوں پر مشتمل ایک عمل درآمد بنچ بنا۔

اس جے آئی ٹی میں کچھ ارکان معروف طریقے کے بجائے واٹس ایپ کے ذریعے شامل کیے گئے۔ ان میں فوج کی انتہائی طاقت ور ایجنسیوں کے دو نمائندے بھی لیے گئے۔ سابق اٹارنی جنرل جناب عرفان قادر دہائی دیتے رہے کہ سپریم کورٹ کو جے آئی ٹی بنانے کا آئینی حق حاصل نہیں اور اس میں اعلیٰ فوجی افسروں کی شمولیت قومی سیاست کے لیے بہت خطرناک ہوگی۔ جے آئی ٹی کی فاضل بنچ کی طرف سے غیر معمولی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی، جس کی بدولت اس کا طرزِ عمل حاکمانہ ہوتا گیا۔ لوگ طنزاً کہتے ہیں کہ اس جے آئی ٹی کے پاس جنات تھے جو آنکھ جھپکنے میں ہزاروں میل دور سے مقفّل الماریوں میں سے دستاویزات لے آتے تھے اور یوں صرف ساٹھ دنوں میں دس جلدوں پر مشتمل رپورٹ تیار ہو گئی۔ اس کی دسویں جلد اخفا میں رکھی گئی۔ عمل درآمد بنچ نے اس رپورٹ کی پانچ روز تک سماعت کی اور اس دوران فاضل جج صاحبان ریمارکس کے ذریعے اپنا مافی الضمیر بھی بیان کرتے رہے کہ ہمارے حکمران گاڈ فادر اور سسلین مافیا کی طرح ہیں۔ جے آئی ٹی رپورٹ کی سماعت تین رکنی بنچ نے کی، لیکن معمول سے ہٹ کر آخری فیصلہ

پانچ رکنی بنچ نے سنایا۔ مولانا فضل الرحمٰن جو ایک نہایت زیرک سیاست دان اور عالمی حالات کی پیچیدگیوں سے خوب واقف ہیں، انہوں نے تبصرہ کیا کہ نواز شریف اس تنخواہ پر نااہل قرار دیے گئے ہیں جو انہوں نے وصول ہی نہیں کی۔ وہ ٹیکنیکل بنیاد پر گھر بھیج دیے گئے جس طرح ۱۹۵۵ء میں چیف جسٹس محمد منیر نے مولوی تمیز الدین کے حق میں دیا ہوا چیف کورٹ سندھ کا فیصلہ ٹیکنیکل گراؤنڈ پر کالعدم قرار دے دیا تھا۔

اس فیصلے پر چوٹی کے قانون دانوں کے چشم کشا تبصرے سامنے آ رہے ہیں۔ جناب عابد حسن منٹو نے اسے تباہ کن (devastating) عدالتی فیصلہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے کمزور فیصلہ نہیں دیکھا۔ محترمہ عاصمہ جہانگیر نے کہا نااہلی کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا فیصلہ ہے، چنانچہ سیاست دانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اسٹیبلشمنٹ نے یہ پیغام دیا ہے کہ جو سویلین بالادستی کی بات کرے گا، وہ اس عبرت ناک سزا سے دوچار ہوگا۔ جناب ایس ایم ظفر نے تبصرہ کیا کہ تنخواہ وصول نہ کرنے پر نااہلی حیران کن ہے۔ جناب علی کرد نے بنیادی نکتہ اُٹھایا کہ دنیا بھر کے عدالتی نظام میں اپیل کا حق دیا جاتا ہے۔ ایک دانش مند ماہرِ قانون کہہ رہے تھے کہ یہ عقبی مارشل لا ہے، کیونکہ سینئر سیاست دان جو تحریکِ انصاف کے صدر رہتے تھے وہ ۲۰۱۴ء میں عمران خاں کے اس انکشاف پر کنٹینر سے اتر آئے تھے اور پارٹی سے علیحدگی کا اعلان کر چکے تھے کہ اس بار حکومت عدلیہ کے ذریعے ہٹائی جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔ نہایت چھوٹی سی بات پر فاضل بنچ کا متفقہ طور پر یہ اعلان کر دینا کہ وزیرِاعظم 'صادق اور امین' نہیں رہے، اس نے آرٹیکلز ۶۲ اور ۶۳ کے بارے میں نہایت بنیادی سوالات اُٹھا دیے ہیں اور یہ خوف منڈلانے لگا ہے کہ پورا سیاسی اور انتظامی بندوبست شکست و ریخت سے دوچار ہو سکتا ہے۔

کسی قدر خوش کن امر یہ ہے کہ وزیرِاعظم نواز شریف نے شدید تحفّظات کے باوجود عدالتی فیصلے پر عمل درآمد کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنے منصب سے سبک دوش ہو گئے ہیں اور نئے وزیرِاعظم کے انتخاب کا عمل شروع ہو چکا ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ پارلیمنٹ اپنی آئینی مدت پوری کرے گی اور حکمران جماعت حصولِ انصاف کے لیے عدلیہ کی طرف ہی رجوع کرے گی جو ابہام دور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فیصلے کے تضادات پر بھی نظرِ ثانی کر سکتی ہے۔ اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق جناب نواز شریف کو اپیل کا حق ملنا چاہیے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے قریبی ساتھیوں کے بعض اقدامات کے باعث اللہ کی پکڑ میں آئے ہیں۔ انہیں سیاسی جدوجہد کے ساتھ ساتھ اپنے رب سے گناہوں کی مغفرت اور اس کی رضا کے حصول پر خاص توجہ دینا ہوگی کہ ہمیں آزادی کی نعمت اس نے عطا کی ہے اور وہی عزت اور عظمت بخشنے والا ہے۔

الطاف حسن قریشی



افغان امیر کا انصاف

غربت کی کٹھنائیاں جھیلنے والے شاہِ امیر افغانستان کا ایک سبق آموز قصہ

محمد عبد اللہ قریشی

ایک صدی قبل کی بات ہے، افغانستان کا علاقہ امیر عبدالرحمٰن کے زیرِ نگیں تھا۔ وہ بہت دور اندیش، عقلمند، بارعب اور جابر انسان تھا۔ افغانوں جیسی جفاکش، جنگجو، بہادر اور وحشی قوم اس کا نام سن کر کانپتی تھی۔ اردگرد کے ملکوں پر بھی اس کی ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ سب اس کا لوہا مانتے تھے۔ ہندوستان کے انگریز حاکم تک اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے تھے۔ چنانچہ ۸؍ اپریل ۱۸۸۴ء کو وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن نے راولپنڈی میں ایک بہت بڑا دربار لگایا، جس میں تمام راجے مہاراجوں کو جمع کیا۔ اس دربار میں امیر عبدالرحمٰن کو بلا کر اپنی دوستی کا یقین دلایا۔

امیر عبدالرحمٰن ۳؍ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو رات کے تین بجے ستاون برس کی عمر پا کر فوت ہوئے اور ان کی جگہ امیر حبیب اللہ خاں کابل کے تخت پر بیٹھے۔ یہ وہی امیر حبیب اللہ خاں ہیں جنھوں نے ۱۹۰۷ء میں شمالی ہند کی سب سے بڑی تعلیمی انجمن، حمایتِ اسلام لاہور کی دعوت پر لاہور آکر اسلامیہ کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ انہی کے نام پر اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کا شاندار حبیبیہ ہال اب تک قائم ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی کا یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے:

انار آتے جو کابل کے تو پڑتے سب کے حصے میں
امیر آئے تو ہم کو کیا، مزے ہیں لارڈ منٹو کے

امیر عبدالرحمٰن خاں نے بڑی مصیبتوں اور تکلیفوں میں جوانی کے دن کاٹ کر سلطنت حاصل کی تھی۔ ان کے حالات بابر بادشاہ سے ملتے جلتے ہیں۔ بابر کی طرح انہوں نے بھی اپنی زندگی کے واقعات لکھے ہیں جو بیحد دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ان کی آپ بیتی ''تزک امیری'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ ذیل کے واقعات اسی سے متاثر ہو کر لکھے اور کچھ رڈیارڈ کپلنگ کی تحریروں سے لیے گئے ہیں۔

ایک روز امیر عبدالرحمٰن کابل کے قریب ایک باغ میں بیٹھے اپنا کام کر رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی میز سامنے رکھی تھی۔ اردگرد کھلی ہوا میں جرنیل اور دوسرے وزیر اپنے اپنے مرتبے کے مطابق بیٹھے تھے۔ اس دربار اور دوسرے رئیسوں کے جمگھٹے سے ہلال کی شکل بنتی تھی، اس ہلال کی جو خنجر کی طرح آسمان پر نمودار ہو کر مسلمانوں کو سپاہی بننے کا پیغام دیتا ہے۔ باغ میں ہوا ویسے کبھی دن بھر چلتی رہتی ہے لیکن اس دن نسیم کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ ہر طرف سے قاصد بغاوت، قحط اور سازش کی خبریں لا رہے تھے۔ بادشاہ ان تمام پرچوں کو خود پڑھتا اور اپنے سیکرٹریوں (معتمد منشیوں) کے سپرد کرتا جاتا۔ راز کی باتیں اپنے پاس رکھتا لیکن شکایات کا جواب وہیں طلب کرتا۔

جس افسر سے سوال کیا جاتا، وہی جواب دیتا اور جواب انصاف اور واضح ہوتا کہ مزید جرح کی ضرورت نہ رہتی۔ امیر کے سامنے گول مول یا الٹا سیدھا جواب دینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ امیر کے سر پر ہیروں کے ستارے والی سیاہ استرخانی ٹوپی تھی۔ جب اس ٹوپی کے نیچے رعب دار سر دائیں بائیں ہلتا، تو بہادر سے بہادر حاکم بھی تھرّا اٹھتا اور اس کا دم خشک ہو جاتا۔ کبھی کبھی کوئی ایسی بات بھی ہو جاتی، جس سے مجلس کا رنگ بدل جاتا اور فضا میں نرمی پیدا ہو جاتی۔

دوپہر کے بعد ایک عورت یہ درخواست لے کر حاضر ہوئی کہ اسے خاوند سے طلاق دلوائی جائے۔ اس نے کئی عذر بہانے پیش کیے اور مرد پر مختلف قسم کے الزام لگائے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کا خاوند سر سے گنجا تھا جسے عورت پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی مگر مرد کسی طرح اسے چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ امیر نے بڑے تحمل اور اطمینان سے دونوں کی باتیں سنیں اور اس کے بعد عورت کو حکم دیا کہ وہ خاوند کے سر پر دہی ڈال کر چاٹا کرے تاکہ اس کے سر پر بال اُگ آئیں۔ اس کی باقی شکایات خود بخود رفع ہو جائیں گی۔ اس بات پر تمام دربار ہنس پڑا اور عورت بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

شام کے قریب ایک اور ہی واقعہ پیش آیا۔ ایک غریب مگر موٹا تازہ نوجوان گرفتار کر کے لایا گیا۔ اس کا جسم مار پیٹ سے زخمی تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے تین روپے کی چوری کی تھی۔ امیر فوجداری کے ہر چھوٹے بڑے مقدمے کا فیصلہ خود کرتے تھے لہٰذا سوال ہوا۔

''تم نے چوری کیوں کی؟''

ملزم نے جواب دیا:

''میں نادار اور مفلس تھا۔ لوگوں سے سوال کیا کسی نے کچھ نہ دیا۔ بھوکا تھا۔ فاقوں سے برا حال ہو رہا تھا۔ روٹی کے ٹکڑے تک کو محتاج تھا مگر روٹی نہ ملی، مجبوراً چوری کی''۔

''محنت مزدوری کیوں نہ کی؟ حلال روزی کمالی ہوتی!''

''غریب نواز! کام نہ ملا، بھوک سے جان نکلی جا رہی تھی''۔

''غلط کہتے ہو، جھوٹ بولتے ہو، تم نے چوری عیاشی، بدمعاشی اور حرام کاری کے لیے کی۔ بھوک کے سوا ہر کام کے لیے...... تلاش کرنے والے کو کام ضرور مل جاتا ہے''۔

قیدی کی آنکھیں زمین میں گڑ گئیں، جیسے کسی نے دکھتی رگ پکڑ لی ہو۔ امیر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''کام ہر کسی کو مل جاتا ہے۔ کون ہے جو یہ بات مجھ سے بہتر جانتا یا جاننے کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ فاقے میں نے بھی کاٹے ہیں، مگر تمہاری طرح نہیں، ایک دیانتدار آدمی کی طرح، تقدیر کے چکر میں پھنس کر اللہ تعالیٰ کی منشا کے عین مطابق''۔

امیر کا جوش بڑھ رہا تھا۔ اب وہ تمام مجمع کو مخاطب کر رہے تھے۔ تلوار کے بڑھے ہوئے نیام کو کہنی سے پیچھے ہٹا کر فرمایا:

''تم نے اس جھوٹے مکار کی باتیں سنیں۔ اب مجھ سے بھی ایک سچا واقعہ سنو! مجھ پر کئی کئی دن فاقے آئے ہیں۔ میں نے بھی پیٹ پر پتھر باندھ کر وقت گزارہ ہے۔ میں اس مصیبت میں اکیلا نہیں تھا۔ میری بیوی میرے ساتھ تھی۔ اس نے کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ کسی تکلیف میں مجھ سے کنارہ نہیں کیا۔ ہر موقع پر میری ڈھارس بندھائی۔ کمزوری کے وقت سہارا دیا۔ اس نے ہمیشہ وفا کی۔ ان دنوں میں بھی میری رفاقت کا حق ادا کیا جب میں زخمی شیر کی طرح سر چھپاتا مارا مارا پھرتا تھا۔ یہ میری تخت نشینی سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ان دنوں میں قندھار کے گردونواح میں منڈلاتا پھرتا تھا۔ دولت جواب دے چکی تھی۔ دوست منہ موڑ چکے تھے۔ کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ بالکل یوسف بے کارواں تھا اور قسمت آزمائی

کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔"

امیر نے یہ کہہ کر خالی ہاتھ پھیلا دیے اور پھر کہنا شروع کیا:

"میں روز بروز کمزور ہو رہا تھا۔ تھک ہار کر پھر اپنی رفیقہ حیات کے پاس لوٹ آیا۔ کیا بتلاؤں کہ ہم نے وہ دن کیسے کاٹے؟ جو کچھ ہم پر بیتی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک ایک کر کے سب چیزیں بک گئیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز میں اپنا ریشمی لحاف بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ لحاف ہم دونوں کو سردی سے بچاتا تھا۔ اس کے بغیر گزارہ مشکل نظر آتا تھا۔ اس پر زری کا بہترین کام کیا ہوا تھا۔ خیر کام تو جانے دیجیے، یہ گھر کا ضروری اثاثہ تھا اور ہماری آخری پونجی!

"بہرحال میں اس لحاف کو لے کر ایک تنگ سی گلی میں ایک سود خور تاجر کے پاس پہنچا اور اس کی ضمانت پر تین روپے طلب کیے۔ صرف تین روپے! معلوم ہے اس تاجر نے مجھ سے کیا کہا؟ مجھ سے، جو اب بادشاہ ہے اور اس ملک کا والی! کہا، تم چور ہو۔ اس لحاف کی قیمت کچھ نہیں تو تین سو روپے ہے، جسے تم تین روپے میں بیچ رہے ہو۔ میں نے کہا، میں قسمت کا مارا ایک بدحال شہزادہ ہوں اور بھوک سے نڈھال حاجت مند ہوں، سینکڑوں کی چیز کوڑیوں کے بھاؤ بیچنے پر مجبور!

"تاجر بولا، نہیں تم نکھٹو ہو، کام چور ہو، گداگروں کے شہزادے ہو۔ میرے پاس اس وقت کچھ نہیں۔ میرے منشی کے ساتھ جاؤ اور اڑھائی روپے لے آؤ۔ بس میں یہی دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں شرم کے مارے پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا۔ ناچار منشی کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے مجھے اڑھائی روپے دیے اور میں لے کر چلا آیا۔ ہم ان روپیوں سے روکھی سوکھی چلاتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہے، مگر بیٹھے بیٹھے کنوئیں خالی ہو جاتے ہیں۔ آخر وہ روپے بھی ختم ہو گئے، تھے ہی کتنے؟ کب تک چلتے؟ اب ہماری حالت پہلے سے بھی ابتر ہو گئی۔

"ایک دن وہ رحم دل منشی مجھے پھر ملا۔ میری پریشان حالی سے متاثر ہو کر کہنے لگا، اگر تم کوشش کرو تو وہ تاجر اس لحاف کے عوض تمھیں اور روپے دے سکتا ہے مگر میں نے اس کی منت کرنی گوارا نہ کی۔ روپے لینے سے انکار کر دیا۔ البتہ کہا، مجھے کسی محنت مزدوری کے کام پر لگا دو۔ بہت نہ سہی تھوڑی سہی۔ اسی پر قناعت کر لیں گے۔ کم از کم روٹی تو چل ہی جائے گی۔ تنگی ترشی کے دن نکل جائیں تو پھر اللہ مالک ہے۔

"اس منشی کی کوشش سے تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد مجھے کام مل گیا اور میں ... ہاں خود عبدالرحمن امیر افغانستان... محنت مشقت کا کام کرتا رہا۔ دن بھر ایک جگہ سے دوسری جگہ بوجھ اٹھا کرلے جاتا۔ شام کو چار آنے کما کر گھر لاتا۔ پھر کہیں رات کو کمر سیدھی کرتا۔

"مگر یہ حرام کار کہتا ہے کہ میں چوری کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ کیا میں یونہی ایک سال چار مہینے خون پسینا ایک کرتا رہا؟ کون ہے جو مجھے جھٹلا سکے؟ میرا ایک گواہ اب بھی یہاں موجود ہے۔ وہ میرے بیان کی تصدیق کر سکتا ہے۔"

اس پر سرداروں کی صف میں سے ایک شخص اٹھا۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "اللہ گواہ ہے کہ امیر کا یہ بیان حرف بحرف صحیح ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ میں جو رب تعالیٰ کی مہربانی اور امیر کی عنایت سے اب اس درجے پر پہنچا ہوں، سب جانتے ہیں، کبھی اس تاجر کا منشی تھا۔"

دربار پر خاموشی طاری تھی۔ سب بے حس و حرکت قیدی کی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے ہمہ تن گوش بیٹھے تھے۔ امیر نے مہر خاموشی توڑی اور گرجدار آواز میں قیدی پر لعنت ملامت کرتے ہوئے اسے پھانسی کا حکم سنا دیا۔

سپاہی چور کو پکڑ کر لے گئے اور پھر کسی نے اس کی شکل نہ دیکھی۔ اس واقعہ کے بعد کابل کے دوسرے چوروں پر بھی ہول بیٹھ گیا اور آئندہ چوری چکاری کی وارداتیں کم ہو گئیں۔

دربار میں ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں:

"اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی قسم! یہ ہے مرد!"

عبدالغفور خان



تین عورتیں

جن کے مقدس لہو نے عالمی نقشے پر نئی لکیر کھینچ ڈالی

میں مشرقی پنجاب کی ریاست نابھہ میں فوج کا ڈرل انسٹرکٹر تھا۔ ایک مسلمان افسر، جنرل اوصاف علی خان ہمارے کمانڈر انچیف تھے۔ جیل حکام کو ڈرل انسٹرکٹر کی ضرورت ہوئی انہوں نے جنرل صاحب سے آدمی مانگا۔ جنرل موصوف نے مجھے وہاں تعینات کر دیا۔ اس وقت مجھے فوج میں ملازمت کرتے چھ سال ہو چکے تھے۔ جیل میں ہی میں نے دس سال تک ملازمت کی یعنی پاکستان بننے تک۔ ۱۹۴۷ء میں میری تنخواہ بتیس روپے ماہوار تھی۔

انہی دنوں جب حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کی عظیم قیادت میں مسلمانوں نے اپنے لیے علیحدہ مملکت حاصل کر لی۔ دوسرے ہندو سکھ اکثریتی علاقوں کی طرح نابھہ میں بھی اگرچہ فضا میں خوف سا طاری تھا لیکن مسلمانوں کو اتنا زیادہ خطرہ محسوس نہیں ہوا کیونکہ مہاراجا اچھا آدمی تھا، مہارانی کے تو کیا کہنے!

ایک شام میں جیل سے ڈیوٹی دے کر گھر واپس آ رہا تھا۔ ایک بڑھیا، اس کی بہو اور بیٹی میری مخالف سمت سے آ رہی تھیں۔ اتنے میں سکھوں کے ایک جتھے کا بھی ادھر سے گزر ہوا جو برچھیاں بھالے، تلواریں اور بندوقیں لہرا رہے تھے۔ یہ جتھہ وہی نعرہ لگانے میں محو تھا جو ہر جگہ لگ رہے تھے: "جو مانگے گا پاکستان بنا دیں گے اس کا قبرستان۔"

وہ جتھہ کسی مار پر جا رہا تھا۔ مسلمان کو دیکھ کر جتھہ رک گیا۔ اتنا ہی فرق پڑا کہ میں نے سڑک پار کی ہے کہ تینوں عورتیں خون میں تڑپنے لگیں اور جتھہ "جو مانگے گا پاکستان بنا دیں گے اس کا قبرستان" کے نعرے لگاتا ہوا آگے نکل گیا۔

میں نے سائیکل کھڑی کی اور ان عورتوں کی طرف بڑھا۔ وہ خون میں لت پت پڑی کراہ رہی تھیں۔ میں نے اپنی پگڑی اتاری اور قریبی کنوئیں کی ٹنڈ میں بھگو کر ایک عورت کی طرف بڑھا۔ پانی اس کے منہ میں نچوڑا، پتا نہیں پانی اس کے حلق میں سے نیچے اترا یا نہیں مگر اس کی جان نکل گئی۔ میں دوسری کی طرف بھاگا وہ بھی دنیا کے نقشے پر اپنے مقدس لہو سے لکیر کھینچ چکی تھی اور تیسری بھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں گھر کی طرف چل تو پڑا لیکن ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میری سائیکل کے پہیوں کی رفتار الٹی ہو چکی ہے۔ غم اندوہ سے میرا تن بدن لرز رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مسلمان قوم کو پاکستان مانگنے کی سزا دینے کا فیصلہ ہو چکا۔ ان تین عورتوں کا خون ناحق میری نگاہوں میں تیر رہا تھا۔ فضا کا حسن تیرگی بن چکا تھا۔

اسی دن مجھے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے مکانوں پر نشانات لگ چکے۔ مہاراجا اور مہارانی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ریاست میں فسادات کی آگ بھڑکے۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ شنید یہی ہے کہ ان واقعات سے متاثر ہو کر ایک روز مہارانی نے مہاراجا سے کہا' یہ کیا ظلم ہو رہا ہے؟ جب تک مسلمان پاکستان کا راستہ نہیں پکڑیں گے، میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔

اسی رات گیارہ بجے ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ مسلمان پاکستان جانے کے لیے عیدگاہ میں جمع ہو جائیں۔ تمام مسلمان عیدگاہ میں جمع ہو گئے۔ اس دوران بندوقوں، کرپانوں اور نیزوں سے مسلح سکھوں کا لشکر قتل و غارت گری کے لیے عیدگاہ میں پہنچ گیا۔

کئی مسلمانوں نے پیسے دے کر اپنے عزیز و اقارب کی جانیں بچائیں۔ ایک کمبوہ عورت نے سکھوں سے انسانیت کے نام پر التجا کی کہ اس کے دونوں بھائی چھوڑ دیے جائیں۔ سکھوں نے چھ سو روپیا مانگا۔ وہ کہنے لگی، میرے پاس تین سو روپے ہیں۔ سکھوں نے کہا، اس کے عوض تیرا صرف ایک بھائی چھوٹ سکتا ہے۔ انہوں نے ایک چھوڑ دیا۔ دوسرے بھائی کو بہن کے سامنے شہید کر دیا۔

مہاراجا نابھہ مسلمانوں کو مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی فوج کے سکھ افسر اندر ہی اندر فسادیوں سے ملے ہوئے تھے لہٰذا انہی کی شہ پر فسادی سکھوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا تھا۔ ریاست نابھہ کی فوج جان بوجھ کر الگ تھلگ کھڑی رہی۔ ظالم سکھ جس حد تک عیدگاہ میدان میں ظلم کر سکتے تھے، وہ انہوں نے کیا۔ لوٹ مار کی، بچوں کو نیزوں پر اچھالا، نوجوان لڑکیاں اغوا کر لیں۔ قرآنِ حکیم کی بے حرمتی کی اور نعرے لگائے۔ ''جو مانگے کا پاکستان بنا دیں گے اس کا قبرستان''۔

جب میں عیدگاہ پہنچا، تو سکھ لوٹ مار کر کے جا چکے تھے۔ پاکستان پہنچنے کے لیے ہم نے ڈیڑھ ہزار روپے میں ایک گڈّا خریدا۔ اس پر مال لادا۔ گھر کے تمام افراد سوار ہوئے لیکن سکھوں نے کوئی چیز ہمارے ساتھ نہ آنے دی۔ ایک سائیکل تک نہیں آنے دیا۔ اکیس دن قافلہ چلتا رہا۔ جب ہم پاکستان پہنچے تو میری گھر والی کے پاس صرف پانچ روپے باقی بچے تھے۔

سکھ بڑی ظالم قوم تھی، بہت زیادہ ظالم لیکن اس کی انہیں سزا مل رہی ہے۔ مسلمانوں کو پاکستان مل گیا۔ ہندوؤں کو بھارت مگر انہیں کیا ملا؟ اب وہ ہندو برہمن حکومت سے آزادی لینے کی خاطر جدوجہد کر رہے ہیں۔

ادنیٰ چیز

ایک صاحب مرتبہ بزرگ بیاباں سے فاقہ زدہ اور سفر کی صعوبتیں اُٹھاتے ہوئے بازار کوفہ میں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چڑیا تھی اور آواز لگاتا تھا ''مجھے اس چڑیا کی خاطر کچھ دے دو۔''

لوگوں نے کہا: ''اے شخص! یہ کیا کہتے ہو؟''

اس نے کہا ''مجال ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ پر کچھ دو۔ دنیا کے لیے ادنیٰ چیز کا ہی وسیلہ دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ دنیا قلیل ہے، طوالت کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔''

تقدیر

حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیؓ کہتے ہیں، کسی آدمی نے آکر حضرت عمرؓ کو بتایا کہ کچھ لوگ تقدیر کے بارے میں غلط باتیں کرتے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر بیان فرمایا:

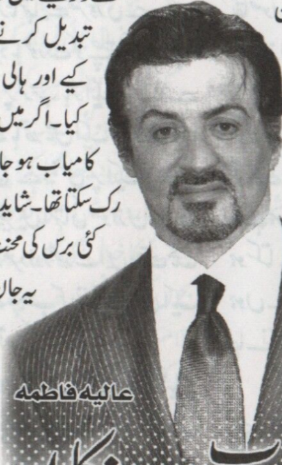
''اے لوگو! تم سے پہلی امتیں تقدیر کے بارے میں غلط باتیں کر کے ہی ہلاک ہوئی ہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں عمر کی جان ہے۔ آئندہ جن دو آدمیوں کے بارے میں' میں نے یہ سُنا کہ تقدیر کے بارے میں (اپنی عقل سے) باتیں کر رہے ہیں تو میں دونوں کی گردن اُڑا دوں گا۔''

راوی کہتے ہیں حضرت عمرؓ کا یہ اعلان سُن کر تمام لوگوں نے تقدیر کے بارے میں بات کرنی چھوڑ دی۔ پھر حجاج کے زمانے میں شام میں ایک جماعت ظاہر ہوئی جس نے سب سے پہلے تقدیر کے بارے میں بات کرنی شروع کی۔

کامیاب ہونے کا راز

زندگی میں کامیابی پانے کے نادر گُر سے شناسائی حاصل کیجیے

عالیہ فاطمہ



سلوسٹر اسٹالون کے نام سے آپ خوب واقف ہوں گے۔ مشہور زمانہ فلم ''ریمبو'' کا مرکزی کردار، جس نے ایکشن فلموں کی دنیا میں نئے طرز کا آغاز کیا۔ ریمبو کے ہیرو' سلوسٹر اسٹالون کی حقیقی زندگی غیر متوازن واقعات سے بھری پڑی ہے۔

بچپن میں وہ بہت بدتمیز اور جھگڑالو تھا۔ اسی وجہ سے اسے کئی بار اسکول سے نکالا گیا۔ اسے کئی اسکول بدلنے پڑے۔ ڈریکسل یونی ورسٹی میں ایک ٹیسٹ کے بعد والدین کو بتایا گیا کہ وہ محض لفٹ کا مکینک بن سکے گا۔ اس کے باپ کو جب یہ پتا چلا تو اس نے اسے بہت پیٹا۔ باپ نے اسے طعنہ دیا کہ کم از کم اپنا بدن ہی بہتر کر لے، کیوں کہ اس کے پاس دماغ تو ہے نہیں۔ (کچھ اس قسم کا جملہ اس نے اپنی فلم ''روکی'' (Rocky) میں بھی استعمال کیا ہے)۔

سلوسٹر اسٹالون کی زندگی مالی معاملات سے لے کر جذبات تک کئی شعبہ ہائے حیات میں غیر متوازن تھی۔ غیر متوازن زندگی کی وجہ سے وہ اب تک ہر جگہ ناکام رہا تھا۔ ایسے ہی حالات میں اس نے فلموں میں کام کرنے کا فیصلہ کیا لیکن یہاں بھی اسے ہر جگہ ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اداکار کی حیثیت سے فلمی دنیا نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر اب وہ آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اس نے اپنی زندگی کے متعلّق ایک مضمون میں لکھا ہے:

''اگر میں اداکاری میں کامیاب ہو جاتا تو پھر میرے اندر کا لکھاری کیسے سامنے آتا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اداکاری کے مقابلے میں فلم کی کہانی لکھنے میں مجھے زیادہ مزا آیا۔ کامیابی تو ناکامیوں کو قابو کرنے سے ملتی ہے۔ اپنی ناکامیوں کے ذریعے میں نے اپنی مشکلات کو مواقع میں تبدیل کرنے کے مختلف راستے دریافت کیے اور ہالی ووڈ میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ اگر میں اداکار کی حیثیت سے پہلے ہی کامیاب ہو جاتا تو بعد میں ایک حد پر جا کر رک سکتا تھا۔ شاید یہ حد کیریکٹر ایکٹر کی ہوتی۔''

کئی برس کی محنت کے بعد سلوسٹر اسٹالون نے یہ جان لیا کہ اپنی زندگی کے جذباتی، جسمانی اور ذہنی شعبوں کو کیوں کر متوازن کیا جا سکتا ہے۔ پھر ایک رات اس نے محمد علی کلے اور چک ویپر کا مقابلہ دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ لوگ یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ وہ اس واقعے سے بہت متاثر ہوا اور صرف ساڑے تین دن میں اپنی فلم ''روکی ٹو'' کی کہانی لکھ ڈالی۔

جب وہ اپنی یہ کہانی فروخت کرنے کے لیے فلم پروڈیوسروں کے پاس گیا تو یہ بھی شرط لگائی کہ اسی کو اس فلم میں مرکزی کردار دیا جائے۔ ظاہر ہے' اسے ہر جگہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر اس کی کوشش اور مستقل مزاجی سے ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کی یہ فلم ۱۹۷۹ء میں نمائش کے لیے پیش ہوگئی۔ ''روکی ٹو'' نے ۲۰۰ ملین ڈالر کا بزنس کیا۔

اس کے بعد اسٹالون کی تابڑتوڑ کامیابیاں پوری دنیا کے سامنے ہیں۔ سلوسٹر اسٹالون نے اپنی غیر متوازن زندگی میں

توازن پیدا کیا اور دنیا کے مشہور ترین اور کامیاب ترین لوگوں میں شمار ہونے لگا۔

یہ حقیقت ہے کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے زندگی کے تمام شعبوں میں توازن پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ آپ نے کبھی سرکس میں رسی پر کسی مرد یا عورت کو چلتے دیکھا ہے؟ ایک بہت ہی اونچی تنی ہوئی رسی پر کرتب باز ایک سرے سے دوسرے تک جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا ڈنڈا ہوتا ہے۔ کندھوں پر ایک کرسی ہوتی ہے، جس پر ایک نوجوان عورت بیٹھی ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں انتہائی متوازن حالت میں ہوتی ہیں۔ دونوں کرتب باز مرد اور عورت اس وقت تک رسے پر چلنا شروع نہیں کرتے، جب کہ تمام چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ توازن میں نہ آجائیں۔

جیسے جیسے وہ رسے پر آگے بڑھتے ہیں' اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ یہ توازن بگڑنے نہ پائے۔ ہماری زندگی بھی اس رسے کی مانند ہے، جس پر اپنے مقاصد زندگی کے ساتھ ہم آگے بڑھتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ رسے پر چلنے والے کا توازن اگر بگڑ جائے تو کیا ہوگا؟ وہ دھڑام سے نیچے آگرے گا۔ اسی طرح ہماری زندگی کی رسی بھی توازن مانگتی ہے......

ہمارے افعال، ہمارے جذبات اور ہمارے کردار میں!

اپنے مقاصد زندگی میں کامیابی حاصل کرنے اور شاہراہ زندگی کے سفر کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لیے، ہمیں لامحالہ اسی توازن کی ضرورت ہے۔ جب ہم یہ توازن کھو بیٹھتے ہیں تو زندگی کا یہ سفر متاثر ہو جاتا ہے۔

جب زندگی غیر متوازن ہو جائے

دنیا میں لوگوں کی اکثریت پیسا حاصل کرنے کے لیے زندگی کا توازن کھو بیٹھتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ غلط فہمی ہے کہ ہم پیسے ہی سے سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں...... خوشی، سکون، عزت، رتبہ وغیرہ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ اس عام غلط فہمی کی بنا پر ہوتا یہ ہے کہ ہم اپنی تمام توانائیاں روپیا پیسا حاصل کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ ہماری ہر فکر کا محور یہ ہوتا ہے کہ کیسے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کی جائے۔ چناں چہ ہم اپنے خانگی، ازدواجی، روحانی، ذہنی، جسمانی اور معاشرتی تقاضوں سے صرف نظر کر جاتے ہیں۔ گویا زندگی کے رسے پر ہم توازن برقرار نہیں رکھ پاتے۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم زندگی کے کسی نہ کسی شعبے کی ذمے داریاں پوری نہیں کر پاتے۔ ہوسکتا ہے پیسا کمانے کی دھن میں بیوی کے حقوق سے ہم عہدہ برآ نہ ہو رہے ہوں۔ ہوسکتا ہے بچوں کو ہماری پوری توجہ نہ مل رہی ہو۔ ہوسکتا ہے آپ اپنے دینی اور روحانی تقاضوں کو بھلا بیٹھے ہوں۔ ہوسکتا ہے آپ کو کوئی مرض ہو، مگر معالج کے پاس جانے کا وقت ہی نہ ملے۔

اگر زندگی کا کوئی شعبہ ہماری توجہ اور ہماری سعی سے محروم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی میں توازن نہیں۔ اگر یہ کیفیت برقرار رہے تو ہم زندگی کی رسی پر مزید آگے نہیں بڑھ سکتے اور ہم گر جائیں گے۔ خود کو زندگی کی رسی پر کامیابی کے ساتھ آگے بڑھانے کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں توازن پیدا کیا جائے۔

توازن......سب سے ضروری

یہی ہماری پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے پوری بے غرضی اور انصاف کے ساتھ یہ جائزہ لیجیے کہ آپ کی سب سے زیادہ توانائی زندگی کے کس شعبے میں خرچ ہو رہی ہے۔ اس کے بعد اپنی توانائی کو زندگی کے تمام شعبوں میں ضرورت کے مطابق لگائیے۔ اس سلسلے میں ٹائم ٹیبل بنانا یقیناً آپ کے لیے بہت مددگار ثابت ہوگا۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں توازن پیدا کرنا ایک دن' ایک ہفتے یا ایک مہینے کا عمل نہیں۔ اس کے لیے آپ کو مسلسل کوشش کرنی ہوگی۔ ہر لمحہ، ہر پل، ہر جگہ آپ کو یہ دھیان رکھنا ہوگا کہ آپ کی اپنی توانائیاں

کیا متوازن طور پر زندگی کے تمام شعبوں میں منقسم ہیں؟ کیا آپ کی زندگی کا کوئی شعبہ آپ کی توانائی سے محروم تو نہیں؟ یہ تجزیہ آپ کو بار بار کرنا ہوگا۔

آغاز کیجیے

ہمیں اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی غیر متوازن زندگی کو تبدیل کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے یہ جائزہ لیجیے کہ آپ کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کے لیے اپنی زندگی کے مختلف شعبوں پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ کس شعبے میں آپ کی توانائی کا کتنا حصہ خرچ ہو رہا ہے۔

انسانی زندگی کے سات بنیادی شعبے ہیں:

1 بیوی، بچے، خاندان
2 معاش
3 صحت اور تندرستی
4 معاشرتی روابط
5 جذباتی نشوونما
6 روحانی یا دینی نشوونما
7 ذہنی نشوونما

کیا آپ ان تمام سات شعبوں کو ان کی ضرورت کے مطابق اپنی توانائی فراہم کر رہے ہیں؟ یا کسی شعبے کو زیادہ اور کسی کو کم توانائی مہیا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے زندگی غیر متوازن ہوگئی ہے۔

اکثر یہ دیکھا گیا کہ اپنی مالی حالت مستحکم کرنے کے لیے لوگ کاروبار میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ پھر انہیں گھر بسانے کا خیال بھی نہیں رہتا' یا شادی شدہ ہوتے ہیں تو بیوی بچوں کو وقت نہیں دے پاتے۔ یقیناً یہ غیر متوازن زندگی کی علامت ہے۔ ایک دانش ور کا قول ہے، اصل بات یہ نہیں کہ ہم کتنا حاصل کر رہے ہیں، اصل یہ ہے ہم کس طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ متوازن زندگی ہی کامیاب زندگی ہے۔

اچھی شے کی زیادتی بھی مضر ہے۔

سفید کاغذ

پروفیسر صاحب نے بلیک بورڈ پر ایک سفید کاغذ چسپاں کرنے کے بعد اس کے درمیان میں ایک سیاہ نقطہ لگا دیا۔ پھر اپنا رخ کلاس کی طرف کرتے ہوئے طلبہ سے پوچھا "آپ کو کیا نظر آ رہا ہے؟"

سب نے کہا "سیاہ نقطہ۔"

پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا، حیرت ہے اتنا بڑا سفید کاغذ تمہاری نظروں سے اوجھل ہے مگر چھوٹا سا ایک سیاہ نقطہ تمہیں صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یاد رکھنا، زندگی میں کیے گئے لاتعداد اچھے کام سفید کاغذ کی طرح ہوتے ہیں جب کہ کوئی غلطی یا خرابی محض ایک نقطے کی مانند ہوتی ہے۔ لوگوں کی اکثریت دوسروں کی غلطیوں پر توجہ زیادہ دیتی ہے لیکن اچھائیوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔

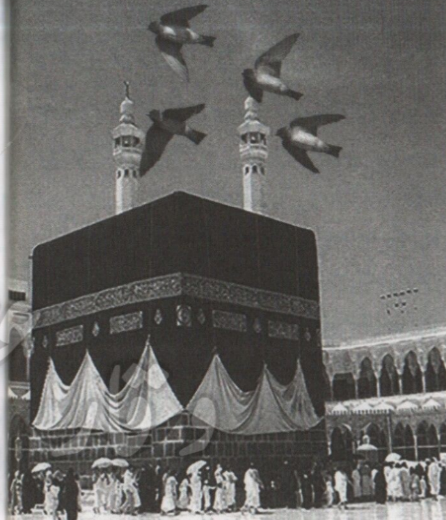
آپ کی ساری زندگی کی اچھائیوں پر آپ کی کوئی ایک کوتاہی یا کسی غلطی کا ایک سیاہ نقطہ ان کو صاف دکھائی دیتا ہے، اسی طرح آپ آدھا گلاس پانی بھر کر اگر لوگوں سے پوچھیں گے تو کم از کم ۸۰ فیصد کہیں گے آدھا گلاس خالی ہے اور ۲۰ فیصد کہیں گے کہ آدھا گلاس پانی ہے۔ دونوں صورتوں میں بظاہر فرق کچھ نہیں پڑتا لیکن درحقیقت یہ دو قسم کے انداز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ منفی ذہن کے لوگ ہر چیز میں شر تلاش کر لیتے ہیں۔ آپ ہمیشہ مثبت سوچ اپنانے کی کوشش کریں، آپ کو بھی ہر چیز میں خیر نظر آئے گی اس میں شخصیت کا نکھار ہے اور اچھی سوچ کی پہچان بھی۔

نماز فجر کی ادائیگی کے بعد مطاف میں سفید سنگ مرمر سے بنے ٹھنڈے صاف وشفاف فرش پر مسحور کن و مشکبار فضاؤں میں بکھری کیف وسرور کی لذتوں سے سرشار ذکر الٰہی میں مستغرق زائرین کے درمیان ملتزم میں بیٹھا ہوں۔ آسمان پر سفید پاکیزہ روشنی کی خوبصورت کرنیں ایک اور خوشنما صبح کے نمودار ہونے کا اعلان کر رہی ہیں۔ رنگ ونور کی روشنیوں میں نہایا ہوا کعبۃ اللہ کا جلال و جمال آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔ سیاہ ریشمی غلاف کعبہ سے نکلنے والی پرنور شعاعیں رب کعبہ کی عظمت و کبریائی بیان کر رہی ہیں۔ میری گناہ گار نگاہیں غلاف کعبہ سے نظریں چراتے ہوئے کعبۃ اللہ کی چھت سے ذرا اوپر فضا میں مرکوز ہو گئی ہیں جہاں شان کریمی کا ایک اور عجیب روح پرور منظر اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ منتظر شوق نگاہ ہے۔

سیاہی مائل فاختئی پیراہن میں ملبوس ننھی ننھی چڑیوں جیسے سینکڑوں پرندے دائرے اور قوس کی شکل میں ادب اور قرینے سے لہلہاتے بل کھاتے کبھی اوپر کبھی نیچے کبھی دائیں کبھی بائیں اپنی خوشنما نغمگی چہچہاہٹ کے ساتھ رب العالمین کے کبریائی بیان کرتے ہوئے محو طواف ہیں۔ یہ ابابیلیں صبح صادق سے سورج طلوع ہونے اور شام سے رات کے پہلے پہر تک یوں ہی وارفتگی واز خود رفتگی کے ساتھ عالم دیوانگی میں اپنے رب کی محبت وعقیدت اور تشکر کے جذبات سے سرشار ڈبکیاں لگاتی، تیرتی، جھومتی اور وجد کے عالم شوق میں حمد وثنا کے خوبصورت اور سحر انگیز نغمے الاپتی مصروف عبادت رہتی ہیں۔ سورہ نور میں اللہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے "پرندے بھی تسبیح کرتے اور نماز ادا کرتے ہیں" (41:24)

اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں اللہ رب العزت فرماتا ہے

"ساتوں آسمان اور زمین پر موجود تمام مخلوق اللہ کی تسبیح کرتی ہے" (44:17)



خانہ کعبہ کی ابابیلیں

جنہوں نے ابرہہ کی افواج کو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح پامال کر دیا تھا

محمود میاں نجمی

ان چھوٹی چھوٹی، معصوم اور نازک ابابیلوں کا عبادت اور اللہ وحدہٗ لاشریک کی پرستش کا یہ دلربا منظر دیکھنے والوں کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیتا ہے۔ میں جب بھی حرم شریف کا رخ کروں، تو صبح اور شام کے اکثر اوقات مطاف میں، پہلی دوسری منزل یا چھت پر بیٹھ کر دیر تک دنیا و جہاں سے بے خبر ان نازک پرندوں کی اپنے رب کے حضور نغمہ سرائی کے دلکش

منظر کو دیکھتا رہتا ہوں۔ پھر میرے ذہن کے دریچوں میں سورہ فیل کے الفاظ گونجنے لگتے ہیں:

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا ان کی تدبیر کو (جوکہ ویرانی کعبہ کے بارے میں تھی) سرتاپا غلط نہیں کر دیا اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے۔ جو ان لوگوں پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح (پامال) کر دیا"۔

سورہ فیل کے یہ الفاظ پڑھتے ہی ذہن کے کمپیوٹر نے تاریخ کے اوراق پلٹنا شروع کر دیے اور یکایک نگاہوں کے سامنے کتب تاریخ میں تحریر وہ واقعہ سامنے آ گیا جب یمن کا متعصب عیسائی حکمران ابرہہ الاشرم سارے عرب کو عیسائیت میں تبدیل کرنے کا خواب ذہن میں سجائے مکہ مکرمہ کی عالمی حیثیت ختم کرنے کے شدید جنون میں مبتلا تھا۔ اس نے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک عظیم الشان کلیسا تعمیر کروایا جس میں سرخ وسفید، زرد وسیاہ رنگ کے نہایت اعلیٰ اور قیمتی پتھر استعمال کیے گئے۔ اس کے در و دیوار اور دروازوں پر سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کا بے دریغ استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے درمیان میں بہت بڑا قیمتی اور نہایت خوبصورت یاقوت نصب تھا (طبقات ابن سعد) محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ اس عالی شان کلیسا کی تکمیل کے بعد اس نے شاہ حبش کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کی طرف موڑے بغیر نہیں رہوں گا۔

مقاتل بن سلیمان کی روایت ہے کہ قریش کے بعض نوجوانوں نے جا کر اس کلیسا کو آگ لگا دی۔ جب ابرہہ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو غصے سے پاگل ہو گیا اور غضبناک ہو کر اس نے قسم کھائی کہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک کعبہ کو نہ ڈھا دوں۔ اس کے بعد ۵۷۰ یا ۵۷۱ عیسوی میں ۶۰ ہزار فوجی اور ۱۳ ہاتھی (بعض روایت میں ۹ ہاتھی) لے کر مکہ روانہ ہوا۔ مورخین نے ہاتھیوں کو لے جانے کا مقصد یہ لکھا ہے کہ کعبہ کے ستونوں میں لمبی اور مضبوط زنجیریں باندھ کر ہاتھیوں کے گلے میں باندھی جائیں۔ پھر ایک بار ہی سب ہاتھیوں کو ہنکا کر کعبہ منہدم کر دیا جائے۔

راستے میں متعدد عرب قبائل بڑھ چڑھ کر اس کی فوج پر حملہ آور ہوئے مگر ہزیمت اٹھا کر پسپا ہو گئے بالآخر وہ مکہ معظمہ کے قریب پہنچ گیا اور اپنی افواج کو حکم دیا کہ مکہ والوں کی بھیڑ بکریاں اور اونٹ وغیرہ جو کچھ نظر آئے اس پر قبضہ کر لو چنانچہ رئیس قریش عبدالمطلب کے دوسو اونٹ بھی گرفتار کر لیے گئے۔

جب عبدالمطلب کو اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ ابرہہ کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے ان کی شاندار شخصیت اور وجیہہ چہرہ دیکھا تو تعظیم سے کھڑا ہو گیا۔

عبدالمطلب نے کہا کہ اے یمن کے بادشاہ! تم نے میرے اونٹ ضبط کر لیے ہیں، وہ مجھے واپس کر دو۔ ابرہہ یہ سن کر بڑا حیران اور متعجب ہوا۔ اس نے کہا، اے عربوں کے سردار! میں تو تمہاری مقدس ترین جگہ کعبہ کو نیست و نابود کرنے آیا ہوں اور تم اس کے بجائے اپنے اونٹوں کی فکر کرتے ہو۔ عبدالمطلب نے جواب دیا، اے ابرہہ! اونٹ میرے ہیں اس لیے مجھے ان کی فکر ہے۔ رہا کعبہ، تو اس کا ایک رب ہے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔

ابرہہ نے کہا، اچھا میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا رب اس کعبہ کو میرے ہاتھوں سے کیسے بچاتا ہے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ تم جانو اور رب کعبہ، جانے۔ یہ کہہ کر وہ ابرہہ سے اپنے اونٹ لے کر واپس آ گئے۔

محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ ابرہہ کے پاس سے واپس آ کر عبدالمطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں پر چلے جائیں تاکہ ان کا قتل عام نہ ہو جائے اور خود قریش کے چند نامور سرداروں کے ساتھ حرم شریف میں حاضر ہوئے۔ کعبہ شریف کا پردہ پکڑ کر آہ و زاری

کے ساتھ اللہ سے دعائیں مانگیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس وقت خانہ کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت موجود تھے لیکن عبدالمطلب نے اس نازک وقت میں صرف اس ان دیکھے اللہ کے آگے آہ وزاری کی۔ دعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں پر چلے گئے۔

دوسرے روز ابرہہ مکے میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر اس کا خاص ہاتھی ''محمود'' جو آگے آگے تھا، یکا یک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تیر مارے آنکسوں سے کچوکے دیے گئے یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے اگر جنوب شمال یا مشرق کی جانب موڑ کر چلانے کی کوشش کرتے تو دوڑنے لگتا لیکن اگر مکہ کی جانب موڑتے تو فوراً بیٹھ جاتا اور کسی بھی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اچانک مکے کی فضاؤں نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔ ہزاروں کی تعداد میں بحر احمر کی جانب سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچ اور پنجوں میں سنگریزے لیے ہوئے نمودار ہوئے اور انہوں نے ابرہہ کے لشکر پر ان سنگریزوں کی بارش کر دی۔

''یہ چھت سے ملحق کونوں میں مٹی اور تنکوں کی مدد سے نہایت خوبصورت گھونسلے بناتے اور جھنڈ ہی کی شکل میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ مٹی کے ان گھونسلوں میں بہت سے چھوٹے چھوٹے سوراخ نما دروازے ہوتے ہیں''

جس پر بھی یہ سنگریزے گرتے، اس کا جسم جلنا شروع ہو جاتا۔ محمد بن اسحاق اور عکرمہ سے روایت ہے کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلاد عرب میں چیچک سب سے پہلے اسی سال دیکھی گئی۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ جس پر کوئی کنکری گرتی اسے سخت کھجلی لاحق ہوتی اور کھجاتے ہی جلد پھٹتی اور گوشت جھڑنا شروع ہو جاتا۔ ابن عباس سے ہی دوسری روایت یہ ہے کہ گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا۔ جہاں سے کوئی ٹکڑا گرتا، وہاں سے پیپ اور لہو بہنے لگتا۔ افراتفری میں ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ جگہ جگہ یہ لوگ گر گر کر مرتے رہے۔ عطا بن یسار سے روایت ہے کہ سب اس وقت ہلاک نہیں ہوئے کچھ وہیں مرے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے میں مرتے چلے گئے، ابرہہ بھی ''بلاد خشم'' پہنچ کر مرا۔ یہ واقعہ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان ''وادی محصب'' کے قریب محسر کے مقام پر پیش آیا تھا۔

حضرت جابر بن عبداللہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلے تو محسر کی وادی سے آپ نے رفتار تیز کر دی اس لیے سنت میں یہ ہے کہ یہاں سے آدمی جلد گزر جائے۔ (تفہیم القرآن جلد ششم ص ۴۶۳ تا ۴۶۷)۔

مفسّرین لکھتے ہیں کہ ۶۰ ہزار کے لشکر میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ صرف ''محمود'' ہاتھی صحیح سالم واپس لوٹ کر گیا۔ اسی لشکر میں ہاتھیوں کی موجودگی کی بناء پر اس واقعہ کو واقعہ فیل اور اس سال کو ''عام الفیل'' کہا جاتا ہے۔ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ محرم میں پیش آیا اور حضور اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت ربیع الاول میں ہوئی۔ اکثریت کی رائے ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت واقعہ فیل کے پچاس دن بعد ہوئی۔

مفسّرین نے ابابیلوں کے رنگ، جسامت اور کنکریوں کی جسامت کے متعلق مختلف اقوال بیان کیے ہیں۔ امام رازی تحریر کرتے ہیں کہ حضرت عطا عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ پرندوں کا رنگ ابرہہ کے حبشی فوجیوں کی طرح سیاہ تھا۔ درحقیقت ان کے کفر اور معصیت کے باعث سیاہ رنگ کے پرندے بھیجے گئے۔ سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ [illegible] پرندے تھے۔ بعض روایات میں ان کا رنگ سبز بیان کیا گیا ہے۔

امام رازی ان مختلف روایات میں تطبیق اس طرح دیتے ہیں کہ پرندوں کے بعض لشکر سفید بعض سیاہ اور بعض سبز رنگ کے تھے۔ جس رنگ کے پرندے جس آدمی نے دیکھے اس نے اس کی کیفیت بیان کر دی۔

علامہ محمود الوسیؒ لکھتے ہیں، امام ابو نعیم نے نوفل بن ابی معاویہ ویلمیؒ سے روایت بیان کی ہے کہ ابابیلوں کی چونچوں میں دبی کنکریاں مسور سے بڑی اور چنے سے چھوٹی تھیں۔ ابن مردویہ کی روایت میں بکری کی مینگنیوں کے برابر بتایا گیا ہے۔ (تاریخ مکہ مکرمہ۔ محمد عبدالمعبود ص ۲۰۶)

تقریباً سب راویوں کا متفقہ بیان ہے کہ ہر پرندے کی چونچ میں ایک ایک کنکر تھا اور پنجوں میں دو دو کنکر۔ مکہ کے بعض لوگوں کے پاس یہ کنکر ایک مدت تک محفوظ رہے۔ چنانچہ ابو نعیم نے نوفل بن ابی معاویہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے وہ کنکر دیکھے ہیں جو اصحاب فیل پر پھینکے گئے تھے۔ وہ مٹر کے چھوٹے دانے کے برابر سیاہی مائل سرخ تھے۔ ابن عباسؓ کی روایت ابو نعیم نے یہ نقل کی ہے کہ وہ چلغوزے کے برابر تھے۔ ظاہر ہے کہ سارے سنگریزے ایک ہی جیسے نہ ہوں گے۔ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا۔ (تفہیم القرآن جلد ششم ص ۴۷۱)۔

یہ بات جاننا ضروری ہے کہ قرآن پاک میں جس ابابیل کا ذکر ہے، وہ کوئی پرندے کا نام نہیں۔ قرآنی اصطلاح میں ابابیل کے معنی ہیں پرندوں کے غول یا پرندوں کا جھنڈ۔ سورہ فیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وارسلہ علیھم طیراً ابابیل'':

ترجمہ: اور ان پر غول کے غول یا جھنڈ کے جھنڈ پرندوں کے بھیجے۔

اب اس وقت ابرہہ کی فوج پر حملہ کرنے والے پرندے ابابیل ہی تھے یا کوئی اور؟ اس بارے میں اللہ رب العزت ہی بہتر جانتا ہے لیکن عموماً سمجھا جاتا ہے کہ ابابیل ہی ابرہہ کی فوج پر حملہ کرنے والے پرندے تھے۔ یہ پرندے مکہ کی بلند اور پرانی عمارتوں پر اپنا گھر بنا کر رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان میں سے کئی حرم شریف کے اندر ہی رہتے ہیں۔ میں نے ان پرندوں کے سینکڑوں کی تعداد میں گھونسلے حرم شریف میں دیکھے ہیں۔ یہ چھت سے ملحق کونوں میں مٹی اور تنکوں کی مدد سے نہایت خوبصورت گھونسلے بناتے اور جھنڈ ہی کی شکل میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ مٹی کے ان گھونسلوں میں بہت سے چھوٹے چھوٹے سوراخ نما دروازے ہوتے ہیں۔ میرا جب بھی حرم شریف کا بلاوا آتا ہے تو میں تھوڑا سا وقت نکال کر عمارت کے اندر ان کے گھونسلے ضرور تلاش کرتا ہوں۔ باب عبدالعزیز، باب فتح اور باب عمرہ پر ہونے والی تعمیر کی وجہ سے اب ان کے زیادہ تر گھونسلے باب فہد کی عمارت میں ہیں۔

باب فہد کے مین گیٹ پر اندر کی جانب کھڑے ہو کر چھت پر نظر دوڑائیں تو ان کے مٹی سے بنے خوبصورت اور نفیس گھونسلے نظر آتے ہیں۔ یہ چھوٹے سر کے ننھے ننھے پرندے ہیں۔ آواز تیز و باریک ہوتی ہے۔ اوسط عمر ۲۰ سال تک ہے۔

ایمان داری

ایک خاتون کے ہاں چوری ہوگئی۔ پولیس کا عملہ ان کے گھر پہنچا تو وہ صاحبہ زار وقطار روتے ہوئے بولیں:

''آج کل ایمان داری نہیں ہے۔ میری پرانی ملازمہ میرے دس جوڑے وہ والے لے کر بھاگی جو گزشتہ ماہ میں نے پیرس سے واپسی پر کسٹم کے ذریعے اسمگل کیے تھے۔''

معصوم خواہش

طوفانی رات میں وہ خوفناک اجنبی دروازے پر کھڑا کیا مطالبہ کر رہا تھا..؟

رحمت بانو

آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور طوفانی بارش جاری تھی۔ اسی وجہ سے رات اور بھی زیادہ اندھیری اور ڈراؤنی محسوس ہو رہی تھی۔ اینڈریو اور اس کی بیوی جمیکا اپنی خواب گاہ میں پرسکون نیند سوئے ہوئے تھے کہ اچانک وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ گھر کے ڈرائیووے میں داخل ہونے والی کار کے انجن کے بے ہنگم شور نے ان کی نیند خراب کردی تھی۔ نیند کے خمار میں ابھی وہ صورتحال کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ باہر والے دروازے پر زوردار دستک ہونے لگی۔ اینڈریو نے گردن گھما کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ۳ بج رہے تھے۔

''اس وقت کون آگیا؟'' اس نے بے زاری سے سوچا۔ باہر طوفانی ہوا چنگھاڑ رہی تھی اور بارش کا پانی کھڑکیوں سے سر پٹخ رہا تھا۔ دروازے پر گولہ باری کی طرح ہونے والی دستک اب بلند تر ہونے کے ساتھ ساتھ مسلسل بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

''نیچے جا کر دیکھو تو صحیح کہ اتنی طوفانی رات کے اس پہر کون آیا ہے؟'' جمیکا نے اپنے شوہر سے کہا۔ اینڈریو بے زاری سے اٹھا اور گاؤن پہنتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے چلا۔ نیچے پہنچ کر دروازہ کھولنے سے پہلے وہ ذرا رکا۔ بارش کے باعث دھندلے پڑ جانے والے دروازے کے شیشے سے اسے ایک قوی الجثہ شخص کا طویل سایہ نظر آیا جو پورچ کے تاریک پس منظر میں خوفناک تاثر پیش کر رہا تھا۔ اینڈریو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ برستی بارش میں ایک لمبے قد کا اجنبی نیگرو کھڑا تھا۔ ہیٹ ماتھے پر قدرے جھکے ہونے کے باعث اس کی آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ٹھوڑی پر کسی پرانے زخم کے نشان نے چہرے کو مزید دہشت ناک بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

''کیا تم دھکا لگا سکتے ہو؟'' اجنبی نے پوچھا۔

''سوری! میں اس وقت تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' اینڈریو نے صاف انکار کرتے ہوئے جواب دیا اور ساتھ ہی دروازہ زور سے بند کرتے ہوئے واپس اپنی خواب گاہ کی طرف چل پڑا۔

''دروازے پر کون تھا؟'' جمیکا کے استفسار پر اینڈریو نے اسے اجنبی کے متعلق بتایا۔

''پھر کیا تم نے اس کی مدد کی؟'' جمیکا نے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ نہیں۔ اس طوفانی بارش میں رات کے تین بجے میں کیسے اس کی کوئی مدد کرتا؟'' اینڈریو نے کندھے اچکاتے ہوئے بے زاری سے جواب دیا۔

''تمھیں شرم آنی چاہیے اینڈریو۔ یاد ہے جب ایک سنسان راستے پر ہماری کار خراب ہوگئی تھی تو دو اجنبیوں نے رک کر ہماری مدد کی تھی۔ اگر وہ ہماری مدد نہ کرتے تو ہم ساری رات اسی ویران بیابان میں گزارنے پر مجبور ہو جاتے۔'' اینڈریو ایک سرد آہ بھر کر دوبارہ بستر سے نکلا اور سیڑھیاں اتر کر باہر والا دروازہ کھول کر جھانکا۔ باہر گہرے اندھیرے میں بارش کی برستی چادر کے ساتھ طوفانی ہوائیں سر پٹخ رہی تھیں۔ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے اینڈریو نے چیخ کر پوچھا ''کیا تم ابھی یہیں موجود ہو؟''

نزدیک ہی کہیں سے جواب آیا ''ہاں! میں یہیں ہوں۔''

''کیا تمھیں ابھی بھی مدد کی ضرورت ہے؟'' اینڈریو نے بارش اور بادلوں کے شور میں چلاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!'' اسی آواز نے جواب دیا۔

اینڈریو اندھیرے اور برستی بارش میں گھر سے باہر نکلا اور زور سے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں یہاں تمھارے لان میں لگے جھولے پر بیٹھا ہوں، پلیز آ کر ذرا جھولے کو دھکا تو لگا دو۔''

ٹیلی وژن کا پروگرام ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' مشہور **انٹرویو**
ادیب، اور پی ٹی وی کے چیئرمین جناب عطاء الحق
قاسمی کی زیرسرپرستی چلنے والا ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں سنہری روایات اور اقدار کی کھوج میں اُن ممتاز اور معتبر شخصیات سے انٹرویو لیے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لانے کے سلسلے میں اپنی ان تھک محنت اور لگن سے رول ماڈل بن چکے ہیں۔

پی ٹی وی پروگرام میں مدیرِ اعلیٰ اُردو ڈائجسٹ کی زبانی اس پُرآشوب دور کا آنکھوں دیکھا حال نشر ہوا جب انگریزوں کی غلامی اور ہندوؤں کی تنگ نظری سے گھائل اور غربت و افلاس میں پسے ہوئے برصغیر کے مسلمان ایک آزاد وطن کے حصول، عظمت رفتہ کی بازیابی اور ایک اچھے مستقبل کے لیے جدوجہد کر رہے تھے



ہندوستان میں مسلمانوں کا
دینی تشخص اور مستقبل خطرے میں تھا

مرتب:
ذیشان محمد بیگ

کچھ عرصے قبل اس اچھوتے پروگرام میں اُردو ڈائجسٹ کے مدیرِ اعلیٰ جناب الطاف حسن قریشی سے انٹرویو کیا گیا۔ پروگرام کی میزبان، فائزہ بخاری نے صحافت کے میدان میں ان کی خدمات گنواتے ہوئے ناظرین کو بتایا کہ انہوں نے روایت اور جدت کے امتزاج سے نئے دبستان کی بنیاد رکھی اور انٹرویو نگاری میں خاص اسلوب ایجاد کیا جسے بے پایاں مقبولیت حاصل ہوئی۔

جناب عطاء الحق قاسمی نے اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں الطاف صاحب کے صحافتی مقام اور مرتبے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انہیں ''استاد الاساتذہ'' کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صحافیوں کی ایک پوری نسل تیار کی ہے۔ آپ جب انٹرویو کرتے ہیں تو اس شخصیت کے حوالے سے کوئی تشنگی نہیں رہتی اور اسی لیے ان کے کیے گئے انٹرویو ''آرکائیو'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ پر تحقیق کرنے والے لوگوں کو لازماً ان انٹرویوز سے مدد لینا ہوگی۔

قاسمی صاحب نے یہ بھی واضح کیا کہ آج کل حکومتوں کے خلاف بلاخوف وخطر لکھنے کی اجازت ہے لیکن الطاف حسن قریشی اور ان کے ساتھیوں نے جس دور میں لکھا، وہ آج کی طرح آزاد نہیں تھا۔ اس دور میں قریشی صاحب سمیت کچھ اور جرأت مند صحافیوں نے بھی نعرہ مستانہ بلند کیا تھا اور نتیجے میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑی تھیں۔

پروڈیوسر عمر خان، سابق ڈائریکٹر پی ٹی وی بشارت خان، زاہد پیرزادہ، الطاف حسن قریشی، میزبان فائزہ بخاری، چیئرمین پی ٹی وی عطاء الحق قاسمی، سلمان پیرزادہ، معاون پروگرام ابرار ندیم، ناصر نقوی، کامران الطاف، رؤف طاہر، فرخ شہباز

تعارفی کلمات کے بعد انٹرویو کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ جناب الطاف حسن قریشی ۱۹۳۱ء میں ضلع حصار، ہریانہ میں واقع شہر سرسہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کے واقعات تفصیل سے بیان کیے۔ یہ واقعات اس دور کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ الطاف صاحب کی داستان حیات انھی کی زبانی پیش خدمت ہے۔

سرسے کے ہائی اسکول میں ہندو اور سکھ طالب علموں کی اکثریت تھی جبکہ مسلمان طالب علم معدودے چند تھے۔ اسی طرح اساتذہ میں بھی ہندو اور سکھ تعداد میں زیادہ ہوتے۔ اگر کسی مسلمان استاد کی تقرری ہوتی، تو مسلمان طلبہ میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی، ہندو اور سکھ اساتذہ میں اکثر شفیق ہوتے اور ان سے ہم مسلم طلبہ نے بہت کچھ سیکھا تھا۔

پرائمری کے بعد ہم ہائی اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہوئے۔ ان دنوں قرارداد لاہور منظور ہو چکی تھی۔ تب دہلی ایک ڈائریکٹ ٹرین ہمارے شہر آتی تھی۔ ٹرین سے جنگ اور انجام اخبارات ہم تک پہنچتے تھے۔ ان اخبارات کے ذریعے ہمیں قرارداد لاہور کے بارے میں آگاہی ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی جماعت سے ہائی اسکول پہنچنے تک ہمارے جو ہندو اور سکھ دوست تھے جن کے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر پڑھتے تھے، کھیلتے اور کبھی کبھی ان کے گھر بھی چلے جاتے تھے، قرارداد لاہور منظور ہونے کے بعد ان دوستوں کا رویہ بتدریج تبدیل ہوتا گیا۔

۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک سات برسوں میں یہی ہم جماعت برملا اپنی نفرت کا اظہار کرنے لگے تھے۔ وہ اب ہمیں گھروں میں لے جانے سے گریز کرتے اور اگر برسوں کے تعلقات کے باعث وہ ہمیں اپنے گھر لے جاتے تو عورتیں نفرت بھری نظروں سے دیکھتیں اور رسوئی (باورچی خانہ) کے قریب تک پھٹکنے نہ دیتی تھیں۔ پانی پلانا پڑتا تو اوپر سے اوک میں پانی ڈالا جاتا اور کھانا پیپل کے پتوں پر رکھ کر دیا جاتا۔ اُن کی پوری کوشش ہوتی کہ ہمارا ہاتھ اُن کے کپڑوں اور جسم سے نہ لگنے پائے کیونکہ وہ ہمیں ناپاک سمجھتے تھے۔ اس موقع پر جناب عطاء الحق قاسمی نے ٹکڑا لگایا کہ اس کا مطلب ہے ''...پوزیبل'' اس وقت کی ایجاد ہے؟ یہ سن کر تمام شرکا مسکرا دیے۔

الطاف صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ بتدریج ماحول میں شدید تناؤ پیدا ہوتا گیا۔ مسلمانوں میں یہ احساس شدت سے جڑ پکڑ گیا کہ اب یہاں ان کا کوئی مستقبل نہیں۔ ہم نوجوان طلبہ کو یہی نظر آرہا تھا کہ میٹرک کر لینے کے بعد ہمیں باعزت ملازمت نہیں ملے گی۔ یا تو کہیں جھاڑو دے رہے ہوں گے اور یا بہت ہوا تو کسی دفتر میں چپراسی کی نوکری مل جائے گی۔ کاروبار پر بھی ہندوؤں اور سکھوں کا پورا پورا قبضہ تھا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی کے نتیجے میں ہندو مسلم خون آشام فسادات شروع ہونے لگے تھے۔ گائے ذبح کرنے پر مسلمان قتل کر دیے جاتے۔ اسی طرح مسجدوں کے سامنے باجا بجانے کا سلسلہ زور پکڑتا گیا جس کا مقصد مسلمانوں کو اشتعال دلا کر خون ریزی کو ہوا دینا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تنازعات کھڑے ہونے لگے اور بستی بستی نفرت کا زہر پھیلتا گیا۔

قریشی صاحب نے بتایا کہ پاکستان کا تصور ہمارے ذہنوں میں شروع ہی سے موجود تھا۔ اس میں ایک بہت بڑا کردار ہمارے ہیڈ ماسٹر جناب پیر مصباح الدین کا تھا جنھیں کتابوں سے بہت عشق تھا۔ پیر صاحب نے اسکول کی چھوٹی سی لائبریری کو اسلامی کتب سے بھر دیا جن میں عبدالحلیم شرر کے ناول، شبلی، حالی، سرسید اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف اور ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع شدہ اسلامی تاریخ، سیرت اور اسلامی علوم پر گراں قدر کتب شامل تھیں۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں ایسے ہیڈ ماسٹر ملے جن کے طفیل ہم میٹرک کرنے سے پہلے ہی نامور ادیبوں اور بلند پایہ

مصنفین کی بیشتر تخلیقات پڑھ چکے تھے۔ آج کل کی نوجوان نسل اپنی تاریخ اور ملی شخصیات سے نابلد ہے۔ اس کی بڑی وجہ مطالعے کے شوق اور کتب بینی کے رجحان کا فقدان ہے۔

قاسمی صاحب نے کہا یہ تو اس دور کا سیاسی پہلو تھا۔ اب ذرا ۱۹۴۰ء سے پہلے کے سماجی، معاشی اور معاشرتی پہلوؤں پر بھی بات کیجیے۔ مثال کے طور پر اس دور میں مسلمانوں کا رہن سہن کیسا تھا؟ کیا اس دور میں لوگوں کے پاس پیسا وافر تھا یا بس گزارے لائق کام تھا؟

الطاف صاحب نے کہا: ان کے شہر کی کل آبادی اس وقت تقریباً چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی جس میں مسلمانوں کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اُن کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی اور سوائے چند خوش حال گھرانوں کے زیادہ تر لوگ مفلوک الحال تھے۔ سرکاری ملازمتوں میں اُن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ کاروبار میں اُن کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں تھا۔ پیسے کی اس فراوانی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا جو آج اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو عطا کی ہے۔

والد صاحب محکمہ انہار میں پٹواری تھے اور ان کی محدود آمدنی میں گھر کا گزارا مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ یہ جنگ عظیم دوئم کا زمانہ تھا جس میں مہنگائی اپنے عروج پر تھی اور خاص طور پر گندم بہت مہنگی ہوگئی تھی، چنانچہ والدہ مرحومہ نے تمام بچوں کو جوار اور باجرہ کھانے کا عادی بنایا کہ اس زمانے میں ان کے نرخ کم تھے۔

محترم عطاء الحق قاسمی اس موقع پر خاموش نہ رہ سکے اور اس امر کی وضاحت ضروری سمجھی کہ اس دور کے پٹواری بہت ایمان دار ہوتے تھے۔ اس پر محفل گل و گلزار ہوگئی۔

جناب الطاف حسن قریشی نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑتے ہوئے کہا کہ والدہ تہجد پڑھنے کے بعد اپنی بیٹی کے ساتھ نماز فجر تک گھر کی چکی پر پانچ سیر آٹا پیستی تھیں تاکہ بازار سے آٹا پسوانے کا خرچ بچایا جاسکے۔ جب بچے اسکول چلے جاتے، تو وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر سوت کاتنے لگتیں، جس سے سب گھر والوں کے لیے کھدر کے لباس اور کھیس تیار کیے جاتے تھے۔

الغرض والدہ صاحبہ گھر میں استعمال ہونے والی بیشتر چیزیں خود ہی گھر میں تیار کرلیتی تھیں۔ مزید برآں انھوں نے بچوں کی دودھ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بکریاں بھی پال رکھی تھیں جن کے لیے چارا میرے بڑے بھائی اعجاز حسن قریشی جنگل سے کاٹ کر لاتے تھے۔

ہمارا گھرانا شہر کے متوسط خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ جب ہماری یہ حالت تھی تو باقی غریب غربا کی حالت زار کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ غربت کے باعث اسکولوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد انتہائی کم تھی۔ ہمارے اسکول میں شہر کی دس ہزار مسلمان آبادی میں سے پچاس ساٹھ بچے ہی پڑھنے آتے تھے جبکہ اسکولوں میں فیس بھی بہت کم لی جاتی تھی۔ غربت کے علاوہ مسلمانوں میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان بھی بہت کم تھا۔

الطاف صاحب نے مسلمانوں کی حالت زار کا مزید نقشہ کھینچتے ہوئے بتایا کہ جب انھوں نے میٹرک کا امتحان دیا تو صرف آٹھ مسلمان طلبہ ان کے ہم جماعت تھے جن میں سے محمد یقین بھی تھے جو آج ماشاء اللہ پاکستان میں آنکھوں کے معروف سرجن ہیں۔

اس موقع پر عطاء الحق قاسمی صاحب نے دریافت کیا کہ آپ میٹرک میں تو اوّل آئے ہوں گے؟ الطاف صاحب نے ان کے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ میرے علاوہ میرے بڑے بھائی نے بھی جو سکول میں ان سے سینئر تھے، میٹرک میں ٹاپ

کیا تھا جبکہ ہمارے مدمقابل ہندو اور سکھ طلبہ بہت ذہین اور محنتی تھے اور انھیں ہندو اور سکھ اساتذہ کی خصوصی توجہ بھی حاصل تھی۔

اس وقت شہر میں چند ہی مسلم گھرانوں کو بجلی کی سہولت میسر تھی، اس لیے ہم لالٹین کی روشنی میں پڑھتے تھے۔ میرے دوست محمد یقین کا گھر مسلمانوں میں ایک کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ صرف ان کے گھر ریڈیو تھا جہاں بجلی بھی آگئی تھی اور جب پاکستان کے قیام کا باقاعدہ اعلان ہوا ہم نوجوان ریڈیو کے گرد بیٹھے تھے۔ یہ غربت اور بے چارگی کا وہ ماحول تھا جس میں مسلمان سانس لے رہے تھے اور ان کے لیے پاکستان کا تصور بہت سہانا خواب تھا۔

غالباً ۱۷ اگست کو ریڈکلف ایوارڈ کا اعلان ہوا جس کے بعد سرسے میں رہنے والے مسلمان مہاجر قرار پائے کہ انھیں پاکستان کی طرف ہجرت کرنا تھی۔ خوش قسمتی سے مہاجر کیمپ ہمارے محلے ہی میں قائم ہوا۔ ہمیں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ زمانے کا ستم دیکھیے کہ اس کیمپ پر جو بلوائی حملہ کرنے آتے، ان میں وہ ہندو اور سکھ بھی شامل ہوتے جو ہمارے ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے اور ایک ہی اسکول میں تعلیم بھی حاصل کرتے رہے تھے۔

عطاء الحق قاسمی گویا ہوئے کہ ہندوستان کے جو حالات آپ نے بتائے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان بنانے کا محرک محض مذہبی ہی نہیں معاشی بھی تھا جو عام طور پر اجاگر نہیں کیا جاتا۔ اس پر بھی ذرا روشنی ڈالیے۔

الطاف صاحب نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات بالکل واضح تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہت خراب تھی کہ حکومت اور کاروبار میں ان کا برائے نام حصہ تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل بڑا تاریک تھا۔ یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ ہندو اکثریت کے درمیان روزمرہ کی زندگی میں وہ کوئی مقام حاصل کر ہی نہیں سکتے تھے اور ان کا دینی اور تہذیبی تشخص بڑے خطرے میں تھا۔

پروگرام کی میزبان فائزہ بخاری نے الطاف صاحب سے کہا کہ ۱۹۴۷ء میں سرسے سے ہجرت کے واقعات پر بھی روشنی ڈالیے نیز یہ بھی کہ پاکستان پہنچنے پر مہاجرین کے ساتھ اہل لاہور کا برتاؤ کیسا تھا۔

جناب الطاف حسن قریشی نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ وہ گھر جس میں، مَیں نے ہوش سنبھالا اور میرا بچپن اور لڑکپن گزرا، قیام پاکستان کے بعد وہی مجھے کاٹنے کو آرہا تھا اور میرے لیے وہاں رہنا دوبھر ہوتا جارہا تھا۔ خواہش یہی تھی کہ جلد از جلد پاکستان پہنچ جاؤں کہ وہ میرا آدرش تھا اور مجھے آزاد ماحول میں رہ کر اسلام کے آفاقی تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنا، ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اور اپنی عظمت رفتہ کا سراغ لگانا تھا۔

جس ریل گاڑی پر ہم پاکستان کے لیے روانہ ہوئے، وہ دہلی سے آئی تھی۔ وہ ٹرین ہمارے شہر پہنچی تو ریلوے حکام نے کہا کہ اس میں جگہ کم ہے اس لیے آدھے لوگ اس میں سوار ہوجائیں اور باقی کل روانہ کردیے جائیں گے۔ مگر کیمپ میں مقیم مسلمانوں نے جن کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار کے لگ بھگ تھی، فیصلہ کیا کہ سب اکٹھے ہی جائیں گے کیونکہ اطلاعات یہ موصول ہورہی تھیں کہ راستے میں بہت قتل اور غارت گری ہورہی ہے۔ کیمپ سے قافلوں کی صورت میں خاصی بڑی تعداد میں لوگ پہلے ہی جاچکے تھے۔

خبریں یہ بھی مل رہی تھیں کہ ہندو اور سکھ بلوائیوں کے جتھے مہاجرین کے قافلوں اور ریل گاڑیوں پر حملے کررہے ہیں۔ بعد ازاں ان کی تصدیق یوں بھی ہوئی کہ جب ہمارے کیمپ کے مسلمان ٹرین میں سوار ہوئے تو اس کے پچھلے ڈبے لاشوں اور خون سے اٹے پڑے تھے۔ سکھ اکثریت کی ریاست پٹیالہ میں بھٹنڈہ ریلوے جنکشن واقع تھا جس کی فوج سب سے زیادہ مسلمانوں کا قتل

عام کر رہی تھی۔ ریل گاڑی جب بھٹنڈہ جنکشن سے آگے نکلتی تو جنگلوں میں چھپے بلوائی یک دم نمودار ہو کر اُسے روک لیتے اور نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے۔

ہماری ریل گاڑی رات کے وقت بھٹنڈہ پہنچی اور پھر آگے جا کر جنگل میں رک گئی۔ اس وقت ہر شخص کی زبان پر یا حی یا قیوم کا ورد تھا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اُس خونیں جنگل سے خیریت سے نکل آئے اور پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستان کی مقدس سرزمین پہنچتے ہی عجیب مناظر دیکھنے میں آئے۔ لوگ بے ساختہ سجدہ ریز ہو گئے اور ارضِ پاک کی مٹی کو چومنے لگے۔ یہ ایک عجیب روح پرور منظر تھا۔ اسٹیشن پر بلوچ رجمنٹ کے چند جوان دکھائی دیے تو بے ساختہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا۔ ہمارا خاندان پہلے ہارون آباد گیا جہاں ہمارے قریبی رشتہ دار آباد تھے۔ بعدازاں وہ لاہور آ گیا جہاں ہمارے بڑے بھائی گل حسن محکمہ انہار میں ملازم تھے اور انھوں نے پاکستان کا آپشن دیا تھا۔

جناب عطاء الحق قاسمی نے پروگرام کی میزبان فائزہ بخاری کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ الطاف صاحب نے بہت جدوجہد اور محنت کے بعد بلند مقام حاصل کیا ہے' ایک وقت میں کئی کئی ملازمتیں کیں اور میں انھیں سائیکل پر یونیورسٹی آتے جاتے دیکھتا رہا ہوں۔ اسی محنت کے طفیل آج اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بلند مقام پر فائز کیا ہے۔

میرے بڑے بھائی گل حسن صاحب نے مجھے ٹیلی گرافی کا فن سکھایا اور اسی ہنر کی وجہ سے تقریباً سترہ سال کی عمر میں محکمہ انہار میں مجھے ملازمت مل گئی۔ اسی ملازمت کے دوران میں نے پولیٹیکل سائنس اور عربی میں گریجوایشن کی۔ بعدازاں ایم اے پولیٹیکل سائنس میں پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ مجھے شروع ہی سے مطالعے اور سیاسی معاملات سمجھنے کا شوق تھا اور جماعت اسلامی کے ساتھ ذہنی وابستگی چلی آ رہی تھی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے آئین' قانون اور سیاسی نظام کے بارے میں ایک ایسا فکر انگیز لٹریچر تخلیق کیا جس سے ذوق مطالعہ کو مہمیز ملتی گئی۔

الطاف صاحب نے اپنی جدوجہد مسلسل کی داستان جاری رکھی کہ جب میں ایم اے پولیٹیکل سائنس کا طالب علم تھا' اس وقت بیک وقت تین ملازمتیں کرتا تھا۔ گھر کے معاشی حالات کے پیش نظر محکمہ انہار کی ملازمت کے علاوہ دو اسکولوں میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیتا رہا۔ میں صبح چھ بجے سائیکل پر گھر سے نکلتا اور رات گیارہ بجے واپس آتا۔ اس بے پناہ مصروفیت کے باعث ایم۔اے کلاسز میں جانے کا وقت کم ہی ملتا۔ محدود آمدنی میں کتابیں خریدنے سے بھی قاصر تھا' مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا فضل کیا کہ میں نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ اس کامیابی کا سہرا میرے والدین کو جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ تلقین کرتے کہ علم سب سے بڑی دولت ہے اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ یہ سب انہی کے پیدا کردہ ذوق و شوق کا ثمرہ تھا۔ ہمارے والد مرحوم مولانا ظفر علی خان کی شاعری' نثر اور خطابت کے بڑے مداح تھے اور ہمیں فجر کی نماز کے بعد اپنے سامنے بٹھا کر فرمایا کرتے تھے کہ مولانا ظفر علی خان کے والد بھی پٹواری تھے اور میں بھی پٹواری ہوں۔ میری زبردست خواہش ہے کہ میری اولاد بھی مولانا ظفر علی خان کی طرح صحافت میں نام پیدا کرے۔

میں اکثر سوچتا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ مولانا ظفر علی خان کے بلند مقام تک ہم جیسے کم علم نوجوان بھی کبھی پہنچ سکتے ہیں۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی اور کرم تھا کہ وہ ہم دو بھائیوں کو صحافت کے میدان میں لے آیا اور آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں' وہ اسی کا ایک پرتو ہے' حالانکہ میں تو ایک استاد بننا چاہتا تھا۔

الطاف صاحب کی اس بات پر عطاء الحق قاسمی نے ذومعنی لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ استاد تو آپ آج بھی ہیں۔ اس پر محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ جناب الطاف حسن قریشی نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی کہ وہ بچوں کو پڑھانے والے ایک معلم بننا چاہتے تھے۔

پروگرام کی میزبان فائزہ بخاری نے سوال کیا جیسا کہ آپ نے اپنے سیاسی شوق کی آبیاری کے لیے ایم اے سیاسیات کیا اور جماعت اسلامی کے ساتھ ایک رشتہ بھی استوار رکھا کیا آپ کو عملی سیاست میں آنے کا بھی خیال آیا؟

الطاف صاحب نے کہا کہ مجھے عملی سیاست میں آنے کا کبھی شوق نہیں ہوا۔ ہماری زیادہ تر دلچسپی معاشی حالات پر قابو پانے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول تک محدود تھی۔ بڑے بھائی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی جرمنی سے اسلامی تاریخ میں پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے' مگر انھیں پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرشپ نہیں ملی۔ میں نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا' مگر مضبوط تعلقات نہ رکھنے کے باعث باوقار ملازمت حاصل نہ کر سکا' چنانچہ ہم نے مسلم کالج کے نام سے سمن آباد میں ایک کوچنگ سینٹر قائم کیا۔

ہمارا یہ تجربہ بڑی حد تک کامیاب رہا۔ اسی عرصے میں جماعت اسلامی کے مرکزی راہنما ملک نصراللہ عزیز' جو بہت بڑے صحافی تھے' ان کے بڑے صاحبزادے جناب ظفراللہ ملک ہمارے پاس آئے۔ ان کے ساتھ ۱۹۵۳ میں ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی نے روزنامہ تسنیم میں کام کیا تھا۔ ملک صاحب یہ تجویز لے کر آئے کہ ریڈرز ڈائجسٹ کی طرز پہ اردو ڈائجسٹ نکالا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ڈائجسٹ بہت مقبول ہو گا۔

یہ خیال ہمیں بھی بہت بھایا مگر اس کے لیے سرمایہ درکار تھا۔ اس نازک موقع پر ہماری بڑی بھابی رضیہ بیگم نے قربانی دی اور اپنا زیور بیچ کر سرمایہ فراہم کیا۔ کچھ رقم ڈاکٹر اعجاز قریشی نے لگائی جو پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرار کے طور پر کام کر رہے تھے۔ یوں اردو ڈائجسٹ کا اجراء عمل میں آیا اور مجھے اس کا مدیر مسئول بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔

الطاف صاحب نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بتایا کہ اس وقت تک مجھے عملی صحافت کا کوئی تجربہ نہیں تھا البتہ صحافتی معاملات کا ادراک رکھتا تھا۔

جناب عطاء الحق قاسمی کی رگِ ظرافت پھر پھڑکی اور بولے کہ مدیر مسئول وہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی غلطی ہو جائے تو اُسے گرفتار کر لیا جائے۔ یہ سن کر تمام شرکا پھر بے ساختہ قہقہے لگانے لگے۔

محترم الطاف حسن قریشی نے ہنستے ہوئے بات جاری رکھی کہ اللہ تعالیٰ نے ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کو وہ مقبولیت عطا کی جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اجراء کے چند ہی ماہ بعد میں نے اُردو ڈائجسٹ کے لیے انٹرویو لینے کا سلسلہ شروع کیا جسے قارئین میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

میزبان فائزہ بخاری نے الطاف صاحب سے پوچھا کہ انھوں نے صحافت میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں' ان کا بھی مختصر احوال بیان کیجیے۔

الطاف صاحب نے اپنی یادداشت کھنگالتے ہوئے آہستگی سے جواب دیا کہ آزادیِ صحافت کے جرم پر ہم دونوں بھائی چار بار حوالہ زنداں ہوئے۔ حسب معمول عطاء الحق قاسمی صاحب نے ذومعنی لہجے میں گرہ لگائی ''ابھی تک یہ چار مرتبہ گرفتار ہوئے ہیں۔'' الطاف صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا'' آپ کا خیال ہے کہ مزید گرفتاری کا بھی امکان موجود ہے؟''

وہ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے کہ جب ہم نے صحافت شروع کی تو وہ ایوب خان کا ابتدائی زمانہ تھا جس میں مارشل لا نافذ تھا اور بہت احتیاط کے ساتھ لکھنا پڑتا تھا۔ پریس پر سنسر شپ کی وجہ سے حکومت کے خلاف لکھنے کا امکان سرے سے موجود ہی نہیں تھا' چنانچہ ہم نے اردو ڈائجسٹ میں انٹرویو شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تاکہ ان کے ذریعے معتبر اور باحیثیت شخصیتوں کے خیالات لوگوں تک اس طور پر پہنچائے جائیں کہ قوم کے اندر جمہوریت کے ساتھ وابستہ رہنے' آئینی جدوجہد کرنے اور آمریت کے خلاف کھڑے رہنے کا جذبہ زندہ رہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہماری اس کوشش کے نتائج بہت اچھے نکلے اور اہل عزم ایوب خان' یحییٰ خان اور مسٹر بھٹو کے غیر جمہوری رویوں کے خلاف ڈٹے رہے۔

جناب الطاف حسن قریشی نے بتایا: جب بھٹو صاحب ایوب خان کی کابینہ میں وزیر خارجہ تھے تو انھوں نے اردو ڈائجسٹ کے لیے ان کا انٹرویو کیا۔ اس انٹرویو میں بھٹو صاحب نے کچھ ایسی باتیں بھی کہہ دیں جن کی بنا پر وہ کابینہ سے نکال دیے گئے۔ یکم جون ۱۹۶۶ کو یہ انٹرویو شائع ہوا تو بھٹو صاحب نے علی الصبح مجھ پر ایوان صدر راولپنڈی سے فون کر کے الزام لگایا کہ انٹرویو میں وہ باتیں بھی شائع کر دی ہیں جو انھوں نے آف دی ریکارڈ کہی تھیں۔ اس لیے فوراً ان کی تردید شائع کی جائے۔

جن باتوں پر بھٹو صاحب کو اعتراض تھا' ان میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ انھوں نے بھارت کے خلاف بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان بھارت کی بالادستی کبھی قبول نہیں کرے گا اور اگر اسے اپنی تہذیب اور روایات کے تحفظ کے لیے بھارت سے جنگ بھی کرنا پڑی تو وہ یہ کر گزرے گا۔ اس انٹرویو پر ایوب خان نے بھٹو کی سخت گرفت کی کہ معاہدہ تاشقند کے بعد وہ ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟ بھٹو نے انٹرویو میں کہی گئی بات کو آف دی ریکارڈ قرار دیتے ہوئے اردو ڈائجسٹ سے اس کی تردید شائع کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

عطاء الحق قاسمی نے جناب الطاف حسن قریشی سے تصدیق چاہی کہ کیا واقعی بھٹو صاحب نے یہ باتیں آف دی ریکارڈ کہی تھیں۔ الطاف صاحب نے نفی میں جواب دیتے ہوئے بتایا کہ ہرگز ایسا نہیں تھا اور یہ بات انٹرویو ہی کا حصہ تھی۔ بھٹو صاحب محض ایوب خان کی ناراضی سے بچنے کے لیے انٹرویو چھپنے کے بعد ان باتوں کو آف دی ریکارڈ قرار دے رہے تھے۔

الطاف صاحب پھر اپنی تحیر خیز داستان سنانے لگے کہ جب اردو ڈائجسٹ اعلیٰ صحافتی روایات پر کاربند رہتے ہوئے اپنے موقف پر قائم رہا اور اس نے تردید شائع کرنے سے انکار کر دیا تو بھٹو صاحب نے یہ بات دل میں رکھ لی۔ ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم میں وہ اردو ڈائجسٹ کے خلاف سخت لہجے میں باتیں کرتے رہے اور جب برسر اقتدار آئے تو صرف تین ماہ بعد ہی ہمیں گرفتار کر کے اردو ڈائجسٹ اور ہفت روزہ زندگی بند کر دیے گئے۔ ان کے ڈکلیریشن منسوخ کر دیے گئے اور پریس ضبط کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں میرے علاوہ ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی' مجیب الرحمن شامی' حسین نقی اور مظفر قادری بھی شامل تھے۔

عطاء الحق قاسمی نے الطاف صاحب کو یاد کرواتے ہوئے بتایا کہ آپ سب لوگوں کی گرفتاری کے بعد انھوں نے اپنے کالم میں بھٹو صاحب کے اس بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہ ملک میں صحافت آزاد ہے پر طنزاً لکھا تھا کہ ایک عطائی کوئی دوائی بیچ رہا تھا۔ اس کے اوصاف بتانے کے بعد اس نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ کوئی اعتراض ہے تو بتائے۔ مجمع میں سے کسی شخص نے اعتراض اٹھایا جس پر عطائی نے اسے جھڑک دیا کہ تم چپ رہو اور پھر مجمع سے مخاطب ہوا کہ کسی اور کو کوئی اعتراض ہو تو بتائے۔ قاسمی صاحب نے کہا کہ بھٹو کے صحافت آزاد ہونے والے بیان کی مثال بھی ایسی ہی تھی۔

پروگرام کی میزبان فائزہ بخاری نے جناب الطاف حسن قریشی صاحب سے کہا کہ بھٹو صاحب نے اپنے دور اقتدار میں آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا' مگر ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ آپ کے ساتھ ہی جیل میں قید تھے۔ اس واقعے کے بارے میں

کچھ بتائیے۔

الطاف صاحب نے اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا کہ جنرل ضیاء الحق حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار میں آئے تو میں نے دو ماہ بعد ان کا انٹرویو لیا جو پانچ گھنٹوں پر محیط تھا۔ وہ رمضان المبارک کا مہینا تھا اور نماز تراویح کے بعد شروع ہونے والا انٹرویو سحری تک جاری رہا۔ اس میں جنرل ضیاء الحق نے آپریشن فیئر پلے کی پوری داستان تفصیل سے بیان کی۔ یہی تفصیلات بعد میں بین الاقوامی میڈیا میں اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے اس انٹرویو کے توسط سے منظر عام پر آئی تھیں۔

بعد ازاں ضیاء کے بعض کاسہ لیسوں نے انھیں یہ باور کروایا کہ یہ انٹرویو بہت گستاخانہ انداز میں لیا گیا ہے' ۲۰ اکتوبر کی رات دو بجے مجھے گرفتار کر کے کوٹ لکھپت جیل میں بھیج دیا گیا۔ اتفاق کی بات یہ کہ بھٹو صاحب بھی اسی سیل کے متصل سیل میں تھے جس میں انھوں نے ہم دو بھائیوں کو دو سال سے زائد قید رکھا تھا۔ اس دوران بھٹو صاحب سے اشاروں اشاروں میں سلام دعا ہو جاتی کیونکہ سختی بہت تھی۔ ایک دن ان کی چٹ آئی کہ انھیں اردو ڈائجسٹ کا وہ شمارہ چاہیے جس میں جنرل ضیاء الحق کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ وہ شمارہ بہت دشواری کے بعد انھیں فراہم کیا گیا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی قید کے دوران لکھی گئی انگریزی کتاب ''If I am assasinated'' میں کیا ہے۔

جناب عطاء الحق قاسمی نے ذومعنی انداز میں الطاف صاحب سے استفسار کیا کہ آئندہ تو آپ کسی کا انٹرویو نہیں لیں گے۔ الطاف صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ انٹرویو تو لیتے ہی رہیں گے اور ابھی جناب صدر آزاد کشمیر کا انٹرویو لے کر آئے ہیں۔

میزبان فائزہ بخاری نے سوال پوچھا کہ آپ نے بیسیوں شخصیات سے انٹرویو لیے ہیں' ان میں سے وہ کون سی ایسی شخصیت ہے جس نے ذاتی طور پر آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا؟

محترم الطاف حسن قریشی نے کہا کہ اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے' کیونکہ ہر شخصیت کا اپنا ایک خاص انداز فکر اس کے اپنے مشاہدات اور اس کے حیرت انگیز تجربات ہوتے ہیں لیکن فکری طور پر مجھے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے انٹرویو نے بہت متاثر کیا کیونکہ انھوں نے تخلیقی اور علمی اعتبار سے ایسے سوالات کے نہایت خیال افروز جوابات دیے ہیں جو اس وقت بھی بے انتہا ضروری تھے اور آج بھی بہت ضروری ہیں۔ جس وقار و متانت اور فکری گہرائی کے ساتھ انھوں نے انٹرویو دیا وہ حد درجہ متاثر کن تھا۔

اس کے علاوہ سعودی فرمانروا شاہ فیصل شہید کا انٹرویو بھی بہت ایمان افروز اور حکمت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس انٹرویو سے قبل عرب اسرائیل جنگ ہو چکی تھی جس میں عربوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ شاہ فیصل شہید کی خاص بات یہ تھی کہ وہ اردو سمجھتے تھے گفتگو عربی میں کرتے تھے اور مترجم مفہوم بیان کرتا جاتا تھا۔ وہ بہت بالغ النظر تھے اور ان سے بات کرتے ہوئے یہ محسوس ہوا کہ ان کی بین الاقوامی مسائل کی جہات اور عالم اسلام کے تمام معاملات پر نہایت گہری نظر ہے۔ ان میں قیادت کی اعلیٰ صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ آنکھوں میں بہت گہرائی اور ان کی شخصیت بڑی پروقار تھی۔

میرے لیے یہ بات بڑے فخر کا باعث تھی کہ میں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا شاہ فیصل شہید کی معیت میں گزارا جن سے پانچ منٹ کے لیے بات کرنے کو عالمی زعما ترستے تھے۔ یہ عظیم سعادت اور غیر معمولی اعزاز مجھے صرف پاکستان کے طفیل نصیب ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے انٹرویوز پر مشتمل اپنی کتاب ''ملاقاتیں کیا کیا'' کا انتساب بھی پاکستان ہی کے نام کیا ہے۔ پاکستان وہ عظیم ملک ہے جس نے ہمیں عزت دی' وقار دیا اور ہمارے لیے امکانات کا ایک جہاں آباد کیا' ورنہ بھارت میں ہوتے تو کشتہ ستم ہوتے اور باطل کے سامنے ہمیشہ سرنگوں رہتے۔

کرشماتی شخصیت کے مالک شہزادہ محمد بن سلمان

سید عاصم محمود

سعودی عرب کو بدلنے کا عزم رکھنے والا نوجوان سعودی شہزادہ

عالم اسلام کی اہم ترین مملکت میں تبدیلی وجدت کے علم بردار بن جانے والے ذکی وتیز فہم شہزادے کی اُمید افزا سرگزشت جو سعودی عرب میں معاشرتی، معاشی اور سیاسی انقلاب لاکر اس کو طاقتور ملک کا روپ دینا چاہتے ہیں

یہ مارچ ۲۰۰۷ء کی بات ہے، سعودی عرب میں تعینات امریکی سفیر، جیمز اوبرویٹر کو بش حکومت نے واپس بلا لیا۔ امریکی سفیر واپسی سے قبل گورنر ریاض، شہزادہ سلمان بن عبدالعزیز سے الوداعی ملاقات کرنے ان کے پاس پہنچا۔

اس زمانے میں امریکی حکومت نے ویزا دینے کی پالیسی سخت کر دی تھی اور نت نئی شرائط متعارف کروا دی گئیں۔ شہزادہ سلمان اپنی ایک بیگم کو بغرض علاج مع بچوں کے امریکا بھجوانا چاہتے تھے، مگر امریکی سفارت خانہ لیت و لعل سے کام لے رہا تھا۔ گورنر ریاض نے امریکی سفیر سے درخواست کی کہ وہ ویزا حاصل کرنے میں ان کی مدد کریں۔ جیمز اوبرویٹر نے حامی بھر لی۔

جیمز نے اپنے سفارت خانے پہنچ کر اہل کاروں سے استفسار کیا کہ گورنر ریاض کے اہل خانہ ویزے سے کیوں محروم ہیں؟ افشا ہوا کہ شہزادہ سلمان کے ایک بیٹے، محمد فنگر پرنٹ لینے کا عمل نہیں کروانا چاہتے۔ ان کا کہنا ہے ''کیا میں ہوں کہ فنگر پرنٹ دوں؟'' امریکی اہل کاروں کے اصرار کے باوجود شہزادہ محمد یہ عمل انجام دینے سے انکاری تھے۔

سعودی شاہی خاندان کی خوشنودی کی خاطر آخر امریکی سفیر نے شہزادہ محمد کو فنگر پرنٹ لینے کے عمل سے مبرا قرار دے دیا۔ یوں گورنر ریاض کے اہل خانہ کو پاسپورٹ مل گئے۔

یہ واقعہ عیاں کرتا ہے کہ شہزادہ محمد ایک خوددار، نڈر اور اپنے ملک وقوم کی سربلندی پر یقین رکھنے والے فرد ہیں۔ انہیں امریکیوں کی حد سے زیادہ جانچ پڑتال پسند نہ آئی لہٰذا شہزادے نے امریکی اشاروں پر چلنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اپنی بات منوا کر دم لیا۔ آج یہی نوجوان سعودی شہزادہ اپنے والد، شاہ سلمان کے بعد سعودی عرب کی سب سے طاقت ور شخصیت بن چکے۔ اہم بات یہ کہ وہ اپنے حیرت انگیز اقدامات سے سعودی عرب میں معاشی، سیاسی اور معاشرتی انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

سعودی خاندان کی تاریخ:

ستمبر ۱۹۳۲ء میں کرشماتی راہنما ابن سعود نے سعودی عرب کی بنیاد رکھی۔ اس سے قبل جزیرہ نما عرب کے مختلف علاقوں میں مقامی قبائل حکومت کر رہے تھے۔ ابن سعود نے سبھی علاقے فتح کر کے مملکت سعودیہ کی بنیاد ڈال دی۔

عالمی سطح پر سعودی عرب کو ۱۹۳۸ء سے اہمیت ملنے لگی جب مشرقی علاقے (الاحساء) میں تیل دریافت ہوا اور گیس بھی۔ تیل کی فروخت سے ملنے والی آمدن مملکت میں ترقی وخوشحالی لانے لگی۔ آج بھی سعودیہ دنیا میں تیل کے دوسرے بڑے اور گیس کے چھٹے بڑے ذخائر رکھتا ہے۔ یہ دنیا میں سب سے زیادہ تیل پیدا کرنے والا ملک ہے۔

نومبر ۱۹۵۳ء میں ابن سعود کی وفات کے بعد ان کے دوسرے بیٹے، سعود بعمر اکیاون سال تخت نشین ہوئے۔ سعود نے ابتداً عمدہ لحاظ سے حکومت کی اور اچھی پالیسیاں تشکیل دیں لیکن پھر وہ تیل سے ہونے والی آمدن محلات بنانے اور بے فائدہ منصوبے شروع کرنے پر لگانے لگے۔ اس باعث سعودی عرب قرضوں کے بندھن میں جکڑا گیا۔

جب حالات ابتر ہو گئے، تو نومبر ۱۹۶۴ء میں ابن سعود کے تیسرے بیٹے اور سوتیلے بھائی، فیصل نے علمائے کرام اور شاہی خاندان کے بزرگوں کی حمایت سے حکومت سنبھال لی۔

تب ان کی عمر ستاون سال تھی۔ شاہ فیصل ایک ذہین، باصلاحیت اور عوام دوست راہنما تھے۔ انہوں نے جدید دور سے ہم آہنگ ہونے کے لیے مختلف اقدامات کیے، مگر اسلامی اقدار سے ناتا نہیں توڑا۔ وہ اسلام اور جدیدیت کی خوبیوں سے فائدہ اٹھا کر نیا معاشرتی سیاسی ومعاشی نظام تشکیل دینا چاہتے تھے۔

شاہ فیصل ۱۹۷۳ء میں عالم اسلام کے ہیرو بن گئے جب انہوں نے سپر پاور امریکا کو تیل کی سپلائی روک کر وہاں ہلچل مچا دی۔ اسرائیل کی پشت پناہی کرنے پر شاہ فیصل امریکی حکومت سے سخت ناراض تھے۔ خیال ہے کہ اس وار سے امریکی حکمران طبقہ اتنا زیادہ برافروختہ ہوا کہ اس نے شاہ فیصل کو شہید کروا دیا۔

۱۹۷۵ء میں شاہ فیصل کی شہادت کے بعد ابن سعود کے پانچویں بیٹے، شاہ خالد تخت نشین ہوئے۔ تب وہ ساٹھ سال کے تھے۔ موصوف امراض قلب میں مبتلا تھے لہٰذا زیادہ عرصے نہ جیئے۔ ۱۹۸۲ء میں وہ چل بسے اور ابن سعود کے آٹھویں فرزند اکسٹھ سالہ فہد نے حکومت سنبھال لی۔

ایک نئے شہزادے کی آمد:

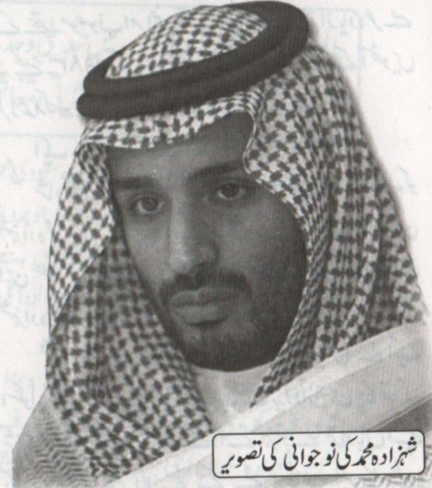
شاہ فہد کے دور حکومت ہی میں ۱۳ راگست ۱۹۸۵ء کو شہزادہ محمد جدہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، شہزادہ سلمان ابن سعود کے پچیسویں بیٹے ہیں۔ والدہ، فہدہ بنت فلاح شہزادہ سلمان کی تیسری بیگم تھیں۔

شہزادہ محمد نے ہوش سنبھالا تو انہیں ریاض کے ایک اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ تب تک یہ رواج بن چکا تھا کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے شہزادے شہزادیاں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے برطانیہ، امریکا وغیرہ

بجھوانے لگے تھے۔ مگر شہزادہ محمد نے تمام تر تعلیم سعودی عرب کے تعلیمی اداروں ہی میں پائی۔ یہ خصوصیت انہیں تمام شہزادوں میں ممتاز کرتی ہے۔

جب شہزادہ محمد کنگ سعود یونیورسٹی پہنچے، تو انٹرنیٹ منظر عام پر آچکا تھا۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں بتایا ''میری ذہنی نشوونما میں انٹرنیٹ اور شاہی خاندان نے بنیادی کردار ادا کیا۔ شہزادوں میں میری پہلی نسل ہے جس نے انٹرنیٹ استعمال کیا، ویڈیو گیمز کھیلیں اور بہت سی معلومات کمپیوٹر اسکرین پر پائیں۔ نہ صرف ہماری سوچ مختلف ہے بلکہ ہم نے اپنے آباؤاجداد سے بالکل مختلف خواب دیکھے۔''

شہزادے کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے والد مطالعے کے بہت شوقین ہیں۔ وہ اپنے تمام بچوں کو ہر ہفتے ایک ایک کتاب پڑھنے کو دیتے۔ اختتام ہفتہ پر شہزادہ سلمان بچوں سے کتابوں کے متعلق سوالات کرتے تا کہ جان سکیں، انہوں نے کتنی گہرائی و گیرائی سے کتاب کا مطالعہ کیا ہے۔ اس چلن کے باعث تمام بچوں میں سوچ بچار کا مادہ پیدا ہوگیا اور ان کی ذہنی سطح دیگر شہزادے شہزادیوں کی نسبت بلند ہوگئی۔



شہزادہ محمد کی نوجوانی کی تصویر

شہزادی فہدہ نے بھی بچوں کی انوکھے انداز میں تعلیم و تربیت کی۔ جب بچے اسکول کا کام کر لیتے، تو مختلف کھیل کھیلتے۔ والدہ اکثر انہیں تاریخی مقامات لے جاتیں اور کبھی عجائب گھر دیکھنے جاتے۔ ہفتے میں تین بار علم وادب سے وابستہ دانش ور محل آجاتے۔ وہ پھر مختلف موضوعات پر بچوں سے علمی گفتگو کرتے۔ مقصد یہی تھا کہ ان کی ذہنی نشوونما ہو سکے۔

شہزادہ سلمان اور شہزادی فہدہ، دونوں ہی بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملات میں نہایت سخت تھے۔ شہزادہ محمد بتاتے ہیں۔ ''اگر ہمیں کھانے کی میز پر پہنچتے ہوئے دیر ہو جاتی، تو والد کی جھڑکیاں ہم پر تلوار بن کر گرتیں۔'' جب کہ والدہ کی سخت مزاجی کا یہ عالم تھا کہ بچے اکثر سوچنے لگتے ''آخر یہ ہم پر اتنا ظلم کیوں کرتی ہیں؟'' کوئی بچہ غلطی کرتا، تو اسے سزا ضرور ملتی۔ آج شہزادہ محمد اقرار کرتے ہیں ''انھی سزاؤں کی وجہ سے نہ صرف ہم راہ مستقیم پر گامزن ہوئے بلکہ ذہنی ونفسیاتی طور پر طاقتور بھی ہوگئے۔''

نوجوان ہوتے شہزادہ محمد کے سامنے سوتیلے بڑے بھائی بھی اپنی فتوحات کے باعث آئیڈیل قرار پائے۔ شہزادہ سلطان بن سلمان دنیائے اسلام کے پہلے خلاباز ہیں جنھوں نے جولائی ۱۹۸۵ء میں خلائی جہاز، ڈسکوری میں مشن انجام دیا۔ شہزادہ عبدالعزیز وزیر توانائی کی حیثیت سے ملک وقوم کی خدمت کرتے رہے۔ تیسرے بھائی، شہزادہ فیصل آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر چکے۔ یہ سب بڑے بھائی اپنے چچا، شاہ فہد کے قریب تھے۔

شاہ فہد ۲۰۰۵ء میں انتقال کر گئے، تو ابن سعود کے دسویں بیٹے، شاہ عبداللہ تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے ۲۰۱۱ء میں شہزادہ سلمان کو ڈپٹی وزیر اعظم اور وزیر دفاع مقرر کر دیا۔ شہزادہ سلمان ۱۹۶۳ء سے ۲۰۱۱ء تک ریاض کے گورنر رہے۔

افسر شاہی سے ٹاکرا:

۲۰۰۷ء میں شہزادہ محمد نے وکالت میں بیچلر ڈگری حاصل کر

ل۔ اب ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی یورپی یونیورسٹی سے ماسٹرز کر
یں۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا بیاہ بھی رچانا چاہتے تھے۔ تاہم ان کے
والد نے بیٹے پر زور دیا کہ وہ حکومت کے کاموں میں دخل دیں
اور حکومتی انتظام کو بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

چنانچہ شہزادہ محمد ''سرکاری مشاورتی کمیٹی'' سے منسلک ہو
گئے۔ اس کمیٹی میں شامل ماہرین مختلف قانونی امور پر وزرا کو
ورے دیتے تھے۔ انہوں نے بعض فرسودہ اصول وقوانین
ل کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ کمیٹی کے سربراہ، ایسام
سعید بتاتے ہیں ''شہزادے ایک متحرک دانش ور ثابت
ہوئے۔ انہوں نے خاص طور پر افسر شاہی سے ٹکر لی جو سرخ
یتے کی شکار تھی۔ جس کام میں دو ماہ لگ جاتے تھے، شہزادہ محمد
حکم دیا کہ وہ دو دن میں پورا ہونا چاہیے۔'' (اور آج وہ کام
رنے کے لیے ایک دن دیتے ہیں۔)

شہزادہ محمد کی اہلیت واستعداد کار کے سبھی لوگ مداح تھے،
۲۰۰۹ء میں شاہ عبداللہ نے انہیں اعلیٰ عہدے پر تعینات
نے سے انکار کر دیا۔ دراصل انہیں خطرہ تھا کہ یوں ان پر
با پروری کا الزام لگ سکتا ہے۔ شہزادے کو بہر حال خاصا
دمہ پہنچا اور وہ حکومت سے الگ ہوگئے۔ اب وہ بہت سے
زادوں کی طرح اپنا کاروبار کرنا چاہتے تھے۔ مگر والد ایک
پھر آڑے آگئے۔ انہوں نے بیٹے کو اپنا مشیر بنا لیا۔ وہ
زادہ محمد کو حکومت کرنے کے اسرار ورموز سے
گاہ کرنے لگے۔

وہ وقت یاد کرتے ہوئے شہزادہ محمد بتاتے
ہیں: ''جب شاہ عبداللہ نے مجھے کسی اعلیٰ سرکاری
ے پر تعینات نہیں کیا، تو مجھے بہت صدمہ
چا۔ تب تک میری شادی ہو چکی تھی اور میں کسی
سیٹ نہیں تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ اب میں کیا
وں۔ تبھی والد نے مجھے سایہ عاطفت میں لے
اور میں ان کے مشیر کی حیثیت سے سرکاری

کاموں میں حصہ لینے لگا۔ میں سمجھتا ہوں، شاہ عبداللہ نے مجھے کوئی عہدہ نہ دے کر مجھ پر احسان کیا۔''

گورنر ریاض کے دفتر میں نئی نسل کے نمائندے نے دیکھا کہ پرانے طور طریقوں سے ہی کام جاری ہے۔ یوں بہت سے کام انجام پاتے ہوئے طویل عرصہ لگتا تھا۔ شہزادہ سلمان نے نیا طریق کار متعارف کروایا جس سے کام تیز ہونے لگا۔ مگر سرکاری افسروں کو محسوس ہوا کہ یوں ان پر کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ برسوں سے چلی آرہی سرخ فیتہ روش نے انہیں سست الوجود اور کاہل بنا دیا تھا۔ چنانچہ اب کام کرنا پڑا، تو ان کی چیخیں نکل گئیں۔

شاہ عبداللہ کی ناراضی:

۲۰۱۱ء میں شاہ عبداللہ نے اپنے سوتیلے بھائی، شہزادہ سلمان کو وزیر دفاع مقرر کر دیا۔ تاہم شہزادہ محمد کو وزارت دفاع میں داخلے سے منع کر دیا گیا۔ دراصل اعلیٰ سرکاری افسروں نے اپنی شکایات شاہ عبداللہ تک پہنچا دی تھیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر شاہ کے کان بھرے کہ شہزادہ محمد ہوس جاہ میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ شاہ عبداللہ نے باقاعدہ حکم جاری کر دیا کہ شہزادہ محمد کو کسی وزارت میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

یہ شہزادے پر دوسرا وار تھا جو انہوں نے پامردی سے سہہ لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شہزادہ سلمان نے بیٹے کو



فیس بک کے بانی، مارک زکر برگ کے ساتھ

صبر کی تلقین کی اور ہمت بندھائی۔ محمد پھر والد کی تعمیراتی کمپنی میں کام کرنے لگے۔ مزید برآں انہوں نے اپنی ایک فلاحی تنظیم بھی قائم کر لی جو مختلف شعبوں میں سعودی نوجوانوں کو راہنمائی دینے لگی۔

جون ۲۰۱۲ء میں ایک انہونا واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ولی عہد، شہزادہ نایف بن عبدالعزیز دل کا دورہ پڑنے سے اچانک انتقال کر گئے۔ تب شاہ عبداللہ نے شاہ سلمان کو نیا ولی عہد مقرر کر دیا۔ یوں قسمت یک لخت اس خانوادے پر مہربان ہو گئی۔ جلد ہی شاہ عبداللہ نے محمد پر عائد پابندیاں ہٹا لیں...... اب وہ سرکاری سرگرمیوں میں حصّہ لے سکتے تھے۔

شہزادہ محمد پھر اکثر اپنے سوتیلے چچا سے ملنے جانے لگے۔ ان میں ایک قدر مشترک تھی...... دونوں سعودی عرب کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ دونوں کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر سعودی عرب نے خود کو نہ بدلا، تو تیل ختم ہونے کے بعد یہ ملک دوسروں کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ جائے گا۔

جون ۲۰۱۳ء میں شاہ عبداللہ نے خصوصی طور پر بھتیجے کو بلوایا۔ شہزادہ محمد دوڑے دوڑے شاہ عبداللہ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے بھتیجے کو حکم دیا کہ وہ وزارت دفاع میں پڑا گند صاف کر ڈالیں۔ وزارت دفاع کے مسائل اتنے الجھے ہوئے تھے کہ شہزادہ سلمان بھی انہیں حل نہ کر پائے۔ اب شاہ نوجوان محمد کو موقع دینا چاہتے تھے۔

مگر شہزادہ محمد بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال کر اپنی پسپائی دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے وزارت دفاع کے معاملات اپنے ہاتھوں میں لینے سے انکار کر دیا۔ شہزادہ محمد یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں: ’’یہ جان کر چچا جان کو بہت غصّہ آ گیا۔ وہ چلا کر کہنے لگے، تمہارا کوئی قصور نہیں، اصل قصوروار تو میں ہوں کہ تمہیں ایک کام کرنے کا کہہ دیا۔‘‘ چچا کو غصے میں دیکھ کر شہزادہ محمد نے بادل نخواستہ ہامی بھر لی۔ دراصل انہیں علم تھا کہ وزارت دفاع میں اگر انہوں نے اکھاڑ پچھاڑ کی، تو طاقتور افسر شاہی پھر ان کی مخالف بن جائے گی۔ پھر بھی انہوں نے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا تہیّہ کر لیا۔

وزارت دفاع کا انتظام:

وزارت دفاع میں انتظام کے ذمے دار، ڈائریکٹر جنرل فہد الایحی بتاتے ہیں ’’شاہ عبداللہ نے ایک شاہی فرمان کے ذریعے شہزادہ محمد کو وزارت دفاع کا نگران بنا دیا لہٰذا اب وہ وزرات میں نئی قوتیں لیے داخل ہوئے۔ آتے ہی انہوں نے انتظام سنبھالنے میں مدد دینے والی مشہور بین الاقوامی فرموں، بوز ایلن ہملٹن اور بوسٹن کنسلٹنگ گروپ کی خدمات حاصل کیں۔ ان فرموں کے ماہرین کی مدد سے انہوں نے اسلحہ خریدنے، ٹینڈر دینے، شعبہ انفارمیشن ٹیکنالوجی اور شعبہ ہیومن ریسورسز کے قوانین بدل ڈالے۔‘‘

وزارت دفاع کے افسر اسلحے کے ٹھیکوں میں کمیشن کماتے تھے۔ اوپر سے نیچے تک رشوت کا راج تھا۔ شہزادہ محمد کی اصلاحات سے کرپشن کے بازار کا خاتمہ ہو گیا۔ انہوں نے لا ڈیپارٹمنٹ میں نوجوان بھرتی کیے اور اسلحہ کی خریداری کے کئی معاہدے نظر ثانی کی خاطر انہیں دے ڈالے۔ نظر ثانی سے انکشاف ہوا کہ کئی معاہدے بے فائدہ تھے اور صرف کمائی کی خاطر انہیں عملی جامہ پہنایا گیا۔

شہزادے کا کہنا تھا کہ سعودی عرب اسلحے کی خریداری پر رقم خرچ کرنے والا دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے لیکن ہتھیاروں کی کوالٹی کے لحاظ سے سعودی فوج کا شمار دنیا کی بیس بڑی افواج میں بھی نہیں ہوتا۔ بہر حال شہزادہ محمد کے اصلاحی پروگرام کی بدولت وزارت دفاع پہلے کی نسبت کہیں زیادہ فعال ہو گئی اور وہاں جدید ترین طریقے سے کام انجام پانے لگے۔

وزارت دفاع سے کاٹھ کباڑ صاف ہونے کی خبریں شاہ عبداللہ تک پہنچیں، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ان کی نظروں میں شہزادہ محمد ایک باصلاحیت، ذہین اور محنتی آدمی بن گئے چناں چہ ہر ہفتے چچا بھتیجے تین چار ملاقاتیں کرنے لگے۔ شاہ [illegible] بتاتے ہیں ’’شاہ عبداللہ کے گرد ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔ مگر جب چچا کو تسلّی ہو جاتی کہ میرا مشورہ صائب و برحق ہے، تو وہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے احکامات جاری کر دیتے‘‘۔

جنوری ۲۰۱۵ء میں شاہ عبداللہ وفات پا گئے۔ یوں ولی عہد، سلمان بن عبدالعزیز سعودی عرب کے نئے بادشاہ مقرر ہوئے۔ شاہ عبداللہ نے اپنے والد، ابن سعود کے سب سے چھوٹے بیٹے، شہزادہ مقرن بن عبدالعزیز کو نئے بادشاہ کا ولی عہد مقرر کیا تھا لہٰذا انہوں نے بھی اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ شہزادہ مقرن سعودی فضائیہ کے پائلٹ تھے۔ ۱۹۸۰ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد مختلف شہروں اور صوبوں کے والی رہے۔ شہزادہ عبداللہ انہیں پسند کرتے تھے مگر ان کی والدہ کا تعلّق یمن سے تھا۔ اسی لیے شاہی خاندان کی دیگر سرکردہ شخصیات کے نزدیک وہ قابل اعتماد نہیں تھے۔

شاہ عبداللہ نے ۲۰۰۷ء میں ولی عہد مقرر کرنے کی خاطر ایک مجلس، ہیت بیعت کے نام سے قائم کی تھی۔ ابن سعود کے ۳۴ فرزند اور پوتے اسی مجلس ہیت بیعت کے رکن ہیں۔ خیال ہے کہ یمنی والدہ کا بیٹا ہونے کے باعث ہی اپریل ۲۰۱۵ء میں شہزادہ مقرن کو ولی عہدی سے ہٹا دیا گیا۔ یہ ایک اہم پیش رفت تھی کیونکہ ماضی میں مرحوم بادشاہ کے مقرر کردہ کسی ولی عہد کو اپنے عہدے سے نہیں ہٹایا گیا تھا۔ اس واقعے سے عیاں ہو گیا کہ سعودی شاہی خاندان میں تبدیلی کی ہوا چل پڑی ہے۔

نائب ولی عہد بن گئے:

سعودی شاہی خاندان تقریباً چار ہزار شہزادے شہزادیوں پر مشتمل ہے۔ سرکاری عہدوں پر صرف شہزادے ہی فائز ہوتے ہیں۔ جو شہزادے باصلاحیت اور ذہین ہوں، وہ اپنے کاموں کی وجہ سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی شہزادے، محمد بن نائف بھی تھے۔ یہ ۲۰۱۲ء سے وزیر داخلہ چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے مملکت میں القاعدہ سمیت سبھی جنگجو تنظیموں کو لگام دینے میں خاطر خواہ کامیابی پائی تھی اور یوں دنیا بھر میں ان کا چرچا ہو گیا۔ مزید برآں شاہ سلمان ان کے حقیقی چچا ہیں چناں چہ شاہ سلمان نے اپنے بھتیجے، شہزادہ محمد بن نائف کو نیا ولی عہد مقرر کر دیا۔ تاہم آنے والے وقت میں حالات تیزی سے بدلے اور شاہ سلمان کے بعد حکومت کی بیشتر قوتیں ان کے بیٹے، محمد کی ذات میں مجتمع ہوتی چلی گئیں۔

جنوری ۲۰۱۵ء تک سعودی شاہی خاندان کے علاوہ سعودی عرب میں بیشتر عوام بھی شہزادہ محمد بن سلمان سے ناواقف تھے مگر پھر شہزادے اتنی تیزی سے رفعت و سربلندی کی سیڑھیاں چڑھے کہ دوست دشمن، سبھی حیران رہ گئے۔ شاہ سلمان نے تخت نشین ہوتے ہی بیٹے کو نائب ولی عہد بنا ڈالا تھا۔ جلد ہی وہ وزیر دفاع بن گئے، پھر انہیں قومی معاشی پالیسی بنانے اور سرکاری تیل کمپنی، سعودی آرامکو چلانے کی ذمے داریاں بھی سونپ دی گئیں۔

مملکت سعودی عرب کی تاریخ میں پہلی بار یہ حیرت انگیز عمل دیکھنے کو ملا کہ ولی عہد سے زیادہ نائب ولی عہد زیادہ بااختیار اور بااثر بن گیا۔ حتیٰ کہ سعودیہ میں مقیم امریکی و مغربی سفارت کار شہزادہ محمد کو مسٹر ’’ایوری تھنگ‘‘ (یا مسٹر ہر فن مولا) کہنے لگے۔ تب شہزادے کی عمر صرف ۳۱ برس تھی۔ اس عمر میں بیشتر نوجوان شادی کر کے خاندان بنانے و چلانے کی تگ و دو



جنرل راحیل شریف اور شہزادہ محمد

تنگ و دو میں ہوتے ہیں مگر شہزادہ محمد نوجوانی ہی میں اتنے تجربے کار ہو چکے تھے کہ وہ بالغ وزیر راہنما کی حیثیت سے دنیا کے ایک اہم ملک کی باگ ڈور سنبھالنے لگے۔

شہزادہ محمد بن سلمان کی حیران کن ترقی و رفعت کا راز یہ ہے کہ سعودی نئی نسل انہیں ایک ایسے نوجوان مصلح اور لیڈر کے طور پر دیکھنے لگی جو برسوں سے جامد معاشرے میں تبدیلیاں لانا چاہتا ہے۔ واضح رہے، سعودی عرب کی تین کروڑ آبادی میں تیس سال سے کم عمر نوجوانوں کی تعداد تقریباً ''۷۰ فیصد'' ہے۔ کروڑوں سعودی نوجوانوں میں مقبول ہونے کے باعث ہی شہزادہ محمد بن سلمان اتنے طاقتور ہو گئے کہ شاہی خاندان میں ان کی کھلی مخالفت کرنے والا کوئی نہ رہا۔

نوجوانوں میں مقبول ہونے کی خاطر شہزادہ محمد نے بعض اہم اقدامات کیے۔ مثال کے طور پر مذہبی پولیس سے گرفتار کرنے کا اختیار واپس لے لیا گیا۔ ایک تفریحی ادارے کی بنیاد رکھی گئی جو مملکت میں کنسرٹ اور تفریح کے دیگر پروگرام کرواتا ہے۔ مزید برآں شہزادے نے سوشل میڈیا میں سرگرم علما سے تعلقات بڑھائے جو سعودی نوجوان نسل میں مشہور ہیں۔ ان علما سے سینما کھولنے کے لیے صلاح مشورہ جاری ہے۔ ان اقدامات سے شہزادہ محمد سعودی عوام میں بہت مقبول ہو گئے۔ انہیں ایک متحرک، جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور عوام دوست لیڈر کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔

سعودی عرب، بحران کی زد میں

اگرچہ معاشی طور پر شہزادہ محمد کو بعض سخت اقدامات کرنا پڑے جن کی وجہ سے ان پر تنقید بھی ہوئی۔ دراصل جب مشرق وسطی میں عرب بہار کا آغاز ہوا، تو سعودی حکومت اپنے عوام کو ٹھنڈا رکھنے کی خاطر انہیں وسیع پیمانے پر مراعات دینے لگی۔ بجلی و گیس اور تیل کی قیمتیں گھٹا دی گئیں۔ دیگر بہت سی خدمات (سروسز) پر بھی سبسڈی دی جانے لگی۔

خوش قسمتی سے ۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۴ء تک تیل کی قیمتیں بھی چڑھی رہیں لہٰذا سعودی حکومت کو سالانہ اربوں ڈالر آمدن ہوتی رہی۔ ڈالروں کی برسات کے باعث مراعات و سبسڈی پر ہونے والے اخراجات پوشیدہ رہے لیکن اواخر ۲۰۱۴ء سے تیل کی قیمت میں اتار آیا، تو سعودی حکومت کی آمدنی بھی تیزی سے گھٹنے لگی۔ چناں چہ مراعات و سبسڈی کا خرچ زرمبادلہ سے حاصل کیا جانے لگا۔

جب شہزادہ محمد معاشی امور کے انچارج بنے، تو انہیں بتایا گیا کہ سعودی عرب ۵۰۰ ارب ڈالر کا زرمبادلہ رکھتا ہے۔ مگر بے پناہ اخراجات کی وجہ سے یہ صرف دو سال میں خرچ ہو جائیں گے۔ شہزادہ محمد بتاتے ہیں: ''یہ سن کر میرے اوسان گم ہو گئے۔ میں سوچنے لگا کہ اخراجات کی رفتار یہی رہی، تو ملک دیوالیہ ہو سکتا ہے۔'' لہٰذا انہوں نے اخراجات گھٹانے کی خاطر ہنگامی حالت نافذ کر دی۔

ہنگامی حالت کے باعث سب سے پہلے یوٹیلیٹی بلوں میں دی جانے والی سبسڈی ختم کر دی گئی۔ اعلیٰ سرکاری افسروں کے بونس ختم ہو گئے۔ مزید برآں مملکت میں مختلف نئے ٹیکس متعارف کروائے گئے جن کا ٹارگٹ مملکت کا امیر طبقہ تھا۔ تاہم پانی، بجلی اور پٹرول کی قیمتیں بڑھنے پر سوشل میڈیا میں شہزادہ محمد کو اچھی خاصی تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

معاشی بحران سے گزر کر ہی شہزادہ محمد کو احساس ہوا کہ بدلتے حالات میں سعودیہ کو ایک جامع اور دوررس معاشی پالیسی کی ضرورت ہے۔ وہ شاہ سلمان کی اجازت سے مملکت کی نئی قومی معاشی پالیسی تیار کرنے لگے۔ شہزادے نے ماہرین معاشیات کی مدد سے رات دن محنت کر کے یہ منصوبہ تیار کر لیا۔

نئے ویژن کا جنم:

اپریل ۲۰۱۶ء میں یہ معاشی پالیسی ''ویژن ۲۰۳۰ء'' کے نام سے جاری کر دی گئی۔ شہزادہ محمد اس ویژن کی رو سے سعودی عرب کو عالم اسلام کا قلب بنا دینا چاہتے ہیں۔ سرمایہ کاری کا ایسا عظیم الشان مرکز جو تین بڑے براعظموں کو باہم

ملانے کا فریضہ بھی انجام دے گا۔

ویژن ۲۰۳۰ء کا خاص نکتہ ''قومی ویلتھ فنڈ'' کا قیام ہے۔ شہزادہ محمد دنیا کی سب سے بڑی آئل کمپنی، سعودی آرامکو کے پانچ فیصد حصص فروخت کر کے اس فنڈ کو رقم فراہم کرنا چاہتے ہیں۔ خیال ہے کہ یہ قومی ویلتھ فنڈ بالآخر ''دو ٹریلین ڈالر'' کی خطیر رقم کا مالک ہو گا۔ یہ رقم دنیا بھر کی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کرنے میں کام آئے گی۔ یہ رقم کتنی دیوہیکل ہے، اس کا اندازہ یوں لگائیے کہ دو ٹریلین ڈالر سے دنیا کی چار سب سے بڑی کمپنیاں یعنی ایپل، گوگل، مائیکروسافٹ اور برکشائر ہیتھ وے خریدی جا سکتی ہیں۔

ماہرین معاشیات کے نزدیک سعودی آرامکو کا آئی پی او انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ مالیت کا آئی پی او بننے کی طاقت رکھتا ہے۔ گویا یہ سعودی عرب کے قومی ویلتھ فنڈ کو دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ کار بھی بنا ڈالے گا۔ اس عظیم الشان آئی پی او کا مقصد بھی زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنا ہے تاکہ وہ عالمی سطح پر سرمایہ کاری کرنے میں کام آئے۔ شہزادہ محمد کا ویژن یہ ہے کہ بیس سال بعد سعودی عرب کی معیشت تیل کی محتاج نہ رہے اور وہ اس پر انحصار نہیں کرے۔

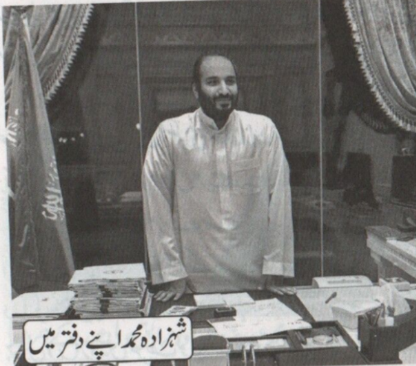
شہزادے کے ویژن ۲۰۳۰ء کا ایک اہم پہلو سعودیہ میں روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہے۔ سعودی عرب میں بیشتر افرادی قوت سرکاری محکموں سے وابستہ ہے۔ شہزادہ محمد نجی شعبے کی حوصلہ افزائی کرنا اور اسے مراعات دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ نئی صنعتیں لگائے اور یوں روزگار کے نئے مواقع پیدا ہوں۔ ساتھ ساتھ شہزادہ محمد ۲۰۳۰ء تک تمام سرکاری محکموں میں ''ای گورنس'' کا نظام بھی نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

سیاست کے میدان میں:

جدت، تبدیلی اور اصلاح کے استعارے سمجھے جانے والے شہزادہ محمد پرجوش سیاسی عزائم بھی رکھتے ہیں۔ ان کا ویژن یہ ہے کہ سعودیہ کو دنیائے عرب کا لیڈر بنا دیا جائے۔ کسی زمانے میں مصر کو یہ مقام حاصل تھا۔ مگر ۲۰۱۱ء کے بعد جب مصر سیاسی عدم استحکام کا نشانہ بنا، تو اس سے یہ بالا مقام چھن گیا۔ یہی وجہ ہے، جب شہزادہ محمد کو وزیر دفاع بنے صرف دو ماہ ہوئے تھے کہ انھوں نے یمن کے باغی حوثیوں پر دھاوا بول دیا۔

یمن میں فرقہ وارانہ کشیدگی عروج پر ہے۔ حوثی شیعہ اور یمنی سنی قبائل ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ سعودی عرب نے سنی قبائل کی حمایت میں فوجی آپریشن شروع کیا اور حوثی فوج کے ٹھکانوں پر ہوائی حملے کیے۔ یہ آپریشن تاحال جاری ہے مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا، چونکہ ایران حوثی باغیوں کی مالی و عسکری امداد کر رہا ہے لہٰذا یمن کے معاملے میں اس کا سعودی عرب سے براہ راست ٹکراؤ ہو گیا۔ تب سے دونوں ممالک کے مابین تعلقات میں اتار چڑھاؤ آتے رہے ہیں۔

۲۰۱۱ء میں عرب بہار کے دوران بحرین میں شیعہ اکثریت نے سنی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ حکمرانوں نے آہنی ہاتھ سے اس بغاوت کو کچل ڈالا۔ اس دوران بحرینی حکومت کو سعودیہ کی حمایت حاصل رہی۔ اسی امر نے بھی عالم اسلام کی بڑی طاقتوں کے درمیان تناؤ بڑھا دیا۔ شام اور لبنان میں بھی ایران اور سعودی عرب کے حمایت یافتہ گروہ ایک



شہزادہ محمد اپنے دفتر میں

دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ شام میں ایرانی حکومت بشارالاسد کی حامی ہے۔ جب کہ سعودی عرب اور امریکا سمیت دیگر مغربی ممالک سنی جنگجو تنظیموں کی حمایت کر رہے ہیں۔

شہزادہ محمد کا دعویٰ ہے کہ ایران اپنے انقلاب کے نظریات پورے عالم اسلام میں پھیلانا چاہتا ہے، چونکہ سعودی عرب سمیت اکثر عرب ممالک میں بادشاہتیں قائم ہیں لہٰذا وہ ایرانی انقلابی نظریات کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ پچھلے چند برس سے تو سعودی عرب سمیت خلیجی ممالک کے لیے یہ خطرہ اتنا زیادہ بڑھ چکا کہ ان کا روایتی دشمن، اسرائیل پس پشت چلا گیا۔ بعض ماہرین کا دعویٰ ہے شہزادہ محمد اسرائیل اور فلسطینیوں کے مابین امن معاہدہ کروانا چاہتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ عرب ممالک پھر مل کر ایرانی خطرے کا مقابلہ کر سکیں۔ اس ضمن میں شہزادہ محمد کو ایران کے کٹر مخالف، امریکی صدر ٹرمپ کی حمایت بھی حاصل ہے۔

اسلامی فوج سے قطر تک:

۲۰۱۵ء میں شہزادہ محمد نے ''اسلامی فوج'' قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاک فوج کے ریٹائرڈ سپہ سالار، جنرل راحیل شریف کو اس فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ شہزادہ محمد کی خواہش ہے کہ دنیائے اسلام میں کسی بھی جگہ دہشت گرد جنم لیں، تو یہ فوج ان کا مقابلہ کرے۔ یہ فوج بھی فی الحال تشکیل کے مرحلے میں ہے۔ سعودی عرب کا دعویٰ ہے کہ ۴۰ اسلامی ممالک اس فوج میں حصہ لینے کا اعلان کر چکے۔

جنرل راحیل شریف کی تعیناتی سے عیاں ہوا کہ سعودی عرب اور پاکستان کے عسکری تعلقات نہایت گہرے ہیں۔ پاک فوج کے انسٹرکٹر طویل عرصے سے شاہی سعودی سپاہیوں کی تربیت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ پاکستان چونکہ ایٹمی اسلحے سے لیس واحد اسلامی ملک ہے لہٰذا اس کی افواج کا شمار بھی دنیا کی بہترین آرمیوں میں ہوتا ہے۔ یہی حقیقت مدنظر رکھ کر جنرل (ر) راحیل شریف کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ اسلامی فوج کا ڈھانچا کھڑا کرنے میں سعودی حکومت کی مدد کریں۔

اوائل جنوری ۲۰۱۷ء میں شہزادہ محمد اور متحدہ عرب امارات کے وزیراعظم، شیخ محمد بن راشد المکتوم نے قطر پر مختلف پابندیاں عائد کر دیں تاکہ مملکت کی ناکہ بندی کی جا سکے۔ دونوں عرب راہنماؤں نے قطری حکومت پر الزام لگایا کہ وہ ایران، اخوان المسلمون اور حماس کی حمایت کرتی اور انھیں مالی امداد دیتی ہے۔ یہ تینوں فریق سعودی عرب سمیت اکثر عرب ممالک کی نگاہوں میں ''دہشت گرد'' شمار ہوتے ہیں۔ یہ سطور قلم بند ہونے تک قطر کا بحران جاری ہے۔ قطر پر پابندیاں لگا کر شہزادہ محمد نے نوجوان امیر قطر، شیخ تمیم بن حماد الثانی کو یہ پیغام بھی دیا کہ مشرق وسطیٰ میں سعودی عرب لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس کے احکامات پر نہ چلنے والوں کو سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ولی عہد بن گئے:

۲۱ جون کو دنیا بھر نے یہ خبر تعجب و حیرت سے سنی کہ شاہ سلمان نے شہزادہ محمد کو ولی عہد مقرر کر دیا ہے۔ سعودی ماہرین سیاسیات کا دعویٰ ہے کہ سابق ولی عہد اور ڈپٹی ولی عہد کے مابین پس پردہ اختیارات کی جنگ چل رہی تھی۔ محمد بن نائف بھی سعودی شاہی خاندان میں خاصا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ مگر زیرک و ہوشیار محمد بن سلمان نے آخر اپنے کزن کو شکست دے دی اور سعودی عرب کے دوسرے سب سے طاقتور راہنما بن گئے۔

سعودی ماہرین کا کہنا ہے کہ اب بھی شاہی خاندان میں کئی شہزادے ولی عہد محمد بن سلمان کے خلاف ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اکیاسی سالہ شاہ سلمان اکثر بیمار رہتے ہیں۔ کئی بیماریوں نے ان کے بدن کو گھیر رکھا ہے لہٰذا وہ کسی بھی وقت اقتدار بیٹے کو سپرد کر سکتے ہیں۔ گویا شہزادہ محمد نوجوانی ہی میں تخت نشین ہو جائیں گے۔ اگر انھوں نے اسی سال کی طبعی عمر پائی، تو وہ کم از کم اگلے پچاس برس تک سعودی عرب میں سیاہ و

سفید کے مالک رہیں گے۔ اس بنا پر مرحوم ابن عبدالعزیز کے کئی بیٹے اور پوتے بادشاہ بننے کی تمنا لیے دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔

۲۰ جولائی کو امریکی اخبار، نیویارک ٹائمز میں یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ شاہ سلمان نے زبردستی شہزادہ محمد بن نائف کو مستعفی کیا ہے۔ رپورٹ کی رو سے شہزادہ کی طبیعت خراب تھی اور وہ تندرستی حاصل پانے کی خاطر منشیات استعمال کرنے لگے تھے۔ مگر نشے میں رہنے کے باعث ان کی قوت فیصلہ متاثر ہو رہی تھی۔ اسی باعث شاہ سلمان نے انھیں مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ (امریکی ماہرین سیاسیات کا دعویٰ ہے کہ شاہ سلمان اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے)۔ چنانچہ انھوں نے نشہ آور ادویہ کا بہانہ بنا کر شہزادہ محمد بن نائف کو برطرف کر دیا مگر امریکی میڈیا اکثر سعودی عرب سمیت سبھی اسلامی ممالک کے خلاف پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے لہٰذا نیویارک ٹائمز کا مضمون بھی سعودی شاہی خاندان کے خلاف سازش ہو سکتی ہے۔ مدعا یہ ہو سکتا ہے کہ سعودی عوام میں شاہی خاندان کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارے جا سکیں۔

یہ درست ہے کہ سعودی عوام خصوصاً نوجوان نسل شہزادہ محمد کو پسند کرتی ہے۔ تاہم بعض واقعات عیاں کرتے ہیں کہ شہزادہ محمد سے بھی بندہ بشر ہونے کے ناتے چوک ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب سعودی عرب معاشی بحران میں گرفتار تھا اور حکومت عوام کو دی گئی مراعات ختم کر رہی تھی، تو شہزادہ محمد نے ایک بیش قیمت کشتی خرید لی۔

اس وقت شہزادہ محمد جنوبی فرانس میں چھٹیاں منا رہے تھے۔ تبھی انھیں روس میں ایک ووڈکا کمپنی کے مالک، یوری شیفلر کی لگژری کشتی دکھائی دی۔ کشتی انھیں اتنی زیادہ بھائی کہ اسے خریدنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ شہزادہ محمد نے ''۵۰ کروڑ یورو'' دے کر وہ کشتی خرید لی۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم تقریباً ساٹھ ارب روپے بنتی ہے۔ کشتی خریدنے پر سعودی اور غیر سعودی لوگوں نے سوشل میڈیا پر شہزادہ محمد کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے واضح کیا کہ ایک طرف سعودی عوام کی معاشی مشکلات بڑھ رہی ہیں۔ بیروزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری جانب عوام کے دوست اور جدت پسند سمجھے جانے والے شہزادہ محمد پرتعیش کشتیاں خریدنے میں محو ہیں۔

ستمبر ۲۰۱۵ء میں منیٰ کے مقام پر دوران حج بھگدڑ مچنے سے تقریباً دو ہزار حاجی شہید ہو گئے تھے۔ تبھی یہ افواہ پھیل گئی کہ شہزادہ محمد کی آمد کے موقع پر تین سڑکیں بند کر دی گئی تھیں۔ اسی لیے بقیہ راستوں میں ہجوم ہونے کے باعث بھگدڑ نے جنم لیا۔ تاہم سعودی حکومت کا کہنا ہے کہ شہزادہ محمد کے لیے کوئی سڑک بند نہیں کی گئی تھی۔ یہ محض دشمنوں (ایرانیوں) کی اڑائی ہوئی افواہ ہے۔

طرز زندگی اور نظریات

یہ یقینی ہے کہ سعودی عوام کا دل جیتنے کے لیے شہزادہ محمد کو سادہ طرز زندگی اپنانا ہو گا۔ اور یہ سچ ہے کہ صبح سے رات گئے تک بیسیوں کاموں میں مصروف رہنے کی وجہ سے انھیں آسائشات زندگی سے لطف اندوز ہونے کا کم ہی موقع ملتا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں شہزادے نے اپنی کزن، شہزادی سارہ بنت



شہزادہ محمد اپنے والد اور سابق ولی عہد کے ہمراہ

مشہور بن عبدالعزیز سے شادی کر لی تھی۔ ان کے چار بچے ہیں: دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ وہ صبح کے وقت ہی اپنے بچوں سے ملتے ملاتے ہیں۔ ورنہ رات گئے دفتر سے واپسی ہو، تو وہ محوخواب ہوتے ہیں۔

کئی شہزادوں کے برعکس شہزادہ محمد صرف ایک شادی ہی پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ماضی میں لوگوں کے پاس فارغ وقت بہت ہوتا تھا لہٰذا وہ زیادہ شادیاں کر کے بچے پال سکتے تھے۔ اب زندگی بہت تیز رفتار ہے۔ آج ایک خاندان کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونا بھی کٹھن مرحلہ بن چکا۔ وہ اپنی بیگم سے محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے بچے پالنے کی ذمے داری کُلی طور پر شہزادی سارہ کے سپرد کر رکھی ہے۔

سعودی عرب دنیا میں تیل پیدا کرنے والے بڑے ممالک میں شامل ہے۔ اسی لیے مستقبل میں شاہ سعودیہ، شہزادہ محمد پر سبھی کی نظریں جمی ہوئی ہیں۔ شہزادہ محمد پچھلے ایک برس میں تینوں سپر پاورز امریکا، چین اور روس کا دورہ کر چکے۔ انھوں نے اپنی ذہانت و فطانت سے بھی عالمی لیڈروں کو متاثر کیا ہے لیکن اندرون و بیرون ملک جیسے ان کے بے شمار دوست ہیں، اسی طرح دشمنوں کی بھی کمی نہیں۔

شاہ سعودیہ بن کر محمد بن سلمان کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی سطح پر کئی چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سعودی عرب میں حکمران ابن سعود خاندان اور علمائے کرام کے مابین شروع سے ایک معاہدہ چلا آ رہا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے سعودی حکمران مذہبی معاملات میں عمل دخل نہیں رکھتے لیکن شہزادہ محمد اب معاشرے میں کچھ مذہبی آزادی چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں طاقتور قدامت پسند علما سے ان کا ٹکراؤ ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر شہزادہ محمد خواتین کو زیادہ آزادی دینے کے خواہش مند ہیں۔ ان کی تمنا ہے کہ سعودی خواتین کو ڈرائیونگ کرنے کی اجازت مل جائے۔ وہ کہتے ہیں: ''نبی کریم ﷺ کے زمانے میں خواتین کو اونٹ چلانے کی اجازت تھی لہٰذا دورِ حاضر کی خواتین کو بھی آج کے اونٹ (گاڑیاں) چلانے کی اجازت ملنی چاہیے۔'' شہزادہ محمد کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ وہ علمائے کرام سے ٹکراؤ نہیں چاہتے، اس لیے معاشرے کو آزادیاں دینے کے سلسلے میں موزوں وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ امر یقینی ہے کہ سعودی معاشرہ زبردست تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ وسط جون میں وٹس اپ پر ایک ویڈیو وائرل ہو گئی جس میں ایک سعودی شہزادے، سعود بن عبدالعزیز کو شہریوں پر تشدد کرتا دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہو گئی۔ سعودی عوام کے علاوہ دیگر عرب ممالک کے لوگ بھی شہزادے کے ساتھ ساتھ شاہی خاندان کو بھی تنقید کا نشانہ بنانے لگے۔

تبھی شہزادہ محمد کے مشورے سے شاہ سلمان نے کڑا قدم اٹھایا اور شہزادہ سعود کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ شاہ سلمان نے اسی موقع پر یہ بیان بھی دیا کہ سعودی عرب میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں اور نہ کوئی اپنے خاندانی اثرورسوخ کی بنیاد پر وہ غلط کام کر سکتا ہے۔ شاہ سلمان کے بروقت اقدام سے سعودی عرب میں قانون کا بول بالا ہوا اور ریاست کی رٹ بحال ہو گئی۔ عوام الناس کو بھی احساس ہوا کہ ان کو انصاف ملنا یقینی امر ہے۔

شہزادہ محمد ایک پرجوش اور متحرک نوجوان ہیں۔ وہ اپنی مملکت کو خوشحال، ترقی یافتہ اور طاقتور بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی فعال شخصیت کے باعث سعودیہ ہی نہیں عالم اسلام میں نئی نسل کی آئیڈیل ہستی بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر خصوصاً بادشاہ بن کر انھیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے ہوں گے۔

ایسا نہ ہو کہ وہ مشرق وسطیٰ میں امریکی سپر پاور کے طفیلی بن جائیں۔ ویسے بھی پچھلی نصف صدی سے یہ علاقہ عالم اسلام میں ایک انوکھا خطہ بن چکا۔

خطرات کی دھمک:

یہ مشرق وسطیٰ ہی ہے جہاں دور جدید میں پہلے سعودی عرب اور پھر مصر میں سب سے پہلے مسلمان ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے۔ سعودیہ اور مصر میں بھی حکومت وقت سے نبرد آزما مسلمانوں کو یقین تھا کہ یوں وہ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ بہرحال دکھ کی بات ہے کہ مشرق وسطیٰ میں آج بھی ماضی کی استعماری طاقتیں... برطانیہ، روس اور امریکا عرب حکمرانوں پر اچھا خاصا اثرورسوخ رکھتی ہیں۔

عام طور پر ان استعماری طاقتوں کے احکامات پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے بہت سے لوگ اپنے حکمرانوں اور شاہوں کو مغربی طاقتوں کا غلام کہتے ہیں۔

عالم اسلام کے بعض دانشوروں کا دعویٰ ہے کہ امریکا، اسرائیل اور ان کے اتحادی طے شدہ منصوبے کے تحت اسلامی ممالک میں فرقہ وارانہ فساد کروا رہے ہیں۔ ان کا پروگرام یہ ہے کہ اسلامی ممالک کو چھوٹے چھوٹے جغرافیائی حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ عالم اسلام کمزور ہو سکے، چناںچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ عراق، لیبیا، شام اور یمن فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم ہو چکے۔ طے شدہ اسکرپٹ کی رو سے کسی اسلامی ملک میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکا دی گئی تو کہیں جنگجو تنظیمیں پیدا کر دی گئیں۔

ان دانش وروں کا کہنا ہے کہ اسلام دشمن طاقتیں اب ترکی، سعودی عرب، پاکستان، انڈونیشیا، ایران اور شمالی افریقا میں بھی یہی کھیل کھیلنا چاہتی ہیں۔ خاص طور پر امریکا اور اسرائیل مشرق وسطیٰ کو تنکوں کی طرح بکھیر دینا چاہتے ہیں لہٰذا وہ ایسی چالیں چل رہے ہیں کہ کسی عرب ملک میں خانہ جنگی ہو جائے، تو کہیں دو ممالک آپس میں بھڑ جائیں اور بقیہ ملکوں کو جنگجو تنظیموں کے ذریعے تباہ و برباد کر دیا جائے۔

اگر امریکا، اسرائیل اور ان کے اتحادی اپنے پلان میں کامیاب ہو گئے، تو مستقبل میں عالم اسلام کا بیشتر رقبہ چھوٹی بڑی شہری ریاستوں میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ پھر کسی صورت ایٹمی طاقت، اسرائیل کے لیے خطرہ نہیں رہیں گی۔

قطر اور عرب ممالک کے مابین ٹکراؤ اسی امریکی و اسرائیلی پالیسی کا نتیجہ ہے۔

کچھ عرصہ قبل داعش نے ایران کی پارلیمنٹ اور امام خمینی کے مزار پر حملے کیے تھے۔ یہ تنظیم اسرائیل اور ایران پر حملے کرنے سے اجتناب کرتی ہے۔ داعش نے اب ایران پر اسی لیے حملے کیے تاکہ مقامی آبادی کے جذبات بھڑکائے جا سکیں اور ایرانی پھر عربوں سے صف آرا ہو جائیں۔ داعش کے حملوں سے واضح ہو چکا کہ تنظیم کے اصل کرتا دھرتا امریکی و اسرائیلی ہیں۔ یاد رہے، امریکا نے فتح اللہ گولن کی تحریک کے ذریعے ترکی میں بھی اسلام پسند اور مغرب مخالف حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی۔

ان حالات میں بادشاہ بننے کے بعد شہزادہ محمد کو نہایت تدبر اور احتیاط سے حکومت کرنا ہو گی، اگر وہ نادانستگی میں امریکی و اسرائیلی حکومتوں کے اشاروں پر ناچنے لگے، تو فرقہ وارانہ فساد کے باعث عالم اسلام کو خوفناک نقصان پہنچ سکتا ہے۔ امریکا اور اسرائیل کی پوری کوشش ہے کہ عالم اسلام سنی اور شیعہ ممالک کے مابین تقسیم ہو جائے اور یہ ممالک آپس میں برسرپیکار ہو جائیں۔ اپنا مقصد پانے کی خاطر اسلام دشمن طاقتیں اسلامی ممالک میں دہشت گردی بھی کروا سکتی ہیں۔ مثلاً سعودی عرب اور ایران میں مختلف مقدس و مذہبی مقامات پر حملے کروانا تاکہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے بھڑ جائیں۔

اس انتہائی نازک صورت حال میں صرف سعودی عرب ہی نہیں تمام اسلامی ممالک کی حکومتوں کو محتاط فکر و عمل اپنانے کی اشد ضرورت ہے۔ امریکا یا دیگر مغربی ممالک کی مدد سے مملکت کو ترقی و خوشحال بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر شہزادہ محمد کو ان ممالک کی کٹھ پتلی بننے سے گریز کرنا ہو گا۔ یہ بات بھی اسلامی ممالک کے حکمرانوں پر بھی صادق آتی ہے۔ صرف اسی صورت میں عالم اسلام میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

شُکر ادا کرتے رہو

طالب ہاشمی



رسولِ پاک ﷺ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شُکر ادا کرتے اور لوگوں کو بھی نصیحت فرمایا کرتے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہو۔ آپ ﷺ کو لڑائی میں فتح ہوتی یا کوئی اور خوشی نصیب ہوتی تو آپ ﷺ فوراً سجدہ میں گر جاتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے۔

آپ ﷺ سب لوگوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ ساری ساری رات کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کا ذِکر اور شُکر کرتے رہتے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پاؤں سُوج جاتے تھے۔

ایک دفعہ صحابہؓ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا ہے پھر آپ کو اتنی عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے''۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں ''عبدِ شکور'' یعنی اللہ تعالیٰ کا بہت شُکر کرنے والا بندہ نہ بنوں؟''

دھوکا دینے والا ہم میں سے نہیں:

ایک دن رسولِ پاک ﷺ مدینہ مُنوّرہ کے بازار میں تشریف لے گئے۔ وہاں آپ ﷺ کا گزر غلّہ بیچنے والے ایک شخص کی دکان پر ہوا۔ اس نے ایک بوری میں غلّہ بھر کر بیچنے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے غلّے کی بوری میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو اوپر کا غلّہ تو خشک تھا لیکن نیچے کا غلّہ گیلا تھا۔

آپ ﷺ نے دکاندار سے پوچھا:

''یہ کیا بات ہے کہ اوپر کا غلّہ خشک ہے اور نیچے کا گیلا''۔

اس نے کہا: ''یارسول اللہ ﷺ! اس پر کچھ بارش ہوگئی تھی''۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس بھیگے ہوئے غلّے کو تُو نے اوپر کیوں نہیں رکھا تا کہ لوگ اسے دیکھ لیتے۔ جو شخص کسی کو دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

نورانی مُکھڑے والا خریدار:

رسول پاک ﷺ کے ایک پیارے ساتھی حضرت طارق

بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں (اسلام قبول کرنے سے پہلے) اپنے قبیلے (بنومُحارِب) کے چند لوگوں کے ساتھ ربذہ سے مدینے کی طرف روانہ ہوا۔ ہم وہاں سے کھجوریں خرید کر لانا چاہتے تھے۔ جب ہم مدینہ کی آبادی کے قریب پہنچے تو ہمارے قافلے نے شہر کے باہر پڑاؤ ڈال دیا تاکہ سفر کے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے بدل لیں۔ اتنے میں شہر سے ایک صاحب آئے جنہوں نے دو پرانی چادروں کا لباس پہن رکھا تھا انہوں نے سلام کے بعد ہم سے پوچھا:

''آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

ہم نے کہا: ''ہم ربذہ سے یہاں (مدینہ) تک آئے ہیں تاکہ کچھ کھجوریں خرید سکیں''۔

ہمارے پاس ایک سُرخ اونٹ تھا۔ ان صاحب نے پوچھا: ''یہ اونٹ بیچتے ہو؟''

ہم نے کہا: ہاں، اس قدر کھجوروں کے بدلے میں دے دیں گے۔ ان صاحب نے ہم سے کوئی مول تول نہیں کیا اور کہا: ''آپ جو قیمت بتا رہے ہیں، مجھے منظور ہے۔''

پھر انہوں نے اونٹ کی مہار پکڑی اور شہر کو چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم نے کہا کہ ہم تو اس شخص کو جانتے تک نہیں اور وہ ہمارا قیمتی اونٹ قیمت دیے بغیر لے گیا۔ کیا معلوم اب اونٹ کی قیمت وصول ہوتی ہے یا نہیں۔ قافلے میں ہمارے قبیلے کے سردار کی پردہ نشین بیوی بھی شامل تھی (وہ ایک دانا عورت تھی) اس نے پردے کے پیچھے سے ہمیں اس قدر پریشان دیکھا تو بولی:

''تم لوگ پریشان کیوں ہوتے ہو۔ میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا تھا۔ ایسے نورانی مکھڑے والا خریدار کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ اگر وہ قیمت نہ دے گا تو میں دے دوں گی''۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ شہر سے ایک شخص آیا اور کہا:

''مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے اور تمہارے سرخ اونٹ کی قیمت کی کھجوریں بھیجی ہیں اور تمہاری دعوت کے لیے الگ کھجوریں ہیں۔ کھاؤ پیو اور قیمت کی کھجوروں کو ناپ کر پورا کرلو''۔

جب ہم کھا پی کر سیر ہوگئے تو شہر میں داخل ہوئے۔ دیکھا تو وہی صاحب نورانی مُکھڑے والے مسجد کے منبر پر کھڑے وعظ کررہے ہیں۔ ہم نے یہ الفاظ سُنے:

''لوگو! خیرات دیا کرو۔ خیرات دینے میں تمہاری بہتری ہے۔ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ ماں کو، باپ کو، بہن کو، بھائی کو، پھر قریبی کو اور دوسرے قریبی کو دو''۔

اب ہم سمجھے کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ پس ہم سب نے آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کرلیا۔

اللہ نرمی کو پسند کرتا ہے

ایک دفعہ چند شریر یہودی رسولِ پاک ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے آپ کو یوں بگاڑ کر سلام کیا:

السَّامُ عَلَیکُم ___ اس کا مطلب ہے تمہیں موت نصیب ہو جب کہ اَلسَّلامُ عَلَیکُم کا مطلب ہوتا ہے تم پر سلامتی ہو۔

اُمّت کی ماں حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپؐ کے قریب موجود تھیں۔ ان کو یہودیوں کی بات سن کر سخت غُصّہ آیا اور انہوں نے اُن کے جواب میں یہ الفاظ کہے:

''وَعَلَیکُم السَّامُ وَاللَّعنَۃ''۔

اور تمہیں بھی موت آئے اور تم پر لعنت ہو۔

جب وہ چلے گئے تو رسولِ پاک ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا: ''عائشہ! تم نے کیوں ایسا جواب دیا، اللہ تو نرمی کو پسند کرتا ہے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! آپ ﷺ نے یہودیوں کے الفاظ نہیں سنے تھے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ''سن لیے تھے لیکن میں نے نرمی سے وَعَلَیکُم (اور تم پر بھی) کہہ دیا تھا اور اس قدر جواب کافی

تھا۔

رسول پاک ﷺ خوش ہو گئے

ایک دفعہ عربوں کا ایک پورا قبیلہ رسولِ پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ لوگ اس قدر غریب تھے کہ کسی کے جسم پر ڈھنگ کا کپڑا نہ تھا۔ سب پھٹے پرانے کمبل اوڑھے اور چیتھڑے لٹکائے ہوئے تھے۔ کسی کے پاؤں میں جوتا نہ تھا اور انہوں نے اپنی تلواریں گلے میں لٹکا رکھی تھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر آپ ﷺ کا دل بھر آیا اور آپ ﷺ اٹھ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے پھر باہر نکل کر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ انہوں نے اذان دی۔ پھر آپؐ نے نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے خطبہ دیا۔ خطبے کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ ان غریب دیہاتیوں کی مدد کے لیے جو توفیق ہو، لاؤ، دینار ہو، درہم ہو، گندم ہو، کھجور ہو اگر کسی کے پاس صرف آدھی کھجور ہو تو وہی لے آئے۔

آپ ﷺ کا ارشاد سُن کر مدینہ منوّرہ کے رہنے والے ایک صحابی اٹھے اور درہموں سے بھرا ہوا ایک بڑا تھیلا اٹھا کر لے آئے۔ اس کے بعد دوسرے لوگ بھی اپنی طاقت کے مطابق دھڑا دھڑ چیزیں لانے لگے یہاں تک کہ دو بڑے ڈھیر لگ گئے۔ ایک غلّے کا دوسرا کپڑوں کا۔ ان کو دیکھ کر رسول پاک ﷺ کا چہرۂ مبارک خوشی سے چمک اٹھا۔

آپ ﷺ نے ان غریب دیہاتیوں میں یہ چیزیں تقسیم فرمائیں تو وہ بھی خوش ہو گئے اور دُعائیں دینے لگے۔ پھر رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص کوئی اچھا طریقہ ایجاد کرے تو جو لوگ اس کو دیکھ کر اس نیک طریقے کو اختیار کریں گے۔ ان سب کی نیکیوں کے برابر ثواب اس اچھے طریقے کے جاری کرنے والے کو بھی ملے گا اور جو شخص کوئی بُری رسم جاری کرے گا تو جو اس کی دیکھا دیکھی اس بُرے طریقے کو اختیار کرے تو سب کی بدیوں کے برابر بدیاں اس بُرے طریقے کے جاری کرنے والے کے حساب میں بھی لکھی جائیں گی۔''

اونٹ کا بچہ

ایک دفعہ رسولِ پاک ﷺ کی کھلائی حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:۔

''اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے اور میرے گھر والوں کو کہیں آنے جانے اور سامان لانے لے جانے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ سواری کا کوئی جانور ہمارے پاس نہیں ہے۔ آپ مجھے ایک اونٹ عطا فرمائیں۔''

حضرت اُمِ ایمنؓ بوڑھی خاتون تھیں۔ انہوں نے آپ ﷺ کے والد اور والدہ کی خدمت بھی کی تھی اور آپ ﷺ کو بھی بچپن میں کھلایا تھا۔ اس لیے آپ ﷺ ان کی بہت عزّت کرتے تھے اور ان کو امّی کہہ کر بُلایا کرتے تھے۔ ان کی درخواست سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''امّی! میں تو آپ کو اونٹ کا ایک بچہ دوں گا۔''

وہ بولیں: ''اونٹ کے بچے کو میں کیا کروں گی وہ تو ہمارا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تو آپ کو اونٹ کا بچہ ہی دوں گا۔''

یہ سن کر حضرت اُمِ ایمنؓ اداس ہو گئیں۔ اُدھر آپ ﷺ نے ایک خادم کو اشارہ فرمایا۔ وہ ایک جوان اونٹ لے آئے اور اس کی مُہار حضرت اُمِ ایمنؓ کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ آپ ﷺ نے مسکرا کر فرمایا:

''کیا یہ اونٹ کا بچہ نہیں؟ ہر اونٹ، اونٹ ہی کا تو بچہ ہوتا ہے۔'' اب حضرت اُمِ ایمنؓ ساری بات سمجھ گئیں اور خوش ہو کر آپ ﷺ کو دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔

آنکھ میں سفیدی

ایک دفعہ ایک صحابیہ نے رسولِ پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی، یا رسول اللہ! میرا شوہر بیمار ہے اس کی صحت کے لیے دعا فرمائیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا، ''تمہارا شوہر وہی ہے نا جس کی آنکھ میں سفیدی ہے۔'' وہ حیران ہو گئیں اور گھر جا کر اپنے خاوند کی آنکھیں غور سے دیکھنے لگیں۔ انہوں نے کہا، کیا بات ہے؟ کہنے لگیں، ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمہارے شوہر کی آنکھ میں سفیدی ہے۔'' وہ ہنس پڑے اور کہا ''کیا کوئی ایسا آدمی بھی ہے، جس کی آنکھ میں سفیدی نہ ہو؟'' اب وہ رسولِ پاک ﷺ کے پاکیزہ مذاق کو سمجھیں۔ اس کا مقصد ان کے شوہر کو خوش کرنا تھا۔

پیار بھری نصیحت

رسولِ پاک ﷺ کے ایک صحابی اپنے بچپن میں لوگوں کے باغوں میں چلے جاتے اور کھجور کے پیڑوں پر ڈھیلے مار مار کر کھجوریں گرایا کرتے۔ ایک دن لوگ ان کو پکڑ کر رسولِ پاک ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور ان کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے انہیں بڑے پیار سے پاس بٹھایا۔ ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا:

''بیٹا ڈھیلے مار مار کر کھجوریں گرانا اچھی بات نہیں، اس سے نقصان ہوتا ہے۔'' پھر انہیں باہر بھیج دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ان کی شکایت آئی کہ یہ بچہ پیڑوں پر ڈھیلے مارنے سے باز نہیں آیا۔

اس بار بھی آپ ﷺ نے انہیں جھڑکا نہیں اور بڑے پیار سے پوچھا: ''بیٹا تم درختوں پر ڈھیلے کیوں مارتے ہو؟''

انہوں نے کہا: ''کھجوریں کھانے کے لیے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کھجوریں جو خود بخود زمین پر گرتی ہیں، انہیں اٹھا کر کھا لیا کرو۔ ڈھیلے نہ مارا کرو۔'' یہ فرما کر پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔ آپ ﷺ کی شفقت کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کی۔

جب موقع ملے فوراً نیکی کرو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انسان کو جب کسی نیک کام کرنے کا موقع ملے تو اُسے یہ نیک کام فوراً کرنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے پھر یہ موقع نہ ملے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت غریب ہو جائے اور غریبی اس کو نیک کاموں کی توفیق نہ دے۔ یا ایسا دولت مند ہو جائے کہ دولت مندی کے گھمنڈ میں نیک کام نہ کرے۔ یا ایسا بیمار ہو جائے کہ نیک کام کر ہی نہ سکے۔ یا ایسا بوڑھا ہو جائے کہ نیک کام کرنے کا ہوش ہی نہ رہے۔ یا موت آ جائے جس سے کوئی کام کرنے کی طاقت ہی ختم ہو جائے۔ یا وہ کسی آزمائش میں مبتلا ہو جائے اور سیدھا راستہ چھوڑ دے۔ یا اس کو کوئی حادثہ پیش آ جائے جو اس کو نیک کاموں سے روک دے۔ اس لیے اے لوگو! جب موقع ملے فوراً نیکی کرو۔

خیرات صرف مال کی نہیں ہوتی

رسولِ پاک ﷺ کے ایک پیارے ساتھی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپؐ نے فرمایا: ''ہر مسلمان کا فرض ہے کہ خیرات اور صدقہ دے۔''

میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! اگر کسی کے پاس صدقہ و خیرات کے لیے روپیا پیسا نہ ہو تو وہ کیا کرے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ محنت مزدوری کرے پھر جو کمائے اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے اور غریبوں کو خیرات دے۔'' میں نے کہا: ''اگر مزدوری نہ ملے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کسی حاجت مند کی روپے پیسے (مال) سے مدد نہیں کر سکتا تو اس کے کام میں ہاتھ ہی بٹا دے۔'' میں نے عرض کیا: ''اگر یہ بھی نہ کر سکے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''منہ سے نیک نصیحت ہی کرے۔''

میں نے کہا: ''اگر یہ بھی نہ کر سکے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کسی قسم کا فائدہ دوسروں کو نہیں پہنچا سکتا تو کم سے کم یہ کرے کہ کسی کو اس سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ یہ بھی اس کی طرف سے خیرات و صدقہ سمجھا جائے گا۔''



یہ امر قابل ذکر ہے کہ سیدہ زینبؓ کے حرم نبویؐ میں داخل ہونے سے پہلے چار ازواج مطہرات سیدہ سودہؓ، سیدہ عائشہؓ، سیدہ حفصہؓ اور سیدہ ام سلمہؓ اس حرم مقدس میں رونق افروز تھیں۔

مخالفین کے اعتراضات:

۳۔ ان مخالفین نے بظاہر اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی و ہمدردی کا روپ دھار کر کہنا شروع کیا کہ ہم جانتے ہیں کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہوتا اور اس کی بیوی بھی حقیقی بہو کی طرح نہیں ہوتی جیسا کہ قرآن مجید نے وضاحت کر دی ہے لیکن مصلحت وقت کا تقاضا تھا کہ حضورﷺ یہ نکاح نہ کرتے۔ گو قانونی طور پر یہ جائز فعل ہے لیکن قدیم رسموں اور رواجوں کی بنا پر معاشرے کے اکثر افراد کے ذہنوں اور دلوں میں ان رشتوں کے متعلق حرمت و کراہت کے جو تصورات و توہمات راسخ ہو چکے ہیں، حضورﷺ کی اس شادی سے انھیں زبردست ٹھیس پہنچی جس سے اسلام کی اس نئی تحریک کے متعلق لوگوں کی سوچ اور ان کا طرز عمل مخالفانہ اور معاندانہ رخ اختیار کر چکا ہے جس سے دین حق کی تبلیغ و اشاعت کی جدوجہد میں سخت رکاوٹیں پیش آئیں گی۔

اعتراضات کے جوابات

حضورﷺ نے سیدہ زینبؓ سے یہ نکاح اپنی پسند اور اپنی مرضی سے نہیں کیا تھا بلکہ یہ نکاح خدائے عزوجل نے اپنی مثبت، وسیع اور ہمہ گیر سکیم کے تحت کیا تھا۔ اسی لیے اس پر وارد

ہونے والے تمام اعتراضات کے مدلل اور مسکت جوابات دینے کا کام بھی اس نے اپنے ذمے لے لیا اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ اس سلسلے میں جو پیرایہ اختیار کیا گیا وہ اپنی جامعیت و مانعیت، اپنے ایجاز و اختصار اور اپنی فصاحت و بلاغت میں اعجاز کی تمام بلندیوں سے بھی ماورا ہے اور یہی اس کے کلام الٰہی ہونے کا بین ثبوت ہے۔ شاہانہ جلال کے ساتھ اعلان کیا گیا:

''لوگو! محمدﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ مگر وہ اللہ کے رسولﷺ اور خاتم النبیینﷺ ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ (سورہ احزاب آیت ۴۰)

اس آیت میں تین اعتراضات کے جواب میں تین ہی باتیں کہی گئی ہیں جن کا ہم ذیل میں اختصار سے ذکر کرتے ہیں:

پہلے اعتراض کا جواب

ہمارے رسول محمدﷺ پر یہ اعتراض کہ انھوں نے اپنی بہو سے شادی کر لی ہے کس قدر لغو، بے بنیاد اور خلاف حقیقت ہے۔ عرب کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ ان کا کوئی بیٹا روئے زمین پر موجود نہیں۔ جب ان کا کوئی بیٹا ہے ہی نہیں تو بہو سے شادی رچانے کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا اور تم میں سے ہر شخص کا دل اس بات کی گواہی دے گا کہ منہ بولا بیٹا کسی صورت بھی حقیقی بیٹا نہیں ہو سکتا۔

دوسرے اعتراض کا جواب

ہمارے یہ نبیﷺ یعنی محمد (ﷺ) اس روئے زمین پر ہمارے نمائندے اور رسولﷺ ہیں۔ وہ ہر اس کام کے بجا لانے کے پابند ہیں جس کا ہم انھیں حکم دیں۔ انھوں نے یہ شادی اپنی مرضی اور اپنی پسند سے نہیں کی بلکہ یہ ہماری منشا، ہماری مرضی اور ہمارے حکم سے عمل میں آئی ہے۔ ایک وقت میں چار نکاحوں سے زیادہ پر پابندی عائد کرنے والے بھی ہم ہیں اور اپنے رسول کو اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دینے والے بھی ہم ہی ہیں۔ ہم اس کائنات کے شہنشاہ مطلق ہیں۔ تمھارے لیے قانون سازی ہمارا حق ہے کسی کو اس میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں۔ ہم نے اپنے خصوصی اختیار سے اپنی حکیمانہ مصلحت کے تحت اپنے نبیﷺ کو چار سے زیادہ شادیاں کرنے کا اجازت نامہ پہلے ہی اپنے فرمان کے ذریعے جاری کر دیا ہے جو اس طرح ہے:

''اے پیارے نبیﷺ ہم نے تمھارے لیے حلال کر دیں تمھاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمھاری ملکیت میں آئیں اور تمھاری وہ چچازاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیﷺ کے لیے ہبہ کیا ہو اگر نبیﷺ اسے نکاح میں لینا چاہیں۔ یہ رعایت خالصتاً تمھارے لیے ہے دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں کیا حدود عائد کیے ہیں۔ تمھیں ان حدود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے تاکہ تمھارے اوپر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ غفور و رحیم ہے۔'' (سورہ احزاب آیت ۵۰)

تیسرے اعتراض کا جواب

محمد (ﷺ) ہمارے رسولؐ ہی نہیں بلکہ خاتم النبیین بھی ہیں، یعنی ان کے بعد کوئی رسول تو درکنار کوئی نبی تک آنے والا نہیں کہ اگر قانون اور معاشرے کی کوئی اصلاح ان کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جائے تو بعد کا آنے والا نبی یہ کسر پوری کر دے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس رسم جاہلیت کا خاتمہ وہ خود ہی کر کے جائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنے اس آخری نبیﷺ کے ذریعے اس رسم کا خاتمہ نہ کروایا تو پھر کوئی دوسری ہستی اس دنیا میں ایسی نہ ہوگی جس کے توڑنے سے یہ رسم دنیا کے تمام مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے۔

نکاح کے وقت سیدہؓ کی عمر

حضور ﷺ نے سیدہ زینبؓ سے ذی قعدہ ۵ھ میں نکاح کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ ﷺ یہودیوں کے قبیلہ بنی قریظہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کیونکہ اس نے معاہدے کے باوجود غزوہ احزاب کے موقع پر غداری کر کے عقب سے مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا منصوبہ تیار کیا تھا جو حضور ﷺ کی بروقت جاندار اور مدبرانہ حکمت عملی کی وجہ سے ناکام ہو گیا تھا۔

اس وقت سیدہ زینبؓ کی عمر ۳۶ سال تھی۔ رہائش کے لیے انھیں مسجد نبویؐ کے قریب جو مکان ملا وہ شام کی سمت واقع تھا۔

سیدہؓ کی للّٰہیت کی تصدیق

ام المومنین سیدہ زینبؓ نہایت دیندار، پرہیزگار اور حق گو خاتون تھیں۔ ان کے انھی اوصاف اور خوبیوں کا اعتراف خود نبی کریم ﷺ کو بھی تھا۔ حافظ ابن حجر نے اپنی مشہور معرکۃ الآرا کتاب ''اصابہ'' میں بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ مہاجرین میں مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔ سیدہ زینبؓ بھی اس موقع پر موجود تھیں۔ انھوں نے کوئی ایسی بات کہی جو حضرت عمر فاروقؓ کو ناگوار گزری۔ انھوں نے ذرا سخت لہجے میں سیدہ کو دخل دینے سے روکا۔ اس پر رحمت عالم ﷺ نے فرمایا:

''عمرؓ انھیں کچھ نہ کہو۔ یہ اواہ ہیں۔'' (یعنی کثرت سے عبادت کرنے والی اور اللہ سے ڈرنے والی ہیں۔)

اسی طرح ام المومنین سیدہ عائشہؓ ان کی خوبیوں اور کمالات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتی ہیں: ''میں نے دین کے معاملے میں زینبؓ سے بڑھ کر کوئی عورت نہیں دیکھی۔''

حق گوئی

ام المومنین سیدہ زینبؓ دوسری ازواج مطہرات کے مقابلے میں اپنے خصوصی اعزازات فخریہ بیان کیا کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ میں حضور ﷺ کی پھوپھی زاد ہوں۔ اوروں کا نکاح ان کے سرپرستوں اور ولیوں نے کیا مگر میرا نکاح میرے مولائے حقیقی نے اپنے محبوب ترین رسول ﷺ کے ساتھ کیا اور اس کا اعلان وحی کے ذریعے اپنی آخری کتاب میں کیا جس میں قیامت تک تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ ام المومنین سیدہ عائشہؓ جو حضور ﷺ کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی تھیں فرماتی ہیں کہ ازواج مطہرات میں میری ہمسری کا دعویٰ زینبؓ کو ہی تھا اور وہ اپنے اس دعوے میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھیں لیکن اس فطری جذبہ رشک و رقابت کے باوجود سیدہ زینبؓ نے حق گوئی اور صدق بیانی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

واقعہ افک میں جب بدنہاد منافقین نے ام المومنین سیدہ عائشہؓ کے خلاف نازیبا الزام تراشی کی اور پھر اسے اس کثرت سے پھیلایا کہ شاعر اسلام حسانؓ بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ جیسے مخلص مسلمان بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے اور سیدہ زینبؓ کی حقیقی بہن حضرت حمنہؓ بنت جحش بھی اس افواہ کے پھیلانے میں کسی حد تک ملوث ہو گئیں تو حضور ﷺ نے سیدہ عائشہؓ کے چال چلن اور کردار کے متعلق ام المومنین سیدہ زینبؓ سے ان کی رائے دریافت کی تو انھوں نے بے ساختہ جواب میں کہا:

''میں عائشہؓ میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں پاتی۔''

سیدہ زینبؓ اور آیت تحریم

قرآن مجید میں سورہ تحریم کی پہلی آیت میں دین اسلام کا ایک نہایت اہم اور بنیادی ضابطہ بیان کیا گیا ہے جس کی رو سے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور عام انسان تو درکنار خود اللہ کے رسول ﷺ کی طرف بھی ان کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ نبی ﷺ بحیثیت نبی ﷺ اگر کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتے ہیں تو صرف اس صورت میں

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو، قطع نظر اس کے کہ وہ اشارہ قرآن مجید میں نازل ہوا ہو یا وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو لیکن بطور خود اللہ کی جائز کی ہوئی کسی چیز کو حرام کرنے کا مجاز نبی ﷺ بھی نہیں ہے کجا کہ کوئی اور شخص ہو۔

اس اہم دینی ضابطے کے نزول کا سبب بھی ام المومنین سیدہ زینبؓ کی ذات بابرکت ہی بنی۔ جیسا کہ ام المومنین سیدہ عائشہؓ کی اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے جو بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور احادیث کی دیگر کتابوں میں موجود ہے۔ اس روایت میں سیدہؓ فرماتی ہیں:

''رسول اللہ ﷺ بالعموم ہر روز نماز عصر کے بعد تمام ازواج مطہرات کے ہاں چکر لگاتے تھے۔ ایک موقع پر ایسا ہوا کہ آپ ﷺ حضرت زینبؓ بن جحش کے ہاں جا کر زیادہ دیر تک بیٹھنے لگے۔ چونکہ ان کے ہاں کہیں سے شہد آیا ہوا تھا اور حضور ﷺ کو شیرینی بہت پسند تھی، اس لیے آپ ﷺ ان کے ہاں شہد کا شربت نوش فرماتے تھے۔ مجھے رشک لاحق ہوا اور میں نے سودہؓ، حفصہؓ اور صفیہؓ سے مل کر یہ طے کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی آپ ﷺ تشریف لائیں وہ آپ ﷺ سے یہ کہے کہ آپ ﷺ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے۔ میں نے یہ تدبیر آپ ﷺ کو زینبؓ کے ہاں زیادہ دیر ٹھہرنے سے روکنے کے لیے اختیار کی تھی۔ چنانچہ ان سب ازواج نے آپ ﷺ سے یہی کہا کہ آپ ﷺ کے منہ سے مغافیر کی بساند آرہی ہے شاید آپ ﷺ نے اسے کھایا ہے۔ جب متعدد بیویوں نے آپ ﷺ سے یہی بات کہی تو آپ ﷺ نے فرمایا ''میں نے زینبؓ کے ہاں شہد کا شربت پیا تھا۔ آئندہ نہیں پیوں گا۔'' اس طرح میری یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی لیکن ساتھ ہی یہ آیت بھی نازل ہو گئی:

''اے پیارے نبی، تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہے؟ کیا اس لیے کہ تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو؟ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔'' (سورہ تحریم آیت نمبر ا)

سیدہ عائشہؓ کی روایت کا مفہوم سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے ''مغافیر'' ایک پھول کا نام ہے۔ اس میں کچھ بساند ہوتی ہے۔ اگر شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرلے تو اس کے اندر اس کا اثر آجاتا ہے اور یہ حقیقت بھی سب کو معلوم تھی کہ رسول اللہ ﷺ نہایت نفاست پسند تھے اور آپ ﷺ کو اس سے سخت نفرت تھی کہ آپ ﷺ کے منہ میں کسی قسم کی بدبو پائی جائے۔ اس لیے ام المومنین سیدہ عائشہؓ کی یہ تدبیر ٹھوس حقائق پر مبنی تھی۔

سیدہ صدیقہؓ کی یہ روایت ان کی بے مثال دیانت و امانت اور ان کے بے بدل راست گوئی اور صدق بیانی کا عظیم شاہکار ہے۔ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے متعلق روحانی اولاد تک معلومات بہم پہنچانے کے سلسلے میں اپنے فطری اور بشری تقاضوں کو صاف صاف بیان کر دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جس میں بظاہر ان کی ذاتی سبکی کا پہلو نکلتا تھا۔ ان کے اسی بے پناہ ایثار و اخلاص نے انھیں ''صدیقہ'' کے جلیل القدر منصب پر فائز کیا اور وہ امت مسلمہ کے اعتماد کا مرکز و محور قرار پائیں۔

آفتاب نبوت سے فیض یابی

ام المومنین سیدہ زینبؓ تقریباً پانچ سال کاشانہ نبوت میں براہ راست آفتاب نبوت کی تجلیات اور اس کے انوار سے فیض یاب ہوتی رہیں۔ اس فیض یابی نے ان کی فکر و نظر اور ان کے قلب و ذہن میں نورانیت کی ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ ان کی سیرت و کردار اخلاقی اور روحانی کمالات کا ایک قابل رشک مرقع بن گیا۔ سیدہ نے دین کے احکام کی تعلیم حاصل کرنے اور اپنی زندگی کو اسوہ رسول ﷺ کے نورانی سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر دیں۔

سیدہ زینبؓ نے ۱۰ھ میں دوسری تمام ازواج مطہرات کے ساتھ اللہ کے آخری رسول ﷺ کی قیادت میں فریضہ حج

کی ادائیگی کی بے کراں سعادت حاصل کی۔

ربیع الاول ۱۱ھ میں وہ حادثہ جانکاہ واقع ہوا جس نے تمام اہل ایمان کو سوگوار بنا دیا۔ یہ حادثہ رسول اللہ ﷺ کا اس دنیائے فانی سے پردہ فرما لینے کا تھا۔ یہ سانحہ ارتحال ام المومنین سیدہ زینبؓ کے لیے بھی روح فرسا ثابت ہوا۔ مگر انھوں نے ایمان کی عطا کردہ نورانی صفت صبر کے ذریعے اسے برداشت کیا۔

نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد دیگر امہات المومنین کی طرح سیدہ زینبؓ نے اپنی باقی زندگی امت مسلمہ کی عموماً اور اپنی روحانی بیٹیوں کی خصوصاً تعلیم و تربیت اور ان کے اخلاق و اطوار کو انوار ہدایت سے منور کرنے کی سعی بلیغ میں کھپا دی۔

سیدہ زینبؓ کی سیرت کا اہم پہلو

ام المومنین سیدہ زینبؓ کا چمنستان اخلاق خوف خدا، حب رسول، شوق عبادت، ذوق شب بیداری، صدق وصفا اور خشوع وخضوع کے گلہائے خوش رنگ سے مزین ومعطر تھا لیکن جس وصف اور جس خوبی کو ان کی سیرت کا جوہر قرار دیا جا سکتا ہے وہ ان کی فراخدلانہ سخاوت وفیاضی تھی۔ اسی وصف نے ان کے مزاج اور طبیعت میں قناعت کا ملکہ راسخ کر دیا تھا۔

سیدہ چمڑے کی ماہر دستکار تھیں۔ اپنی محنت سے جو کماتیں اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے بے پناہ روحانی مسرت حاصل کرتیں۔

علامہ ابن سعد نے ''طبقات'' میں عبداللہ رافعؓ اور محمد بن کعبؒ کی روایات نقل کی ہیں جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کے لیے بارہ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ جب وظیفے کی یہ رقم سیدہ زینبؓ کے پاس پہنچی تو بولیں کہ اس رقم کی میری بہنیں (یعنی ازواج مطہرات) زیادہ مستحق ہیں۔ بتایا گیا کہ ان کا حصہ ان تک پہنچ چکا ہے یہ تو صرف آپ کے لیے ہیں۔ اس پر سیدہؓ نے خادمہ کو حکم دیا کہ درہموں کے اس ڈھیر پر کپڑا ڈال دو اور تقسیم کرنا شروع کر دو۔ چنانچہ یہ سارے درہم غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کر دیے گئے۔ اس کے بعد نہایت خشوع وخضوع سے بارگاہ الٰہی میں دعا کی ''الٰہ العالمین! اگلے سال مجھے یہ مال نہ ملے کیونکہ یہ فتنہ ہے۔'' حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو بولے ''ام المومنین نہایت فیاض اور مخیر ہیں۔ اس لیے وہ اس امر کی مستحق ہیں کہ ان کی خدمت میں ان کے اخراجات کے لیے مزید رقم بھیجی جائے۔'' چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کے دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کہلوایا اور فرمایا ''مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ آپؓ نے وظیفے کی تمام رقم تقسیم کر دی ہے۔'' اس کے بعد مزید ایک ہزار درہم بھیجے لیکن سیدہؓ نے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو پہلی رقم کے ساتھ کیا تھا، یعنی سب بانٹ دیے۔

سیدہؓ کی اسی دریا دلی اور سخاوت کی بنا پر ان کی وفات کے موقع پر ام المومنین سیدہ عائشہؓ نے حسرت بھرے لہجے میں فرمایا تھا:

''ایک بے مثال اور قابل تعریف خاتون دنیا سے اٹھ گئی، وہ یتیموں اور بیواؤں کی پناہ گاہ تھی۔''

سیدہ کے بھتیجے عثمان بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ میری پھوپھی ام المومنین سیدہ زینبؓ نے اپنے پیچھے کوئی درہم چھوڑا نہ دینار۔ ان کے پاس جو کچھ آتا تھا اللہ کی راہ میں ضرورت مندوں پر خرچ کر دیتی تھیں۔ انھوں نے صرف ایک مکان چھوڑا تھا جسے وارثوں نے پچاس ہزار درہم میں ولید بن عبدالملک کے ہاتھ فروخت کیا۔

علامہ شبلی اور طالب ہاشمی نے علامہ ابن سعد کے حوالے سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اپنی بیویوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

''تم میں سے مجھے وہ جلد ملے گی جس کا ہاتھ سب سے لمبا ہوگا۔'' حضور ﷺ کی ''لمبے ہاتھ'' سے مراد سخاوت وفیاضی تھی۔

سیدہ زینبؓ بے حد سخی اور مخیر تھیں اس لیے اس پیشگوئی کی مصداق ثابت ہوئیں اور آپ ﷺ کے بعد تمام ازواج مطہرات میں سب سے پہلے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

وفات

ام المومنین سیدہ زینبؓ نے ۲۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ وقت تھے۔ اس خبر سے شہر میں کہرام مچ گیا۔ آج مدینے والے ہی نہیں بلکہ پورا عالم اسلام اپنی ایک روحانی شفیق ماں کے سکون بخش اور روح پرور سایہ عاطفت سے محروم ہو گیا تھا۔ غریب، مسکین اور بیوائیں بلبلا اٹھیں کہ ان کی کفالت اور دستگیری کرنے والی فراخ دست ہستی انھیں ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئی۔

سیدہ زینبؓ نے اپنے لیے کفن کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس لیے وصیت فرمائی تھی کہ اگر حضرت عمرؓ کفن کے لیے کپڑا بھیجیں تو ان میں سے ایک خیرات کر دیا جائے۔

عمرہ بنت عبدالرحمن بیان کرتی ہیں کہ خلیفہ وقت نے بیت المال سے کپڑے کے پانچ تھان بھیجے کہ ان میں سے جو پسند ہو لے لیا جائے چنانچہ ام المومنین کو انہی تھانوں میں سے ایک کے کپڑے میں کفنایا گیا اور ان کی بہن حضرت حمنہؓ نے سیدہ کا رکھا ہوا کفن صدقے کے طور پر دے دیا۔

ام المومنین نے آخری وقت وصیت فرمائی تھی کہ میری میت رسول اللہ ﷺ کے تابوت میں رکھ کر قبرستان لے جائی جائے۔ اس وصیت پر عمل کیا گیا۔ سیدہ کی یہ خواہش اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ والہانہ عاشقانہ لگاؤ اور تعلق کا نتیجہ تھی۔

ام المومنین کا جنازہ اٹھا۔ کندھا دینے والوں میں ان کے روحانی بیٹوں کا ایک جم غفیر تھا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سیدہؓ مرحومہ کے بھائی ابواحمدؒ بن جحش بھی جنازہ اٹھائے لیے جا رہے تھے۔ وہ اس وقت نابینا تھے۔ زاروقطار رو رہے تھے اس پر حضرت عمرؓ نے آواز بلند کہا:

''ابواحمد! جنازے سے ہٹ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے رش کی وجہ سے تمھیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔''

انھوں نے بادیدہ تر کہا:

''امیر المومنین! یہ وہ شخصیت ہیں جن کی بدولت ہمیں ہر قسم کی خیر اور بھلائی نصیب ہوئی۔ ان کے احسانات کے احساس کی وجہ سے اس وقت کی ہر سختی اور تنگی ہیچ ہے۔''

اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''اچھا! چمٹے رہو۔''

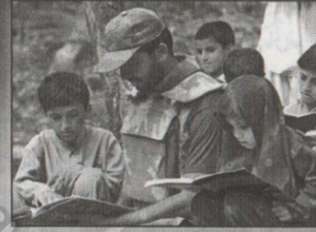
خلیفہ راشد حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جب جنازہ قبر کے قریب لایا گیا تو حمد وثنا کے بعد مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''جب ام المومنین سیدہ زینبؓ بیمار ہوئیں تو میں نے امہات المومنین سے پچھوایا کہ ان کی تیمارداری کون کرے گا؟ انھوں نے کہا، ہم کریں گی۔ میرے خیال میں انھوں نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا۔ ان کے انتقال پر پھر میں نے دریافت کروایا کہ انھیں غسل کون دے گا؟ جواب میں کہلوایا ''یہ فریضہ ہم ہی انجام دیں گے۔'' اس کے بعد میں نے معلوم کروایا کہ انھیں قبر میں کون اتارے گا؟ جواب آیا کہ وہی لوگ اتاریں گے جن کا ان کی زندگی میں ان کے پاس آنا جانا جائز تھا۔ میرے خیال میں ان کی یہ رائے بالکل مناسب اور درست ہے۔''

مدینے میں اس دن سخت گرمی تھی۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے قبر پر شامیانہ لگوا دیا تاکہ قبر کی تیاری اور سیدہؓ کی تدفین میں لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا شامیانہ تھا جو کسی قبر پر نصب کیا گیا۔

اس کے بعد قبر کے پاس سے لوگوں کو ہٹا دیا گیا۔ پھر ام المومنین کے بھتیجوں اور بھانجوں میں سے محمد بن عبداللہؓ، اسامہ بن ابی احمدؒ اور محمد بن طلحہؓ نے انھیں ان کی آخری اور ابدی آرام گاہ میں اتارا۔ وفات کے وقت ام المومنین سیدہ زینبؓ کی عمر باون (۵۲) یا ترپن (۵۳) سال تھی۔ (خاتمہ بالخیر)





پاکستان کے زِندہ کردار

ڈاکٹر
سیّد ابوالخیر کشفی

تعمیرِ وطن میں تن من سے محوِ محبتوں کے متوالوں کی دل روشن کر دینے والی داستان

آج میرے اور آپ کے پیارے وطن...... دلارے پاکستان کو آزاد فضاؤں میں سانس لیتے ۷۰ سال ہو چکے لیکن ایسا لگتا ہے کہ بعض ذہنوں میں، اپنے وطن کی وحدت اور اس کی یک جہتی کے بارے میں یقین ابھی تک پوری طرح جڑ نہیں پکڑ سکا۔ شاید یہی بے یقینی آج وطنِ عزیز میں بلند ہونے والے منفی نعروں کا باعث بنتی ہے۔ میں اُسے دیکھ کر متفکّر ہو جاتا ہوں لیکن یہ تاریکیاں چھٹ رہی ہیں اور بہت دور کی روشنیاں قریب آ رہی ہیں۔ یہ روشنیاں ہیولوں میں بدل رہی ہیں...... اور قریب آ کر یہ ہیولے انسانی پیکر اور خد و خال میں ڈھل رہے ہیں۔ ان کے لبوں پر نغمے ہیں، لفظوں کے پھول ہیں، اُن کے ذہنوں میں آگہی کی جو شمعیں روشن ہیں، میں انھیں دیکھ سکتا ہوں۔

میرا ماضی مجھے بہت دور لے گیا ہے۔ کئی سال پہلے، یہ چوراہے پر کیسا ہجوم ہے؟ یہ تو یعقوب پان والے کی دکان ہے۔ سامنے ایک بڑا سا مُہر بند صندوقچہ رکھا ہے۔ پان کھاتے جائیے اور جو رقم آپ چاہیں صندوقچہ میں ڈالتے جائیے۔ وہ لوگ بھی آج یعقوب کے ہاتھوں سے پان لے کر کھا رہے ہیں جنھوں نے شاید کبھی پان نہیں کھایا تھا۔ یہ ۲۳/ مارچ ۱۹۴۵ء کی صبح ہے، شاید ۱۹۴۶ء ہو' مگر اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟

دکان کے سامنے ہجوم بڑھتا جاتا ہے۔ میں بھی اِسی ہجوم میں شامل ہوں۔ آج یعقوب کی آمدنی پاکستان فنڈ کے لیے مخصوص بلکہ یعقوب کے الفاظ میں ''وَ گف'' ہے۔ میں بھی اس ہجوم میں شامل ہوں۔ جب میری باری آئی تو میں نے دو پیسے کا پان خریدتے ہوئے ایک روپیا صندوقچی میں ڈال دیا' مگر میں شرمندہ ہوں' مجوب ہوں۔ مجھ سے پہلے قطار میں کھڑے ہوئے میرے بھائی (مظفّر حسین کاظمی مرحوم) کی جب باری آئی تو انھوں نے بہت چھُپا کر دس روپے کا نوٹ صندوقچہ میں ڈالا تھا' مگر میں نے دیکھ لیا...... اور میں رشک کے ساتھ یہ سوچ رہا تھا کہ میں بڑا کیوں نہیں؟ چھوٹا کیوں ہوں؟ بڑا ہوتا تو دس روپے میں بھی صندوقچی میں ڈالتا...... شام کو جب کانپور مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری سید حسن احمد شاہ نے وہ صندوقچہ کھولا تو اِس میں پانچ سو روپیوں سے زیادہ کی رقم تھی۔

منظر بدل گیا...... چوراہا وہی ہے...... ہاں چوراہے کی بیشتر دکانیں اب مختلف ہیں۔ ویسے یہ چوراہا پہچانا جا سکتا ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کے محلے کا چوراہا ہے اور آزادی کے بعد بھی بھارت کے عام مسلمان کی زندگی میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی۔ یعقوب کی آنکھوں میں ماہ و سال کی دھند اور بھارتی مسلمان کے حال نے بسیرا بنا لیا ہے۔ کل کا چھوٹا سا لڑکا اب ادھیڑ عمر کا آدمی ہے اور یعقوب کی دکان کے سامنے کھڑا ہے۔ بڑھاپے کی منزل سے گزرتے ہوئے یعقوب پان فروش کہہ رہے ہیں۔ ''بھیّا! پاکستان والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ پاکستان کیا ہے''۔

میں خاموش ہوں۔ اس سیدھے سادے جملے کے پیچھے وہ علم، آگاہی اور کرب ہے جو کسی بڑے ادیب اور فنکار کی گرفت میں بھی نہیں آ سکتا۔ یہ ٹیلی ویژن کے کسی صاحبِ ثروت صوفی کے ڈرامے کے کردار کا مکالمہ نہیں۔ یہ اُس یعقوب کا کرب ہے جس نے پاکستان کی خاطر اپنی جوانی تج دی اور جو اِس لیے زندہ ہے کہ مرنے سے پہلے وہ یہ یقین کر لینا چاہتا ہے کہ پاکستان والوں کو پاکستان کے معانی معلوم ہو گئے ہیں...... یعقوب کبھی پاکستان نہیں آئے۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنے آپ سے، اپنے خوابوں سے اور ہم سے ڈرتے ہوں اور مایوس نہیں ہونا چاہتے ہوں۔

گزشتہ سال اچھن خان صاحب کانپور، بھارت سے کراچی آئے تھے۔ وہ کانپور میں بہت بڑے موٹر گیراج اور کارخانے کے مالک ہیں مگر ہوائی جہاز کی جگہ ریل سے آئے۔ اُنہیں اُن لوگوں کی ''داستانوں'' پر یقین نہیں آتا تھا جو لاہور اسٹیشن پر کسٹم والوں کی زیادتیوں اور رشوتوں کا ذکر کرتے تھے...... مگر ہوا یوں کہ جب خان صاحب نے لاہور اسٹیشن پر وہ کچھ دیکھا جسے وہ جھٹلانا چاہتے تھے تو گم صُم ہو گئے۔ اِن کے ہونٹ مسکرانے کی ادا بھول گئے۔ اس سال مارچ میں میری اُن کی ملاقات کانپور میں ہوئی۔ موقع پا کر چپکے سے میرے کانوں میں کہا۔ ''پاکستان کی اچھی باتیں ہی لوگوں کو بتائیے گا۔ دل بہت نازک چیز ہے۔''

ایسے کتنے ہی یعقوب، کتنے ہی اچھّن خان کسی اچھی خبر، کسی اچھی بات، کسی روشنی، کسی خوشبو کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے مجھے یہی کہنا ہے کہ جو سیاہ بادل دکھائی اور جو منفی نعرے سنائی دے رہے ہیں، اُن کے بیچ بیچ اُجالا بھی ہے، خوشبو بھی اور سچّے اور بڑے آدمی بھی۔ یہ تحریر ہر یعقوب اور ہر اچھن خان کے لیے ہے...... آئیے اُن بڑے آدمیوں سے ملیں جو کسی سیاسی جماعت کے قائد نہیں، جو کسی مِل کے مالک نہیں، جو اسمگلنگ کے بیج بو کر کوٹھیوں اور کاروں کی فصل نہیں اُگاتے، مگر یہ ملک، یہ معاشرہ انہی کے وجود کی برکت سے قائم ہے...... یہی وہ ہیں جن کے بارے میں میرے اور آپ کے سلیم احمد نے کہا تھا

خاکسارانِ محبّت کو حقارت سے نہ دیکھ
یہ بڑے لوگ ہیں جینے کا ہنر جانتے ہیں

اُنہی بڑے لوگوں پر میں نے کوئی تیس سال پہلے ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا: ''میں انہیں سلام کرتا ہوں۔'' آج پھر میں اُنہیں سلام کر رہا ہوں، اور اُن بڑے آدمیوں کے ساتھ جن کا پہلے تذکرہ کیا تھا۔ کئی نئے چہرے، نئی آوازیں اِس حکایت میں شامل ہو گئی ہیں...... گویا کارِ تعمیرِ پاکستان جاری ہے۔ جب تک ایسے لوگ میری دھرتی کے سینے پر آباد ہیں، جب تک اُن کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، جب تک وہ میرے اور آپ کے لیے، دعائے نیم شبی میں اپنے ربّ کے سامنے استغاثہ پیش کر رہے ہیں...... ہم پاکستان سے کیسے مایوس ہو سکتے ہیں۔

یہ لوگ ہمارے مستقبل کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اِن کا ہر بول

ہمارے لیے نشانِ راہ ہے۔ یہ لوگ محبتوں کے نقیب اور الفتوں کے سفیر ہیں۔ یہ تو ایسے اَن پڑھ فلسفی ہیں جو ہمارے لیے انسانی رشتوں اور تجربوں کی گرہیں کھولتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں رسولِ اُمّی لقب ﷺ (میرے ماں باپ اُن پر فدا ہوں) کے علم کی میراث سے حصّہ ملا ہے۔ یہ ہیں حکمتِ مومن کے امین، وہ حکمت جو ہمیں اپنے مدرسوں اور دانش گاہوں میں خال خال نظر آتی ہے۔ ایک ایسے ہی فلسفی کی کہانی سنیے۔

ایک دن میں باورچی خانے میں کھڑا تھا۔ میری بچی چائے بنا چکی تھی اور میں اپنی پیالی کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے کہیں جانا تھا۔ ایک آواز دور سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ ''سِل بٹّے والی۔'' یہ آواز پاکستان کے بیشتر نوجوانوں کے لیے اجنبی اور شاید بے معنی ہو۔ سِل بٹّے، اگرچہ ابھی گھروں میں موجود ہیں مگر انہیں کھودنے کا فن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ گرائنڈر کا دور ہے۔

اچانک بچّی نے ایک پیالی توڑ دی۔ میں نے خاصے غصّے میں اُس سے کہا کہ ''آنکھیں کھول کر کام کیوں نہیں کرتیں۔''

ابھی شاید میں کچھ اور کہتا کہ ایک بڑی شفیق آواز ابھری...... ''نہ بیٹا! بچیوں کو نہ ڈانٹا کر۔ یہ تو نبی جی ﷺ کی چڑیاں ہیں۔ میکے میں رہنا تو اِن کا رین بسیرا ہے۔''

اور میں اس آواز کی شفقت اور نرمی تلے کچل سا گیا۔ یہ آواز بہت بہت دنوں کے بعد جامعہ نگر کی فضا میں سنائی دیتی ہے: ''سِل بٹّے والی'' اور یہ میرے لیے جیسے کسی اچھے موسم کی نوید ہے۔ کوئل کی آواز کی طرح جو آم کا سندیسہ لے کر آتی ہے۔ اِس وقت بھی کوئل کی آواز دور سے آرہی ہے۔ کچھ دنوں میں یہ آواز کم و بیش ایک سال کے لیے سو جائے گی۔

اور میں اس کا انتظار کروں گا۔ یہی دو آوازیں تو ہیں جن کا انتظار اب زندگی کا ایک حصّہ بن گیا ہے...... ''کُو...... کُو'' اور ''سِل بٹّے والی''۔

یہ سِل بٹّے والی خالہ ایٹے کی رہنے والی ہیں۔ دہلی کالونی سے بھی آگے رہتیں اور رزقِ حلال کی تلاش میں یونی ورسٹی تک آتی ہیں۔ یہ اُسی قوم کی فرد ہیں جس کے تاجر ''زرِ سہل'' (ازی منی) کا شکار ہو گئے ہیں۔ روپیا آئے بہت سا اور فوراً...... اور اس سیلابِ تمنا میں اقدار خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی ہیں۔

ایک طرف جھگّیوں میں بھی کروڑ پتی بستے ہیں اور دوسری طرف اس قوم کا ہر بچہ غیروں کے قرضوں میں جکڑا ہوا پیدا ہوتا ہے اور ان کے درمیان یہ اُجلی آواز اعلانِ رزق حلال کی طرح گونج رہی ہے: ''سِل بٹّے والی'' اور دوسری طرف وہ نوٹ رشوت بن کر ہاتھوں سے جیبوں تک پہنچ رہے ہیں جن پر تحریر ہے ''حصولِ رزقِ حلال عبادت ہے۔''

رزقِ حلال، انسانی کردار کو غیرت کا تحفہ عطا کرتا ہے۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے نصف کی بات ہے، ۱۹۵۴ء یا ۵۵ء کی۔ ابنِ انشاء جہانگیر روڈ پر رہتے تھے اور اُن کے ہاں اپنے شب و روز گزرتے تھے۔ میں بھی جیسے اُن کے گھرانے کا ایک فرد تھا۔ تابش دہلوی، جمیل نقوی اور مشفق خواجہ بھی قریب قریب رہتے تھے۔ یوں زندگی میں دوستی کے سونے کی چمک نہایت تھی۔

ایک دن قائداعظمؒ کے مزار کے قریب سے میں نے ایک سائیکل رکشا جہانگیر روڈ جانے کے لیے لیا۔ رکشا میں بیٹھنے سے پہلے کرایہ طے کر لینا میری عادت تھی۔ چھ آنے طے ہوئے تھے۔ رکشا والے نے انشاء جی کے دروازے پر رکشا روکا۔ میں نے اٹھنّی دی اور کہا ''دو آنے تم رکھ لو......''

اور پھر دوسرے لمحے یوں ہوا کہ میری مٹھّی کھولی گئی۔ دونّی میری ہتھیلی پر رکھ کر رکشا والے نے کہا ''میں میسور کا رہنے والا ہوں، جہاں ٹیپو پیدا ہوا تھا۔'' اور پھر پیڈل مارتا ہوا وہ چلا گیا۔ میں خاصی دیر تک مکان کے سامنے کھڑا رہا۔

آج اصطلاحوں کے معانی بدل گئے ہیں۔ غیرت کا مفہوم بدل گیا ہے۔ کبھی تو ؎

غیرت تھی بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں

آج غیرت کے معانی ''شرم'' کے ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ محنت مزدوری کرتے ''غیرت'' آتی ہے۔ (یعنی شرم) کبھی غیرت کے ہاتھوں دستِ سوال دراز کرنے کی جگہ محنت مزدوری کی جاتی تھی۔ اب میرا حافظہ مجھے اور پیچھے لیے جا رہا ہے۔

پاکستان بننے کے کچھ دنوں بعد کی بات ہے۔ لاکھوں مہاجروں کے ساتھ ایک غیرت مند استاد اور سیّد بھی اپنے ''ارضِ خواب'' میں آیا کہ اُسے حقیقت کے طور پر محسوس کر لے۔ یہ تھے سید طاہر حسین نقوی۔ اُردو زبان و ادب کے معتبر استاد۔ مجھے بھی اِن کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ نقوی صاحب مہاراجا کالج، جے پور میں پڑھاتے تھے۔ ٹینس کے بہت اچھے کھلاڑی بھی تھے۔ پاکستان آئے تو سول اسپتال، کراچی کے پیچھے ایک فلیٹ میں رہنے لگے۔ یہ آج کے ''بابائے اُردو روڈ'' کا علاقہ ہے۔ اُن دنوں بے شمار امکانات تھے، مگر افراتفری بھی تھی۔ نوکریاں ملتی ضرور تھیں مگر کبھی کبھی بہت تاخیر ہو جاتی۔ نقوی صاحب تو ایک بڑی روایت کے امین تھے۔ وہ روایت جو فقر کی روایت ہے اور جس کے پاسداروں کو اقبال نے اپنی روایت کی پاسداری کا سبق یوں دیا ہے

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر، ہے مدارِ قوت حیدریؓ

نقوی صاحب نے اپنے فلیٹ کے سامنے لکڑی کے ٹکڑے جوڑ کر دکان سی بنا لی اور سبزی بیچنے لگے۔ شاید پان بھی بنانے لگے۔ کچھ دنوں بعد انہیں ایس۔ ایم کالج میں لیکچرار کی نوکری مل گئی، مگر انہوں نے فوراً دکان بند نہیں کی۔

''نقوی صاحب! اللہ کے لیے اب تو یہ تھڑا ہٹا دیجیے۔'' کسی دوست نے کہا۔

''مگر صاحب! تنخواہ تو ایک مہینے بعد ملے گی''۔ انہوں نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔

اُن دنوں پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور اختر حسین صاحب ان کے پی اے۔ اختر حسین سات آٹھ وائس چانسلروں کا زمانہ دیکھ کر ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ وہ نقوی صاحب کی ''دکان'' سے سبزی خریدتے تھے۔ اِدھر نقوی صاحب لیکچرر ہونے کے بعد اردو کی مجلسِ نصاب کے رکن بن گئے۔

ایک دن وہ اختر حسین کے دفتر جا پہنچے۔ اختر صاحب مروّت کے آدمی تھے۔ اُس دن بہت مصروف تھے مگر اپنے سبزی فروش دوست کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے۔ ''ارے صاحب! سبزیاں بہت مہنگی ہوتی جاتی ہیں۔ غضب خدا کا، آلو چھ آنے سیر بکنے لگے۔

''جی ہاں۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔''

''مگر آپ بہت اچھی سبزیاں لاتے ہیں......''

''شکریہ......'' اور جب نقوی صاحب کہتے کہ وائس چانسلر صاحب سے ملنا ہے تو اختر صاحب جواب دیتے کہ آج وہ بہت مصروف ہیں۔

''مصروفیت ہے کیا؟'' آخر نقوی صاحب نے پوچھ لیا۔

''آج اُردو کی کمیٹی آف کورسز کا جلسہ ہے''۔

''اُسی میں تو شرکت کے لیے آیا ہوں''۔ یہ کہتے ہوئے نقوی صاحب نے اپنی شیروانی کی جیب سے دعوت نامہ نکالا۔ اختر صاحب اس کردار اور عظمت کو دیکھ کر سناٹے میں آگئے۔ ''الکاسب حبیب اللہ'' کی یہ عملی تصویر کتنی حسین تھی۔

اُنہی دنوں ایک اور ایسا تجربہ ہوا، جو میں نہیں بھول سکتا۔ ناقابلِ فراموش واقعات، جن میں کوئی آدمی اسلامی اور انسانی اقدار کا مظہر بن جائے، تجربہ ہی تو ہوتے ہیں۔ یہ تجربے اندر سے ہمیں بدل دیتے اور خارجی ماحول پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں گاندھی گارڈن کے قریب لارنس روڈ (اب نشتر روڈ) پر ایشین منیشن میں رہا کرتا تھا۔ یہ علاقہ بہت صاف ستھرا اور رہنے کے قابل تھا۔ تب ٹرام چلا کرتی تھی اور بولٹن مارکیٹ تک کرایہ ایک آنہ تھا۔ فلیٹ چھوٹا سا تھا اور لوگ بہت تھے۔ رہنے والوں کے علاوہ ہر دن آنے والوں کا شمار نہ پوچھیے۔ لوگ

زندگی سے جنگ میں مصروف تھے اور جب تھک جاتے تو اُن لوگوں کی طرف رخ کرتے جو حوصلہ دلا سکتے۔

مظفرّ حسن کاظمی مرحوم (بھائی) ایسے ہی آدمی تھے۔ جب فلیٹ کی آبادی بہت بڑھ جاتی تو میں ٹرام میں بیٹھ کر اپنی درسی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔ یہ انہی دنوں کی ریاضت کا ثمر ہے کہ میں ہجوم اور چلتی گاڑیوں میں بھی اپنی توجہ کو مرکوز رکھتا اور پڑھنے کے علاوہ لکھ بھی سکتا ہوں۔

ایک دن ٹرام میں بولٹن مارکیٹ سے گھر واپس آ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے تھک گیا تو کتاب بند کر کے آدمیوں اور مناظرِ گزراں کا مطالعہ کرنے لگا۔ ایک صاحب میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ باتوں باتوں میں، میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ جواب دیا ”فی الحال بیکار ہوں اور نوکری کی تلاش کر رہا ہوں۔ آپ بھی میری مدد کریں۔“

”آپ کی تعلیم کتنی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگے ”اگر لوئر ڈویژن کلرکی کی جگہ ہے تو میں ہائی اسکول ہوں۔ اگر اَپر ڈویژن کلرک کی جگہ ہے تو انٹر پاس ہوں۔ اگر بینک میں یا کسی تجارتی ادارے میں خالی جگہ ہے تو بی۔ اے پاس ہوں۔ میرے پاس اور اسناد بھی ہیں لیکن میں نوکری کی خاطر علمی سند کی بے حرمتی نہیں کروا سکتا۔“

میرے اصرار پر وہ میرے فلیٹ پر آئے اور درخواست لکھ کر دی۔ اپنی کوششوں کے باوجود میں اُن کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ وقت گزرتا گیا۔ کوئی ایک سال بعد، اسی علاقہ میں، غالباً ڈینسو ہال کے قریب سے میں پیدل گزر رہا تھا کہ ایک کار قریب آ کر رکی۔ دو تین صاحبان اُترے۔ ایک صاحب نے سلام کے بعد پوچھا ”آپ نے پہچانا؟“

میرا جواب نفی میں تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ”یہ کراچی میں میرے پہلے محسن ہیں۔“

اب میں اور پریشان ہوا۔ میری پریشانی بھانپ کر انہوں نے یہ واقعہ سنایا۔ اگرچہ میں اُن کے لیے عملاً کچھ نہیں کر سکا تھا مگر میری دلچسپی کے پیشِ نظر یہ صاحب مجھے اپنا محسن قرار دینے پر مُصر تھے۔ یہ تھے ممتاز ماہر تعلیم جناب امانت علی۔ اُس وقت وہ گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں اُستاد ہو گئے تھے۔

پھر وہ پروفیسر اور پرنسپل کے مناصب پر فائز ہوئے اور جامعہ کی کئی مجلسوں کے ارکان مقرر کیے گئے اور اُن سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اللہ انہیں اور پروفیسر طاہر حُسین نقوی کو سلامت رکھے کہ وہ آج بھی ہمارے معاشرے میں علم اور رزقِ حلال کی برتری کی زندہ علامتیں ہیں۔

ایسے لوگوں کے ہوتے ہوئے ہم اپنے مستقبل سے کیوں مایوس ہوں؟ پاکستان کے درودیوار روشن رہیں گے۔ ستارے اِس دیس کے آسمان پر چمکتے رہیں گے، پھول اس کے باغوں میں کھلتے رہیں گے اور معاشرتی اور کرداری اندھیروں میں ایسے کردار جبینِ جبرئیل کے مانند چمکتے رہیں گے۔

◆◆◆

پریشانی

باہر کچھ گرنے کی زوردار آواز سن کر ایک کسان جلدی سے باہر نکلا۔ اس نے دیکھا سڑک کے کنارے گھاس کا ایک بڑا سا گٹھڑ گرا پڑا ہے اور بارہ تیرہ برس کا لڑکا قریب کھڑا رو رہا ہے۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں بیٹا!“ کسان نے اسے تسلی دی۔ ”آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ‘ ٹھنڈا پانی پیو‘ پھر آ کر گٹھڑ اٹھا لیں گے۔“

لڑکا کسان کے ساتھ اندر آ گیا۔ پانی‘ چائے اور کھانے سے تواضع کے دوران لڑکا بار بار کہہ رہا تھا:

”آج ابا غصے سے پاگل ہو جائیں گے۔ بہت ماریں گے مجھے۔“

کسان نے پوچھا ”ابا کیوں ماریں گے؟ کسی کے ہاں کھانا کھانا بُری بات تو نہیں۔“

”اس لیے کہ وہ باہر گٹھڑ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔“

لڑکے نے بے چارگی سے جواب دیا۔



ایک ہندو راہنما کے قلم سے مسلمانانِ بھارت پر انتہا پسندوں کے ظلم و ستم کی اشک آور روداد

جب وہ بقیدِ حیات تھا میں اسے نہیں جانتا تھا لیکن اس کی موت پر اور جس انداز میں اُسے قتل کیا گیا، اس کا غم میں نے اپنے بیٹے کی طرح منایا۔ اس کے خواب مادہ پرست دنیا سے میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ ایک عالم اور معلمّ قرآن بننے کا خواہاں تھا۔ دوسروں کو قرآن کی تعلیم دینے کی خواہش اس کے قلب میں موجزن تھی۔ ایک دن وہ جامع مسجد کا امام بننے کی تمنا رکھتا تھا۔ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ۶ سال کی عمر میں اسے پڑوسی علاقہ نوح، ہریانہ کے ایک دینی مدرسے بھیجا گیا۔ وہ بہت ہی سنجیدہ اور ذہین طالب علم تھا جس نے مقدس قرآن مجید کے ہزاروں الفاظ ازبر کر لیے۔ اس غیر معمولی کارنامے کے عوض اسے حافظ قرآن کی خلعت عطا کی جانے والی تھی۔

جنید سال میں ایک مرتبہ ماہ رمضان المبارک میں مدرسہ سے اپنے گھر آیا کرتا تھا۔ اس سال رمضان میں وہ اپنے گاؤں میں بڑے فخر سے نماز تراویح میں قرآن مجید سناتا رہا۔ اپنے قتل سے ایک دن قبل ہی اس نے ختم قرآن کیا تھا۔ جنید کی حوصلہ افزائی اور تعریف وستائش کے طور پر گاؤں والوں نے اسے چھوٹی سی رقم بطور نذرانہ پیش کی تھی۔ اس رقم میں والد نے کچھ اور رقم جوڑ دی۔ یوں جنید ۱۵۰۰ روپے لیے پرانی دہلی کے بازار پہنچ گیا تا کہ نئے ملبوسات، جانماز اور بعض دوسرے تحائف خرید سکے۔

اس وقت جنید نے سر پر ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ یہی ٹوپی اس کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ میں اپنے دوستوں کے ایک گروہ کے ساتھ ہریانہ کے ضلع فریدہ آباد میں واقع اس کے گاؤں کھنڈولی پہنچا۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ جنید کے غمزدہ باپ، اس کی تڑپتی بلکتی ماں اور غم سے نڈھال بھائی بہنوں کو پرسہ دیں تو کس طرح دیں؟ ان سے کیا کہیں؟ اس کے باوجود بڑی ہمت سے ہم نے انہیں پرسہ دیا اور جنونی فرقہ پرستوں کے ہاتھوں جنید کے قتل پر گہرے صدمے کا اظہار کیا۔

ہمیں علم تھا کہ ہمارے تعزیتی الفاظ ایک ایسے خاندان کے

لیے زیادہ معنی نہیں رکھتے جسے انتہائی ظالمانہ انداز میں چہیتے بیٹے سے محروم کرتے ہوئے زندگی بھر کا غم دیا گیا تھا۔ لیکن ہم نے جو بھی الفاظ ادا کیے وہ غمزدہ ارکان خاندان کے لیے کچھ نہ کچھ تسلی کا باعث ضرور بنے۔ حیرت کی بات یہ کہ صرف دو ماہ قبل ہم نے اسی طرح کا اور ایک اور سفر کیا تھا تاکہ پہلو خان کے غمزدہ ارکان خاندان کو پرسہ دیں، ان کی دلجوئی کریں۔ وہی پہلو خان جنہیں گاؤ رکھشکوں نے درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ظالمانہ انداز میں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

ہمارا یہ سفر شاید ان کے ساتھ اظہار یگانگت کے لیے بھی تھا اور جنونیوں کی درندگی کا کفارہ بھی۔ ہم سوچنے لگے کہ ہمیں اور ایسے کتنے سفر کرنے پڑیں گے؟ ہمیں بہ حیثیت ایک قوم نفرت و تشدد کے ذریعہ تباہی و بربادی کا ننگا ناچ کرنے والوں سے یہ کہنا ہوگا کہ بہت ہو چکا، اب اور نہیں۔ ہم کھنڈوالی اس لیے بھی پہنچے تاکہ جنید کے خاندان سے کہہ سکیں، آپ کے غصہ اور غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ آپ کا غم بانٹنے یہاں آئے ہیں۔ اگرچہ اس سے آپ کا رنج والم کم نہیں ہوگا لیکن آپ لوگوں کو یہ اندازہ تو ہو کہ آپ لوگ تنہا نہیں۔

جنید کے والد جلال الدین جن کی عمر شاید پچاس سال سے بھی کم ہوگی، مجسمِ غم بنے بیٹھے تھے۔ ساکت، جامد! ان کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے بیٹے کے ساتھ جو کچھ ہوا، اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ انہیں اپنے چھوٹے سے مکان کے باہر جمع گاؤں کے لوگوں کی کثیر تعداد کی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اسی چھوٹے سے مکان کے ایک کونے میں ایک سادہ لباس پولیس انسپکٹر جلال الدین کے بیٹوں سے جنید اور ان کے ساتھ ریل میں پیش آئے واقعات کے بارے میں تفصیلات حاصل کر رہا تھا لیکن اپنی نوٹ بک میں وہ کچھ نہ لکھتا۔ اسی دوران گاؤں کا ایک عہدے دار گھر میں داخل ہوا اور جلال الدین سے کہنے لگا، اپنا مکان صاف ستھرا رکھنا سیاستداں اور سابق وزیراعلیٰ کچھ دیر میں آنے والے ہیں۔

جلال الدین نے بڑی خاموشی سے ہماری تعزیت قبول کی اور صرف یہ کہہ کر چپ سادھ لی ''میرے بیٹے بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ میرا بڑا لڑکا شاکر جو اسپتال میں زیرِ علاج ہے، بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے دو بچے ہیں۔'' ہمارے گروہ میں موجود خواتین زنانے میں گئیں اور جنید کی ماں کے ساتھ بیٹھ گئیں جو مسلسل روئے جا رہی تھی۔ شدت غم سے اس کی حالت بگڑ رہی تھی۔ سائرہ بیگم نے روتے ہوئے بتایا ''میرا بیٹا جنید بہت چھوٹا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ اسے اپنے سر پر ٹوپی نہیں پہننی چاہیے۔ میرے دوست، جان دیال زنان خانے میں گئے اور انہیں بتایا کہ ان کی بیوی نے آپ کے لیے دعائیں روانہ کی ہیں اور پھر سب نے مل کر دعا کی۔

ہم مکان کے باہر جنید کے اٹھارہ سالہ بھائی ہاشم کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اس کے چہرے پر ڈاڑھی تھی اور سر پر ٹوپی۔ ہاشم پر بھی ریل میں چاقو سے حملہ کیا گیا تھا۔ ہاشم نے اس رات پیش آئے ہولناک واقعہ کی تفصیلات بتائیں۔ بتایا کہ جامع مسجد دہلی کے قریب خریداری کرنے کے بعد تینوں بھائی صدر بازار کے اسٹیشن سے ریل میں سوار ہوئے اور اپنی نشستیں سنبھال لی۔ اوکھلہ میں ہجوم ریل میں داخل ہوا۔ جنید نے بطور احترام اپنی نشست سے اٹھ کر اس پر ایک ضعیف العمر شخص کو بٹھا دیا۔

اسی دوران پندرہ افراد کے ایک گروپ نے انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرے بھائیوں سے اپنی نشستیں خالی کرنے کو کہا۔ جب انہوں انکار کر دیا تب ان لوگوں نے انہیں تھپڑ رسید کیے اور مار پیٹ شروع کردی۔ ان کے سروں سے ٹوپیاں اتار کر پھینک دیں اور ڈاڑھیاں نوچ لیں۔ وہ مذہب کا نام لے کر گالیاں بکنے لگے۔ ان بھائیوں پر پاکستانی، گائے کا گوشت کھانے اور ختنہ کرنے والوں کے طعنے کسے گئے۔ یہ سنگین صورتحال دیکھ کر بھائیوں میں سے ایک نے خوف کے عالم میں گاؤں میں موجود اپنے بھائیوں کو فون پر خبر کر دی اور انہیں بچانے کے لیے فوراً بلبھ گڈھ ریلوے

اسٹیشن آنے کو کہا جہاں سے وہ اپنے گاؤں جاتے تھے۔

اس دوران بلبھ گڈھ اسٹیشن آگیا لیکن شرپسندوں نے بھائیوں کو ریل سے اترنے نہیں دیا۔ جو بھائی انہیں لینے پہنچے تھے، انہیں بھی ریل کے ڈبے میں کھینچ لیا۔ بلبھ گڈھ سے اگلے اسٹیشن آساوتی تک، نو منٹ کے سفر میں شرپسندوں نے چاقو نکال لیے اور تینوں بھائیوں پر چاقو سے متعدد وار کیے۔ بھائیوں نے مدد کے واسطے چیخ پکار شروع کر دی لیکن بوگی میں موجود مسافروں میں سے کوئی بھی مدد کرنے آگے نہیں بڑھا۔ حد تو یہ ہے کہ کمپارٹمنٹ میں ہر طرف خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔ اس کے باوجود لوگ مدد کی بجائے اپنے فونوں پر ویڈیو اور تصاویر لینے میں مصروف ہوگئے۔

مسافروں میں سے بعض نے تو حملہ آور نوجوانوں کو اُکسایا۔ ان میں وہ ضعیف شخص بھی شامل تھا جسے جنید نے اٹھ کر اپنی نشست دی تھی۔ آساوتی اسٹیشن پر تینوں بھائیوں کو ریل سے باہر پھینک دیا گیا۔ گھاگھی میں بعض قاتل بھی ریل سے اتر کر رفوچکر ہو گئے۔ ریل صرف ایک منٹ رکی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ بھائی حیران و پریشان رہ گئے۔ انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کریں تو آخر کیا کریں اس اسٹیشن پر بھی کوئی بھی ان کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ کسی مسافر، ریلوے اسٹاف پولیس والے یہاں تک کہ اسٹیشن کے دکاندار اور وہاں کاروبار کرنے والوں نے بھی ان کی کوئی مدد نہیں کی۔

اسی دوران جنید کے جسم سے خون بہتا رہا جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس کا سر اپنے بھائی کی گود میں جھول رہا تھا۔ دوسرے دو بھائی بھی شدید زخمی پڑے تھے۔ بھائی کسی نہ کسی طرح جنید کو اٹھائے پٹریاں عبور کرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کے باب الداخلہ پر لے آئے۔ اس دوران ایک بھائی پلوال کے اسپتال سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۴۵ منٹ بعد اسپتال کی ایمبولنس آئی لیکن اسپتال پہنچتے پر جنید کو مردہ قرار دے دیا گیا۔

ریل گاڑی

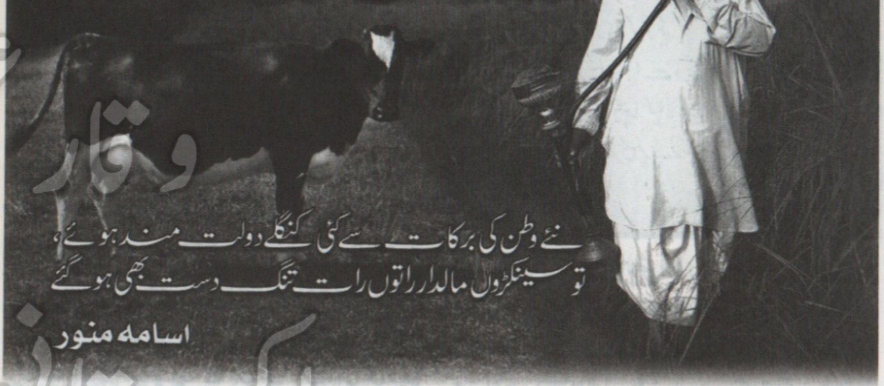
''بھائی خیر دین! بڑا دکھ ہوا۔ ریل گاڑی نے تمھاری گائے کو کچل دیا۔ اللہ تمھیں صبر دے گا۔ تمھاری گائے بہت پیاری تھی۔ بستی میں پھرتی رہتی تھی۔ وہ ریل گاڑی کے نیچے کیسے آگئی؟''

''وہ ریل گاڑی کو دیکھ کر بھاگی۔'' خیر دین نے کڑوے لہجے میں کہا ''اسے دیکھ کر انجن پٹڑی سے اترا' کھیتوں میں اس کا پیچھا کیا۔ میدان میں بھی اسے نہیں چھوڑا۔ پھر ہانک کر پٹڑی پر لے گیا اور اسے کچل کر سیٹی بجاتا ہوا آگے چلا گیا۔''

قارئین، آپ نے ہرش مندر (Harsh Mander) کا مضمون پڑھا جو بھارت کے سابق اعلیٰ سرکاری افسر اور سماجی راہنما ہیں۔ یہ آشکارا کرتا ہے کہ آج بھارت میں مقیم تقریباً بیس کروڑ بھارتی مسلمان جنونی ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہیں۔ بڑے شہروں کو چھوڑ کر چھوٹے شہروں، قصبات اور دیہات میں نوبت یہاں تک پہنچ چکی کہ مسلمان سرِعام ایک دوسرے کو پکارنے سے گریز کرتے ہیں۔ وجہ یہی کہ یوں وہ ہندوؤں کی نظر میں آجاتے ہیں۔

قائداعظم اور ہمارے دیگر بزرگوں نے ہندو عوام و خواص کے طور طریقے دیکھ کر واضح کر دیا تھا کہ اگر مسلمانوں نے علیحدہ وطن حاصل نہ کیا، تو ہندو اکثریت انہیں کھا جائے گی۔ آج قائداعظم کی پیش گوئی پوری ہو چکی۔ ہمیں تو ڈر ہے کہ جنونی ہندوؤں میں گھرے بھارتی مسلمان خوف و دہشت کے باعث رفتہ رفتہ اسلامی روایات سے ناتا توڑ دیں گے۔ یہ نوبت بھی آسکتی ہے کہ ان کے بچے بچیاں صرف نام کے مسلمان ہوں گے، ورنہ وہ ہندوانہ رنگ ڈھنگ میں ڈھل جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ وہ پاکستانی قوم کو ایسا وقت کبھی نہ دکھلائے۔

●●●



آزادی کی قیمت

نئے وطن کی برکات سے کئی کنگلے دولت مند ہوئے، تو سینکڑوں مالدار راتوں رات تنگ دست بھی ہو گئے

اسامہ منور

گاؤں کی سب سے بڑی حویلی میں چودھری آفاق علی خان بان کی چارپائی پر گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے حقہ پینے میں مصروف تھا۔ وہ حقے کی لمبی نالی منہ میں ڈالتا' ایک لمبا سا کش لگاتا اور پھر منہ پیچھے کر کے بدبودار دھواں چھوڑ دیتا۔ ابھی کچھ دھواں منہ میں ہی ہوتا کہ کھانسی شروع ہو جاتی۔ دو منٹ کھانستا اور پھر دوبارہ حقے کی نالی منہ میں ڈال لیتا۔ اُونچی پگڑی' ماتھے پر تیوریاں اور بیش قیمت جوڑا اس کے غرور کا عکاس تھا۔

اُس کے اردگرد گھنے سایہ دار درخت تھے جن کی چھاؤں میں بیٹھ کر عجیب طرح کی غنودگی کا احساس ہوتا تھا۔ چارپائی کے سامنے پرالی بچھی تھی جس پر سِلی ہوئی بوریوں کی چٹائی ڈالی گئی تھی۔ چٹائی پر گاؤں کے کچھ معززین بیٹھے کسی اہم مسئلے پر چودھری سے مشورہ کر رہے تھے۔ چودھری کے بعد گاؤں میں انہی معززین کا اثر و رسوخ تھا۔ یہ لوگ چودھری آفاق کی خودساختہ پارلیمنٹ کے اہم رکن تھے۔ ان کے ذریعے وہ اپنے ہر طرح کے کام نکلوا لیتا تھا اور بدلے میں ان کے آگے نوٹوں کی کچھ گڈیاں پھینک دیتا۔

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سانپ کو جتنا مرضی دودھ پلا لو وہ ڈس ضرور لیتا ہے۔ اس لیے چودھری نے ان سب کے کچھ اہم راز اپنے پاس رکھے ہوئے تھے تاکہ وہ کبھی بغاوت نہ کر سکیں۔ حقہ پینے کے ساتھ ساتھ چودھری آفاق بڑے انہماک سے باتیں بھی سن رہا تھا۔

''چودھری صاحب' سکینو ماچھن کہتی ہے کہ وہ اپنی زمین کسی بھی حالت میں آپ کے نام نہیں کروائے گی چاہے اس کی جان ہی چلی جائے۔'' چودھری کے خاص آدمی' رانا عبدالکریم نے اپنی سرگزشت سنائی۔

''ہوں... سکینو ایسا کہتی ہے... یہ تو بڑی بات ہے۔'' چودھری نے خودکلامی کی۔

''اور صاحب جی! فضلو کہتا ہے کہ جب تک چودھری آفاق اس کا پچھلا کھاتا صاف نہیں کرتا' وہ اپنے ٹیوب ویلوں سے اس کی زمینوں کو پانی نہیں لگائے گا۔'' حمید اکھتری بولا۔

''اچھا... اچھا تو فضلو ہمارا پانی بند کرنا چاہتا ہے...! ہماری زمینوں کو بنجر کرنا چاہتا ہے۔ ہونہہ... فضلو اب بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے''۔

''چودھری صاحب' اس دن آپ کی بھینسیں ٹھیکیدار کی فصلوں میں گھس گئی تھیں۔ انہوں نے بڑا نقصان کیا۔ اس کے سارے تربوز تباہ ہو گئے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ چودھری آفاق پر پرچہ کراؤں گا تاکہ اس کی عقل ٹھکانے آئے۔'' کامی نے چودھری کے غصے کو اور بڑھاوا دیا۔

یہ سنتے ہی چودھری کا کالا سیاہ چہرہ غصے سے اور کالا ہو گیا۔ ماتھے کی نس پھڑکنے لگی۔ اس نے حقے کو بائیں پاؤں سے ٹھوکر ماری جو خشک پرالی پر جا گرا۔ چلم میں ادھ بجھی چنگاریوں نے جلنے کی ناکام کوشش کی اور پھر جلد ہی بجھ گئیں۔

چودھری نے غصے سے کپکپاتی آواز میں اپنے نوکر گامے کو آواز دی:

''گ گ گ گامے... او گامیا... کمبختا کدھر دفع ہو گیا ہے... ادھر آ جلدی''۔

گاما بھاگا بھاگا چودھری کے پاس آیا اور سر جھکا کر بولا ''جی چودھری صاحب حکم!''

گاما چودھری آفاق کی بھینسیں چرایا کرتا تھا اور ساتھ میں ان کا دودھ بھی دوہ لیتا۔ اس کے بدلے چودھری آفاق دو وقت کی روٹی اور کپڑے دے دیتا۔ گامے کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ گاما پاگل ہو چکا کیونکہ وہ بس اپنے کام سے ہی مطلب رکھتا، کسی سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ عمر بھی ستر پچھتر سال تک پہنچ چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کے آخری دن گن رہا ہے۔ لیکن بعض اوقات مانگنے پر بھی موت نہیں آتی' اگرچہ انسان اس کی کتنی ہی خواہش کیوں نہ کرے۔ کبھی کبھی بن بلائے مہمان کی طرح آتی اور گھر کا صفایا کر کے خاموشی سے نکل جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان مجبوری کی ایسی انتہا کو پہنچ جاتا ہے کہ لگتا ہے' اس کے ہر زخم کا مرہم صرف اور صرف موت ہے۔ گامے کی بھی یہی صورتحال تھی۔ اس کا گھر بار' بیوی بچے' کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اس کا سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ صرف ایک چیز کی خاطر وہ اپنا سب کچھ لٹا چکا تھا۔

گامے کو دیکھتے ہی چودھری آپے سے باہر ہو گیا اور اس کو ٹھڈے مارنے لگا۔ پھر اس کے بال نوچتے اور گالیاں دیتے ہوئے کہنے لگا:

''اوئے! کتنی دفعہ تجھے سمجھایا ہے اندھوں کی طرح کام نہ کیا کر لیکن تو بے غیرتی کی ہر حد ہی پار کر گیا۔ کُتے کے پلے میں تجھے دو وقت کا کھانا اور کپڑے اس لیے نہیں دیتا کہ میرے دشمنوں میں اضافہ کرے''۔

گاما بیچارہ اس بات سے بے خبر تھا کہ چودھری کیوں مار رہا ہے۔ بس وہ مار کھاتے ہوئے دھیرے دھیرے آنسو بہائے جا رہا تھا۔ گاؤں کے معززین بھی یہ تماشا دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے چودھری کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور وہ کیوں روکتے؟ سبھی چودھری کے ٹکڑوں پر پل رہے تھے۔

گامے نے ہمیشہ کی طرح چودھری سے معافی مانگی اور خاموشی سے اندر چلا گیا۔ گاما اپنی زندگی میں کبھی اتنا ذلیل نہیں ہوا تھا جتنی ذلالت اس نے آج برداشت کی۔ اس کی ایک خامی یہ بھی تھی کہ وہ آگے سے کچھ نہ بولتا۔ اسے لگتا تھا کہ تقدیر نے اس کے ساتھ کھیل کھیلا ہے لیکن اسے کسی سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اللہ بہتر فیصلے کرنے والا ہے اور اسے اپنے رب پر کامل یقین تھا۔

گاما سر جھکائے جیسے ہی اندر داخل ہوا' پیچھے سے فاطمہ کی آواز آئی۔ وہ چودھری کی بڑی بیٹی تھی:

''بابا! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے ابو کو کچھ بتایا کیوں نہیں! آپ کو بتانا چاہیے تھا کہ اجو ٹھیکیدار کی فصلوں میں جو بھینسیں گئی تھیں' اس میں فاطمہ کا قصور تھا''۔

فاطمہ کی بات سن کر گامے کو معلوم ہوا کہ آج اسے کیوں مار پڑی ہے۔ فاطمہ کل ضد کر رہی تھی کہ تربوز کھانے ہیں تو گاما اسے ساتھ لے گیا اور پھر یہ سانحہ رونما ہو گیا۔ گاما ایک تربوز لے کر فاطمہ کے پاس بیٹھ گیا، پیچھے سے بھینسوں نے ٹھیکیدار کی فصل اُجاڑ دی۔

گامے کو چودھری آفاق کے پاس نوکری کرتے بیس سال ہو گئے تھے۔ چودھری کے بچے گامے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ فاطمہ کو تو گامے پر بہت ترس آتا۔ فاطمہ بولے جا رہی تھی اور گاما خاموشی سے سنتا رہا۔ ''بابا...... بابا...... میں آپ سے بات کر رہی ہوں''۔ فاطمہ نے گامے کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔

''اچھا بولو'' گامے نے کہا۔

''آپ یہاں لیٹیں میں آپ کے چہرے پر ٹکور کرتی ہوں۔ ابو کتنی بے دردی سے مارتے ہیں۔ عمر کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔ پتا نہیں چودھریوں میں اتنی اکڑ اور غرور کیوں ہوتا ہے''۔ فاطمہ نے کہا۔

''سب میں نہیں ہوتا''۔ گاما بولا۔

''کیوں نہیں ہوتا......؟'' فاطمہ نے پوچھا۔

گامے نے بولنے کے بجائے آنکھیں بند کر لیں اور ماضی میں جا پہنچا۔

☆☆☆

چودھری صاحب اپنی نیلی کوٹھی کی بیٹھک میں کرسی پر براجمان تھے۔ محلے کے لوگ اپنے اپنے مسئلے بیان کر رہے تھے۔ چودھری صاحب ہر بات تحمل سے سنتے اور پھر اس کو ڈائری میں لکھ لیتے تاکہ بعد میں تسلّی کے ساتھ مسئلے کا حل ڈھونڈا جائے۔

''چودھری صاحب' کل کوئی ہمارے گوردوارے کے آگے کوڑا کرکٹ پھینک گیا۔ پھینکا بھی بالکل عین دروازے کے آگے جہاں سے گزر کر عقیدت مند ماتھا ٹیکنے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ ایسا ہو چکا لیکن میں نے یہ سوچ کر آپ کو نہیں بتایا کہ شاید غلطی سے کسی کا کوڑا کرکٹ یہاں گر گیا ہو۔'' سریندر سنگھ نے چودھری صاحب کو شکایت کی۔

> ''ہم سب کو ایک دوسرے کی عبادت گاہوں اور مذاہب کی عزت کرنی چاہیے۔ ہمارا اسلام ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ہم کسی غیر مسلم خواہ وہ ہندو ہو' سکھ یا عیسائی' اس کی کی دل آزاری کریں اور عبادت گاہوں کو نقصان پہنچائیں''

''سریندر، تمہیں کسی پر شک ہے؟'' چودھری صاحب نے پوچھا۔

''جناب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی مسلمان یہ کام کر رہا ہے''۔ سریندر نے کہا۔

''مسلمان...... وہ بھی ہمارے محلے کا...... ایسا ہو نہیں سکتا۔ پھر بھی میں پتا کرواتا ہوں۔ تم پریشان مت ہو' انشاءاللہ آج شام تک ہی خبر مل جائے گی۔ ایسا کرنے والے کو سخت سزا دی جائے گی خواہ وہ مسلم ہو یا سکھ' ہندو ہو یا عیسائی۔ ہم سب کو ایک دوسرے کی عبادت گاہوں اور مذاہب کی عزت کرنی چاہیے۔ ہمارا اسلام ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ ہم کسی غیر مسلم کی دل آزاری کریں اور عبادت گاہوں کو نقصان پہنچائیں''۔

''بڑی نوازش سرکار۔ مجھے آپ سے یہی امید تھی''۔ سریندر ہاتھ جوڑتا ہوا بیٹھ گیا۔

اس کے بعد کالی ناتھ اُٹھا اور شکایت کی کہ مسلمان ہمیں کنوئیں سے پانی نہیں لینے دیتے۔ چودھری صاحب نے باریاں مقرر کر دیں کہ دن کا ایک حصہ مسلمان اور دوسرا حصہ غیر مسلم کنوئیں کا پانی استعمال کریں گے۔ اسی دوران اذان ہونے لگی اور چودھری صاحب نے مجلس برخاست کر دی۔ نماز کے بعد چودھری صاحب گاڑی لے کر زمینوں کا چکر لگانے گئے اور پھر وہاں کام کرتے مزدوروں سے ملاقات کر کے ان کے مسائل سنے۔

گوردوارے کے دروازے پر کوڑا گرائے جانے کی تحقیق ہوئی تو پتا چلا کہ یادھو سنگھ نے یہ کام کیا ہے کیونکہ وہ سریندر سنگھ سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ چودھری صاحب نے دونوں کو تنہائی میں بٹھایا اور سمجھایا کہ اگر تم لوگ آپس میں جھگڑا کرو گے تو دوسرے لوگوں کو بات بڑھانے کا موقع ملے گا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نفرتوں کا پانی دے کر بڑی مت کرو ورنہ یہ تناور درخت بن جائیں گی اور پھر تم چاہ کر بھی ان کو کاٹ نہیں پاؤ گے۔ یادھو سنگھ نے سریندر اور چودھری صاحب سے معافی مانگی اور خوشی خوشی سریندر سنگھ کو گلے لگایا۔

چودھری غلام محمد کا پورے علاقے میں اثر ورسوخ تھا۔ سبھی لوگ انہیں اچھے الفاظ میں یاد کرتے تھے۔ کوئی ہی ایسا فرد ہو گا جس کو چودھری غلام محمد سے شکایت تھی ورنہ مسلم' ہندو' سکھ' عیسائی سب ہی انہیں عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے۔ چودھری صاحب نے بھی کبھی ان میں فرق نہیں رکھا تھا' خاص کر جب عدل وانصاف کی بات ہوتی۔ وہ اپنے قصبے ہی نہیں بلکہ دور دراز کے علاقوں میں بھی مشہور تھے۔ ان کی سخاوت' اچھے اخلاق' ایمانداری ودیانت داری اور عدل وانصاف کے سب ہی گرویدہ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے چودھری صاحب کو ہر وہ چیز عطا کی جس کی انہیں خواہش تھی، بے شمار زمینیں، جائیدادیں، کوٹھیاں، گاڑیاں، تین بیٹیاں اور چار بیٹے اور ایک صابر شاکر بیوی۔ چودھری صاحب کہا کرتے تھے ''مجھے زندگی میں کبھی کوئی آزمائش نہیں آئی اور میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اگر کبھی ایسا ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟ کیا میں ثابت قدم رہ پاؤں گا؟'' پھر وہ اللہ سے استقامت کی دعا کرتے۔ چودھری غلام محمد کا نام ان کی دادی نے رکھا تھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ جو محمد ﷺ کا غلام ہو، وہ انسانوں کو کبھی اپنی غلامی میں نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ چودھری صاحب نے دولت مند ہونے کے باوجود نوکر چاکر نہیں رکھے تھے۔

زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی جب چودھری صاحب کو پتا چلا کہ قائداعظمؒ نے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کر دیا ہے جہاں مسلمان اپنی مرضی سے زندگی گزاریں اور عبادت کر سکیں۔ چودھری صاحب کو لگتا تھا کہ ان کا قصبہ بہت اچھا ہے' یہاں کوئی دنگا فساد نہیں ہو گا' جبکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ آزادی کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ ہندو مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ سکھ بھی ہندوؤں کے نقشِ قدم پر چل کر مسلمانوں کو مارنے کے درپے تھے۔ چودھری صاحب کو ایسی تحریکوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ پُرامن زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے کبھی زندگی میں کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی تو پھر کوئی مجھے کیسے دے سکتا ہے؟ لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

قتل وغارت اور فساد بڑے شہروں سے دیہات اور قصبوں کا رخ کرنے لگا۔ مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جانے لگا۔ عورتوں کی عزتیں پامال کی جانے لگیں۔ جو مسلمان مقابلے پر اُترتا وہ شہید کر دیا جاتا۔ عورتیں چھتوں سے کود اور بھرے کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر اپنی عزتیں بچا

رہی تھیں۔ بچوں کو بے رحمی سے کاٹا جا رہا تھا۔ ہندو اور سکھ بھوکے کتوں کی طرح مسلمانوں کے گھروں پر جھپٹ رہے تھے اور جو چیز ہاتھ آتی' اس کو اپنے قابو میں کر لیتے۔ ہر طرف قیامت صغریٰ کا عالم تھا۔

جوں جوں آزادی کا دن قریب آیا، قتل و غارت میں اضافہ ہو گیا۔ ایک دن نماز عصر کے بعد حسب معمول چودھری صاحب اپنی فصلوں کی طرف گئے تا کہ جائزہ لے سکیں۔ دھان کی فصل پک چکی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا' سب مزدور نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اب چودھری غلام محمد کو تشویش لاحق ہوئی اور دل میں کھٹکا بھی ہوا۔ جلدی سے گاڑی گھر کی طرف موڑی لیکن وہ اسٹارٹ ہی نہ ہوئی۔ اللہ اللہ کر کے عشاء کے وقت گھر پہنچے تو یہ دیکھ کر چیخیں نکل گئیں کہ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ سامنے ہی اُن کے بیٹے اور بیٹیوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ تھوڑی دور ابا جی اور اماں جی کی لاشیں مل گئیں جبکہ بیوی کی لاش نہیں ملی۔

یہ روح فرسا منظر دیکھ کر چودھری صاحب نیم پاگل ہو گئے۔ کبھی سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے اور کبھی دیوار پر پٹختے۔ اتنے میں دروازے پر زور سے دستک ہوئی اور بہت سی آوازیں آنے لگیں۔ چودھری صاحب فوراً اپنی حویلی کی چھت پر پہنچے اور پھر وہاں سے دوسرے مکانات کی چھتیں پھلانگتے دور چلے گئے۔ ان کے قدم پھر نہ رُکے اور وہ دشمن سے بچتے بچاتے سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ گئے۔

نئے دیس میں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ وہ کیمپ میں ٹھہر گئے۔ آنکھوں کے سامنے اپنے خاندان کی تباہی کا منظر آتا تو زار و قطار رونا شروع کر دیتے۔ ایک رات وہ کیمپ سے نکلے' تو چودھری آفاق کے ملازم انھیں مل گئے۔ وہ انھیں اپنے ڈیرے پر لے آئے۔ تب سے غلام محمد جو خود بہت بڑے چودھری تھے' ایک جاہل چودھری کی چاکری کر رہے تھے۔ انہوں نے ہونی کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آزادی نے جہاں مسلمانوں کو ایک الگ وطن کا تحفہ بخشا، وہیں کئی غلام محمد اپنی جمع پونجی سے محروم ہو گئے۔ آزادی پانے کی راہ آسانی سے طے نہیں ہوتی۔ اگر میری بات پر یقین نہیں آیا تو جا کر غلام محمد سے پوچھ لیں جواب ''گاما'' بن کر زندگی کے بچے کھچے دن گزار رہا ہے۔

غزل

رنگ' خوشبو' شراب' میخانہ
یعنی بَس تُو' شراب' میخانہ

اُسکی قربت ہے جیسے آب حیات
اُس کے بازو' شراب' میخانہ

اپنی قسمت میں رقصِ بسمل ہے
اور ہر سُو' شراب' میخانہ

زُلف و کاکل' سحاب کی تصریح
چشمِ آہو' شراب' میخانہ

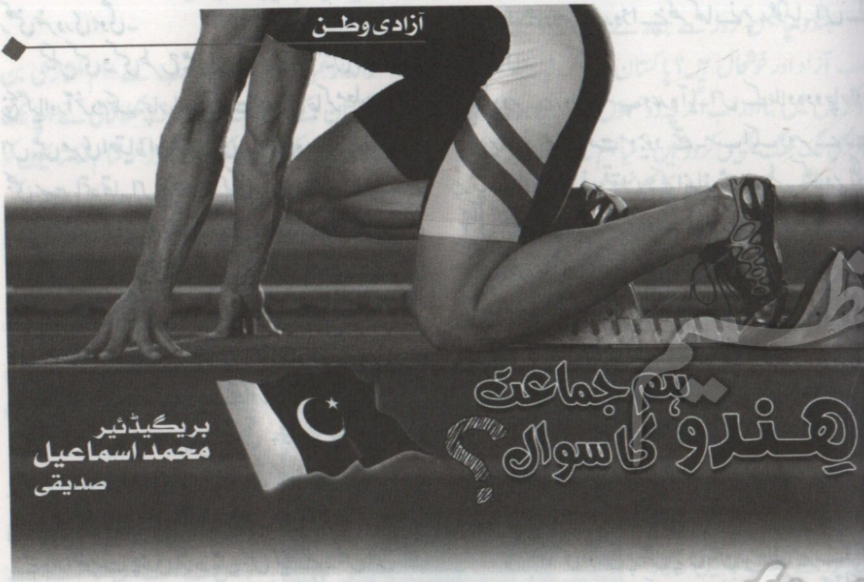
اُس سے دُوری' مثالِ دشتِ بلا
اُس کا پہلو' شراب' میخانہ

دل کی وحشت تلاش کرتی ہے
کوئی دل جُو' شراب' میخانہ

بے خودی کا حساب اتنا ہے
چند گل رُو' شراب' میخانہ

اک طرف میں' سراپا تشنہ لبی
اک طرف تو' شراب' میخانہ

(شبیر حسین بٹ' اسسٹنٹ کمشنر' شیخوپورہ)



پاکستانی دوست کو اس کا جواب ایشیائی کھیلوں کے ایک یادگار مقابلے سے ملا

پاکستان بننے سے پہلے گارڈن کالج، راولپنڈی میں وریندر کمار ورما نامی میرا ایک ہم جماعت دوست تھا۔ اس کا باپ سول محکمے میں اعلیٰ عہدے پر انجینئر تھا۔ ان کا مکان (ایک نہیں چار مکانات) مری روڈ پر گورنمنٹ گرلز کالج سے ملحقہ ابھی تک موجود تھے۔ حال میں دیکھا تو وہاں ایک پلازہ تعمیر کیا جا رہا تھا۔ اس سے اندازہ لگا لیں کہ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے والد کتنی قیمتی جائیداد کے مالک تھے، اس کا پورے طور پر تو علم نہیں۔ لیکن وہ آسودہ حال تھے۔

وریندر کمار کانگرس سٹوڈنٹس فیڈریشن کا رکن تھا اور میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی ایگزیکٹو کمیٹی کا رکن۔ یوں اگرچہ سیاسی خیالات کے لحاظ سے ہم بعد المشرقین تھے لیکن عام حالات سے متاثر ہوئے بغیر ہم ایک دوسرے کے دوست رہے اور ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا۔ اس کے ماں باپ آج کل کے سنگلز میس کی بازو والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ چونکہ اکثر اپنے گھر آتے ہوئے راستے میں ان کا مکان پڑتا تھا، اس لیے ہم اکٹھے آجاتے تھے۔

دوستی اپنی جگہ تھی تو سیاسی رجحانات بھی اپنی جگہ پر تھے۔ وہ اگر کانگریسی خیالات کا پرچار کرتا تھا تو میں مسلم لیگ کی تعریف میں قلابے ملائے رکھتا۔ ایک بار کالج میں ایسا واقعہ ہوا کہ مسلمان طلبہ نے ہڑتال کر دی۔ میں نے بھی اس ہڑتال اور مظاہروں میں بھرپور حصہ لیا۔ کالج کے پرنسپل، ڈاکٹر سٹیورٹ اور وائس پرنسپل ڈاکٹر کنگز کالج سے باہر نکل کر احتجاج کرتے ہوئے طلبہ کا جائزہ لیتے رہے۔ وہ خاص طور پر یہ بات مدِنظر رکھتے ہوں گے کہ احتجاج کے کرتا دھرتا کون ہیں؟ اور ان میں سے کوئی ایسا طالب علم تو نہیں جس پر آئندہ نظر

رکھنی ضروری ہوگی۔

لیکن کسی نہ کسی طرح میں ان کی ''بیڈ بکس'' میں آنے سے بچ گیا اور آخر دم تک بچا رہا۔ یہ تو بہت بعد میں جا کر معلوم ہوا کہ اس میں میری احتیاط اور خوش قسمتی کے علاوہ وریندر کمار ورما کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ اس ہڑتال کے کئی دن بعد اس نے ایک روز مجھ پر انکشاف کیا کہ کالج انتظامیہ کی جانب سے وہ ہم سب کی مخبری کیا کرتا تھا۔ ساتھ ہی مجھے بتایا ''صرف تم ایک ایسے شخص تھے جس کی میں نے مخبری نہیں کی۔'' خیر یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔ ہم دونوں اپنے تمام تر سیاسی رجحانات اور سرگرمیوں کے باوجود ایک دوسرے کے دوست تھے اور تقسیم تک رہے۔

تقسیم کے بعد وریندر مشرقی پنجاب چلا گیا، اپنے والدین کے ساتھ اپنے تمام تر اثاثے چھوڑ چھاڑ کے۔ گاہے بگاہے خبر ملتی رہی کہ وہ مشرقی پنجاب میں تعمیر ہونے والے نئے دارالحکومت چندی گڑھ میں بس گیا ہے۔ بس اس سے زیادہ اس کے بارے میں اور کوئی خبر نہ ملی۔

۵۸۔۱۹۵۷ء کا ذکر ہے کہ لائنز کلب (Lions Club) راولپنڈی والوں نے اپنے ہم عصر مشرقی پنجاب کے لائنز کلب والوں کو مدعو کیا۔ تبھی پتا چلا کہ وفد میں وریندر کمار ورما بھی کلب کے ایک خاصے سینئر رکن کی حیثیت سے شامل ہے۔ جس رات کلب کا اہم فنکشن اور عصرانہ تھا، میں نے اس سے ملنے کی ٹھانی۔ اسی رات میسانک ہال (MasonicHall) پہنچا جسے عرفِ عام میں جادو گھر کہا جاتا تھا۔ وہاں ڈنر بہت بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا۔ عمارت کو خوب سجایا گیا تھا لیکن اب یہ شکست و ریخت کا شکار ہے اور جادو گھر کی بجائے بھوت بنگلہ بن چکی۔ بلکہ اب تو اسے بنیادوں تک کھود دیا گیا ہے۔ شاید وہاں بھی کوئی پلازہ تعمیر کیا جانے والا ہو۔ میں وہاں جا پہنچا اور ورما کو تلاش کرنے میں کامیاب رہا۔ وہاں ایک دنیا مدعو تھی۔ اس لیے وریندر ورما تک پہنچنے میں دقت ضرور ہوئی۔ بہرکیف میں نے اسے ڈھونڈ نکالا اور اسے دوسرے روز اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ اس نے ہامی بھر لی۔

دوسرے روز وہ حسبِ وعدہ آیا۔ اس کے علاوہ دو چار اور بھی پرانے ہم جماعت موجود تھے۔ سب ایک دوسرے سے پُرتپاک اور پرانے وقتوں کے انداز میں ملے۔ کچھ دیر ہلکی پھلکی گفتگو چلی۔ پھر آخر وہ وقت آیا اور وریندر کی زبان پر وہ سوال آ ہی گیا جس کا نہ جانے اُسے کب سے انتظار تھا۔

وہ اچانک بولا ''یار صدیقی! اگر تم نے ایسا ہی پاکستان بنانا تھا تو تم نے ہمیں یہاں سے کیوں نکالا؟''

یہ ایسا اچانک، توقع کے خلاف اور براہِ راست سوال تھا کہ ہم سب حاضرینِ مجلس خاموش کے خاموش بیٹھے رہ گئے اور کسی کو کوئی واضح یا دوٹوک جواب نہ سوجھ سکا۔ ہم اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھے۔

پھر گفتگو کسی اور نہج پر چل پڑی لیکن یہ سوال میرے ذہن میں برس ہا برس کلبلاتا رہا۔ کئی جواب آئے اور نکل گئے لیکن سوال اٹکا رہا۔ حتیٰ کہ ایک بار ایک ادبی ادارے نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر پاکستان نہ بنا ہوتا تو آپ کہاں ہوتے؟ تب فوراً جواب ذہن میں آیا اور وہی قبول ہوا:

''ہم وہیں ہوتے جہاں آج کا بھارتی مسلمان ہے''۔

یہ سب کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ بھارتی مسلمان آج کہاں کھڑا ہے؟ لیکن ایک ناقابلِ تردید حقیقت یہ ہے کہ ہم سے بیشتر پاکستانی مسلمان بھی وہاں نہیں ہوتے جہاں وہ آج ہیں۔ بڑے سے بڑا انقلاب بھی یکساں طور پر اپنی تمام آبادی کو یکساں وسائل اور آسائشوں سے باریاب نہیں کرتا۔ کوئی امیر ہو جاتا ہے اور کوئی غربت سے پیچھا نہیں چھڑا پاتا۔

انگریزوں کی غلامی میں ہندوؤں کا یہ نعرہ زبان زدِ خاص و عام تھا: ہندو و ہم چالیس کروڑ۔ آزادی۔ آزادی۔ مسلمانوں کا نعرہ ہوتا تھا: بن کے رہے گا پاکستان، پاکستان کا مطلب

کیا لا الٰہ الا اللہ۔

ہندو چالیس کروڑ سے بڑھ کے سو کروڑ ہو گئے لیکن کیا سب آزاد اور خوشحال ہیں؟ پاکستان دس کروڑ سے کٹ کر دو ٹکڑوں میں بٹا اور اب اگرچہ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں پھر بھی لگ بھگ پچیس کروڑ ہیں۔ کیا ہم نے اپنی منزل پا لی؟ نہیں نا! لیکن یہ بات سو فیصد سچ بھی نہیں!

خاصی پرانی بات ہے جب دہلی میں ایشیائی کھیلوں کے اولمپکس ہو رہے تھے۔ اس میں پاکستان کا دستہ بھی شامل تھا۔ تب ٹی۔ وی نہیں آیا تھا۔ شام کا وقت تھا اور اس وقت کھیلوں کے سب سے اہم حصے ۱۰۰ میٹر کی دوڑ ہونے والی تھی۔ شور تھا کہ صحیح معنوں میں فلک شگاف تھا۔ یوں لگتا تھا، شور سے کان کے پردے پھٹیں نہ پھٹیں لیکن ریڈیو کے پردے پھٹ جائیں گے۔



عبدالخالق دوڑ جیت رہے ہیں

دوڑ شروع ہوئی تو دوڑنے والوں کے ہر قدم کے ساتھ شور پہلے سے بھی زیادہ بڑھتا گیا۔ لیکن سو میٹر دوڑنے میں چند سیکنڈ ہی لگتے ہیں جو ایک دم ختم ہوگئی۔

دوڑ کیا ختم ہوئی ایک دم شور بھی تھم گیا۔ ایسا تھا جیسے کسی نے آوازوں کا سوئچ آف کر دیا اور لمحے بھر کو ایسا سکوت چھایا کہ اس پر خامشی بھی فدا ہو۔ بلکہ لمحے بھر کو یوں لگا جیسے ریڈیو ٹرانسمیشن ختم ہو چکی۔ کیونکہ ساتھ ساتھ ہی کمنٹری بھی بند ہو گئی۔ پھر جس طرح خامشی طاری ہوئی تھی، شور و غلغلہ اسی شدت سے ایک دم پھر بلند ہوا اور کمنٹیٹر بھی جیسے خوابِ غفلت سے جاگ اٹھے ہوں۔

۱۰.۴ سیکنڈ...... سو میٹر کی دوڑ کا وقت ۱۰.۴ سیکنڈ تھا۔ ایشیا کا نیا ریکارڈ۔

ایشیا کا نیا تیز ترین انسان کون تھا......؟

پاکستان کا عبدالخالق۔

حوالدار عبدالخالق ایک دم سب سے اہم کھلاڑی بن گیا۔ پاکستان کے اس ایک غیر معروف کھلاڑی نے اچانک ایشیا کے سارے کھلاڑیوں کو پیچھے چھوڑ کر تمام تماشائیوں کو حیران و ششدر کر ڈالا...... اس طرح کہ وہ سب لب بہ مہر ہو کر رہ گئے لیکن آخر سب کو اس ناقابلِ یقین حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔

میجر سرفراز ملک اس زمانے میں سپورٹس سیکرٹری تھا۔ وہ کالج کے زمانے میں میرا ہم جماعت اور دوست تھا۔ وہ ایشیائی کھیلوں کے اس دستے کے ساتھ ان کھیلوں میں بطور منیجر شامل تھا۔ جب وہ واپس آیا اور ملاقات ہوئی تو میں نے اُسے اس شام کے اپنے احساسات سے آگاہ کرتے ہوئے سوال کیا کہ جب حوالدار عبدالخالق نے ایشیائی ریکارڈ قائم کیا اور سارے اسٹیڈیم پر سکوت چھا گیا تب اس کے اپنے احساسات کیا تھے؟

اس نے بتایا ''وہ تو جو تھے سو تھے سب سے اہم اور قابلِ ذکر وقت تو وہ تھا جب نتیجے کا سرکاری طور پر اعلان ہوا اور عبدالخالق وکٹری سٹینڈ پر آ کر کھڑا ہوا۔ تب اعلان ہوا کہ ایشیا کا نیا ریکارڈ قائم کرتے ہوئے جیتنے والا پاکستان کا عبدالخالق ہے۔ ساتھ ہی پاکستان کا جھنڈا بلند ہونا شروع ہوا۔ پاکستان کا قومی ترانہ بھی بجنے لگا۔ نہ صرف یہ کہ میرے علاوہ سب احترام میں کھڑے ہوگئے بلکہ بلااختیار میری زبان سے قومی ترانے کے الفاظ از خود ادا ہونے لگے۔

"اسی وقت میری آنکھوں سے خود بخود آنسو بھی بہہ نکلے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں کون ہوں؟ میرا تشخص کیا ہے؟ میرے لیے باعث مسرت اور فخر کیا امر ہے؟ لوگ بڑھ بڑھ کر مبارکیں کیوں دے رہے ہیں؟ تب اچانک یہ احساس دل میں اجاگر ہوا کہ میں آج جہاں ہوں......عبدالخالق جہاں ہے......وہ سب اپنے ملک کی بدولت ہے۔ تبھی بے اختیار زبان سے نکلا......پاکستان زندہ باد۔"

میجر سرفراز کی گفتگو سن کر مجھے بھی اس سوال کا جواب مل گیا کہ ہم نے پاکستان کیوں بنایا۔ ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء، ۱۹۹۸ء ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ اور ایسی تمام نمایاں تاریخیں اسی جذبے کا اعادہ کرتی ہیں۔

ان پاکستانی لوگوں کے نام بھی لیجیے، بلا تعصب، بلا جھجک، جنھوں نے اپنے کارناموں سے ملک وقوم کا نام یوں روشن کیا کہ ہم فخر سے سر اٹھانے کے قابل ہوئے۔ جب ہم اپنی خامیوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف غور کرتے ہیں، تو پھر ہمیں اپنی خوبیوں، صلاحیتوں اور اعلیٰ کارکردگیوں کو بھی احاطہ خیال میں لانا چاہیے۔

غلطیاں بھی ہماری اپنی تھیں اور کامرانیاں بھی اپنی ہیں۔ اگر ہم سب نے غلطیوں سے کچھ سیکھا، ان کا تدارک کیا اور اپنی خوبیوں کو سراہا اور بڑھایا تو ایک دن یہ کہنے والے کہہ سکیں گے اگر پاکستان نہ بنتا تو ہم چالیس کروڑ مسلمان (مع بھارتی مسلمانوں کے) بڑے بدنصیب ہوتے اور بجائے پاکستان زندہ باد کے وندے ماترم کا راگ الاپ رہے ہوتے۔ اس طرح میرے دوست ورِیندر کمار ورما (مرحوم) اور ان سب کو جو پاکستان کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں، منہ توڑ جواب بھی مل سکے گا۔

راہنما الفاظ

☆ کوئی آپ کی بات سننا بھی گوارا نہ کرے اُس سے بڑی آپ کی توہین اور کیا ہوگی۔
☆ بات الفاظ کی نہیں لہجے کی ہوتی ہے۔ ☆ انسان کی اصلیت طیش کی حالت میں سامنے آتی ہے۔
☆ زندگی میں تجربات کیجیے۔ انسان تجربے ہی سے سیکھتا ہے۔
☆ ہٹ دھرمی پھیکے مشروب کی طرح ہے۔ یہ نہ آپ کو کچھ دے گی اور نہ دوسروں کو۔ کسی کو قائل کرنے کے لیے دلائل استعمال کریں۔ یہ زیادہ مؤثر طریقہ ہے۔
☆ ذہن میں اچھے خیالات کو جگہ دیجیے۔ آپ خیر خواہ دوستوں میں رہیں گے۔
☆ اپنے اردگرد کے بُرے ماحول پر چیخنے چلانے سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ دھیمے لہجے میں دوستوں کے درمیان اس کے تدارک کے لیے بولیں گے تو اثر بھی ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس خراب ماحول سے خود کو بچائیں۔ آپ ایک خاندان بچالیں گے۔
☆ کچھ باتیں کتابی ہوتی ہیں وہ کتابوں ہی میں اچھی لگتی ہیں۔ انھیں افسانوں سے حقیقتوں میں ڈھالنے کی بے سود کوشش میں اپنی صلاحیتیں اور وقت ضائع مت کریں۔
☆ اس جہاں میں اللہ تعالیٰ نے دولت مند بننے کے جائز طریقے بھی رکھے ہیں، انھیں تلاش کیجیے۔
☆ دیکھیے! محسوس کیجیے، تجزیہ کیجیے، نتائج سے خود کو آگاہ کیجیے اور گزر جائیے۔ کیونکہ ابھی آپ کے اس عمل میں داخل ہونے کے قابل نہیں۔



میری پہچان پاکستان

پروفیسر حمید عسکری

[illegible] پاک کے ایک نامور سپوت کی [illegible] انگیز نظموں کا دل افروز انتخاب

پروفیسر صاحب کے ساتھ انتالیس سال تک شریکِ سفر رہی۔ وہ بڑے صاف گو اور سادہ مزاج تھے۔ ان کا اندازِ بیان مدلل اور کام کرنے کا اسلوب سائنسی اور عملی تھا۔ بہت مستعد اور واضح نویس شخص تھے۔ طبیعت میں حساسیت بہت تھی۔ وقت سے پہلے پنشن لے لی۔ اکثر معاشی مشکلات کا ذکر آٹے کے حوالے سے کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ جب میں سو روپے تنخواہ لیتا تھا، آٹا سستا تھا اور میں بادشاہ تھا۔ اب میں ڈیڑھ ہزار روپے تنخواہ لیتا ہوں مگر آٹے کے حساب سے میری تنخواہ سو روپے سے بھی کم ہے۔

صحیح مسلمان تھے۔ اسلام اور پاکستان کے شیدائی۔ کہا کرتے کہ اگر اسلام دنیا میں نہیں آتا تو سائنس کا آفتاب بھی طلوع نہ ہوتا۔ نماز کے سخت پابند تھے۔ تلاوتِ قرآن سے غم و اندوہ کا علاج کیا کرتے تھے۔ عاشقِ رسول ﷺ اور آلِ رسول ﷺ۔ آخر عمر انھوں نے اپنی زندگی قرآن مجید کے اردو ترجمے کے لیے وقف کر دی۔ جس دن ان کی وفات ہوئی، قرآن مجید کی آخری سورہ مبارکہ کا ترجمہ کیا، اپنی پنسل ترجمے کے اندر رکھ دی اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

پروفیسر حمید عسکری ۱۰ اگست ۱۹۰۹ء کو بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم ایس۔ ای۔ سکول بہاولپور، اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔ زمیندارہ کالج گجرات، گورنمنٹ کالج جھنگ، گونمنٹ کالج فیصل آباد اور گورنمنٹ کالج لاہور میں طبیعات کے استاد رہے۔ انہیں عربی، فارسی، ہندی، انگریزی اور اردو پر زبردست عبور تھا۔ اردو اساتذہ اور انگریزی کلاسیکل شعراء کا کلام ازبر تھا۔ موسیقی کے اسرار و رموز سے خوب واقف تھے۔ فرصت میں ہارمونیم بجاتے۔

پروفیسر صاحب نے سائنسی تصانیف میں غیر معمولی کام کیا۔ پہلے سائنس دان تھے جنہوں نے فنی اور سائنس کے مفتی

درجے کی تحقیقاتی کتب قومی زبان اردو میں لکھیں۔ سائنسی کتب کے پہلے مصنّف تھے جنھوں نے مسلسل تین سال ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک پاکستان رائٹرز گلڈ، نیشنل بینک آف پاکستان کے ادبی انعامات حاصل کیے۔ پہلے سائنس دان تھے جنہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ سادہ، سہل اور سلیس اردو میں کیا۔ ان انعامات کے علاوہ ۱۹۴۹ء میں ان کی کتاب ''جدید آلاتِ جنگ'' کو پنجاب یونیورسٹی سے انعام ملا۔

ان کی ایک خصوصیت تھی کہ صلے کی تمنا کے بغیر انتہائی خاموشی سے دن رات تصنیف وتالیف میں مصروف رہے اور اسی خاموشی سے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف کی محض فہرست دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے تنِ تنہا اردو کی خدمت کی جو بہت سے ادارے، تنظیمیں اور گلڈ انجام نہیں دے سکے۔

جدید علوم میں دسترس رکھنے کے علاوہ مرحوم کو قدیم اسلامی علوم اور بالخصوص سائنس کے مختلف شعبوں سے بھی گہرا شغف تھا۔ انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے ایک تو جلیل القدر مسلمان سائنس دانوں سے روشناس کروانے کی کوشش۔ دوسری طرف مرحوم نے یہ کوشش بھی جاری رکھی کہ اردو زبان کے دامن کو سائنسی کتب سے مالا مال کر دیا جائے کیونکہ نئی پود اس کے بغیر جدید علوم پر عبور نہیں حاصل کر سکتی۔ پروفیسر صاحب کی لاتعداد اور ضخیم سائنسی کتب اردو زبان کے مخالفوں اور بدخواہوں کے اس دعوے کی تکذیب کرتی ہیں کہ ہماری قومی زبان میں اتنی وسعت اور صلاحیت نہیں کہ وہ دورِ حاضر کے ترقی یافتہ سائنسی موضوعات کا بوجھ سنبھال سکے۔

پروفیسر صاحب کی سائنسی تصنیفات:

۱۔ جدید آلاتِ جنگ ۱۹۴۹ء (پنجاب یونیورسٹی انعام یافتہ)' ۲۔ برق ومقناطیس ۱۹۶۴ء (پاکستان رائٹرز گلڈ، نیشنل بنک انعام یافتہ)' ۳۔ مادے کے خواص ۱۹۶۵ء (پاکستان رائٹرز گلڈ، نیشنل بینک انعام یافتہ)' ۴۔ حرارت ۱۹۶۶ء (پاکستان رائٹرز گلڈ، نیشنل بینک انعام یافتہ)' ۵۔ نامور مس سائنس دان' ۶۔ نامور مغربی سائنس دان' ۷۔ کیمیا کے روما ۸۔ توپ سے ایٹم بم تک' ۹۔ کوانٹم تھیوری' ۱۰۔ نظریہِ اضاف ۱۱۔ جدید طبیعات' ۱۲۔ ہندسی روشنی

پروفیسر صاحب نے ۱۲/اگست ۱۹۷۱ء کو وفات پائ مرحوم نے تحریک پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ذ میں ان کی قومی شاعری کا انتخاب پیش ہے۔

۱۴/اگست

احیائے دیں کا دہر میں ساماں ہوا تو ہے
بیدار اس صدی کا مسلماں ہوا تو ہے
حق کی حقیقتوں کا بھی ہو جائے گا ظہور
باطل کا خوابِ خوابِ پریشاں ہوا تو ہے
آزادیِ حیات کی منزل پرے سہی
آزادیِ حیات کا امکاں ہوا تو ہے
بگڑا مزاج دیکھ کے عصرِ جدید کا
مومن کو کچھ اشارہِ یزداں ہوا تو ہے
جمہور کے بلند ارادوں کو بھانپ کر
سلطانِ وقت سَر بہ گریباں ہوا تو ہے
مغرب کی دَست بُرد سے بچنے کا ولولہ
اقوام ایشیا میں نمایاں ہوا تو ہے
مل جائے گی بلندیِ کردار بھی اِسے
خالی توہمات سے انساں ہوا تو ہے
پھر شوقِ رنگ وبو سے ہے ذروں میں اضطراب
پھر آمدِ بہار کا عنواں ہوا تو ہے
عالم کے چار دانگ میں پھیلے گا اِس کا نور
مشرق میں ایک چراغ فروزاں ہوا تو ہے

حق کی نصرت

(۱۹۴۶ء میں پاک وہند کی آخری متحدہ اسمبلی کا چ تھا جس میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ساری نشتیں ج پاکستان کی پہلی لڑائی شان دار طریقے سے جیت لی تھی۔)

۱۹۴۶ء

ہند کی مرکزی مجلس کا جو حال ہی میں یہ چناؤ ہوا ہے
کھول دِیں اس نے سب کی آنکھیں کر دیا اک عالم کو بینا
ہر حربے سے مسلمِ ہندی کو زک پہنچانے کی خاطر
ہو گئے تھے یک جاں دو قالب: گاندھی نہرو، پنت اور برلا
کہتے تھے مسلم لیگ نے جرأت کی جو ہمارے منہ آنے کی
رکھ دیں گے ہم اس کو کچل کر، اف یہ رعونت اف یہ ارادہ
تھیلیاں لے کر سیم وزر کی پھرتے اپنے ووٹوں کی طلب میں
کوچہ بہ کوچہ، خانہ بہ خانہ، شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ
ہاتھ میں ان کے ترنگے جھنڈے، لب پر یک رنگی کے دعوے
جی میں مگر تھی فکر یہ ہر دم ٹوٹے نہ بھارت ورش اکھنڈتا
کام نہ لیکن کچھ بھی آئی ان کی سیاست ان کی دولت
ہار گئے سب ان کے پٹھو ایک بھی ان میں سے نہ جیتا
حق کی اس نصرت پر مجھ کو یاد آئی قرآن کی آیت
جاء الحق و زحق الباطل اِن الباطل کانَ زَھوقا

پاکستان

ہمیں عزیز نہ کیوں ہو فضائے پاکستان
عطائے خاصِ خدا ہے عطائے پاکستان
ہم اپنے خون سے اس سرزمیں کو سینچیں گے
ہماری زندگیاں ہیں برائے پاکستان
بہت مصر تھے وہ اس پہ کہ مان جائیں ہم
پلان سولہ مئی کا بجائے پاکستان
مگر ہمارا یہ عزمِ صمیم تھا کہ ہمیں
قبول ہو نہیں سکتا سوائے پاکستان

پاکستان کا دروازہ واہگہ

(۱۹۴۸ء)

مرے ہم دم مجھے اس سرزمیں پر سر جھکانے دے
یہاں کے سبزۂ نورُستہ پر آنکھیں بچھانے دے
یہاں کے ذرے ذرے کو حریمِ دل بنانے دے
یہاں آ کر گزشتہ سب مصائب بھول جانے دے
ملی مدت کے بعد اک امن کی جا گہ، یہی تو ہے
جو پاکستان کا دروازہ ہے واگہ، یہی تو ہے
درِ الطافِ حق اس جا ہمیشہ باز ہے ہم دم
یہاں کی خاک میں اکسیر کا انداز ہے ہم دم
یہی ہے وہ زمیں جس پر فلک کو ناز ہے ہمدم
یہیں سے سرزمینِ پاک کا آغاز ہے ہم دم
کھُلا ہے رحمتوں کا باب واگے سے کراچی تک
نواکھالی سے تا اکیاب، واگے سے کراچی تک
ہوئی جب مومنوں پر تنگ ہندوستاں کی پہنائی
تو اِن ہجرت نصیبوں نے یہیں آ کر اماں پائی
بھری تھی اِس فضا میں ایسی تاثیرِ مسیحائی
نظر آئی جونہی واگے کی سرحد جاں میں جاں آئی
تعلق اس مقامِ جاں فزا سے ہم کو گہرا تھا
کہ اپنا قافلہ بھی ایک دن اس جا پہ ٹھہرا تھا
یہ واہگہ جس کا شہرہ روس سے لے کر ہے تا جاوا
یہ واہگہ جو ہے معمارانِ پاکستان کا آوا
یہ واہگہ آج جو ہے دوستوں کا ملجیٰ و ماویٰ
عدو کے واسطے بننے کو ہے آتش فشاں لاوا
یہ لاوا جانبِ مشرق ہوا جس دن رواں ہم دم
اجڑ جائیں گی پل میں ظلم کی سب بستیاں ہم دم

اپنے وطن میں سب کچھ ہے

اے وطن کے پاک انسان
صاحب دل' اہلِ ایمان
اپنے وطن کی اونچی شان
اپنے وطن پر ہم قربان
اپنے وطن میں سب کچھ ہے
پٹ سن بھی ہے رُوئی بھی
گیس کا مخزن سُوئی بھی
حق گوئی حق جوُئی بھی
امن بھی اور یک سُوئی بھی

اپنے وطن میں سب کچھ ہے

گندم کے خرمن بھی ہیں
پھولوں کے گلشن بھی ہیں
بانس کے سُندر بن بھی ہیں
کھینچتے جو دامن بھی ہیں
اپنے وطن میں سب کچھ ہے

دودھ دہی اور لسی بھی
دریا، نہر اور کشتی بھی
پیار کی لمبی رسّی بھی
سوہنی، ہیر اور سسّی بھی
اپنے وطن میں سب کچھ ہے

خدمت کا احساس بھی ہے
شرم و حیا کا پاس بھی ہے
مستقبل کی آس بھی ہے
سندھ کا زریں طاس بھی ہے
اپنے وطن میں سب کچھ ہے

جوٹ کی مصنوعات یہاں
جراحی آلات یہاں
چائے کے باغات یہاں
خوش حالی دن رات یہاں
اپنے وطن میں سب کچھ ہے

ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

سرزمینِ کفر سے فتنوں کا پھر اٹھا غبار
آ رہے ہیں لشکرِ باطل قطار اندر قطار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

اِن کڑے ایام میں حق کی حمایت کے لیے
تجھ پہ ہی رہ رہ کے پڑتی ہے نگاہِ کردگار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

تیرے نظم وضبط میں آنے نہ پائے کچھ خلل
ہے زمانہ ناموافق ہے فضا ناسازگار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

پل رہا ہے گود میں باطل کے اک آشوبِ نو
مانند جس کے سامنے ہے فتنۂ قومِ تتار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

الحذر اِن مار ہائے آستیں سے الحذر
جن کا مسلک ہے نفاق و افتراق و انتشار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

ان کی مُسلم دشمنی کا اور کیا ہو گا ثبوت
جن کے دل کا حال ہے اُن کے عمل سے آشکار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

اے زمانے میں خدا کے آخری پیغام گیر
اے جہاں میں حریت کے اولیں سرمایہ دار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

پھوٹ نکلی ہے افق سے علم و حکمت کی کرن
ہو رہا ہے پردۂ شب ہائے غفلت تار تار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

دل وہی دل ہے کہ ہو جس میں شہادت کی تڑپ
ہاتھ ہے وہ ہاتھ جو رکھتا ہو تیغِ آب دار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

سن کہ بدر و خیبر و خندق سے آتی ہے صدا
لافتی اِلا علی لا سیف اِلا ذوالفقار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

پھر اترنے کو ہیں گردوں سے فرشتوں کے جنود
نصرتِ حق ہے گلے ملنے کو تجھ سے بے قرار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

ہے تصرف میں ترے دنیا و مافیہا تمام
حق نے بخشا ہے تجھے کون و مکاں پر اختیار
ہوشیار اے مردِ مومن ہوشیار

دغاباز

اسمتھ فیٹ

ایک کائیاں عورت کی داستانِ حیرت، وہ دوسروں کو جُل دینا جانتی تھی

ٹیکسی ڈرائیور اتنا احمق نہیں ہوتا جتنا نظر آتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ صرف میٹر ہی پڑھنا جانتا ہے؟ نہیں! وہ چہرے بھی پڑھ سکتا ہے۔ خصوصاً جب دو مرد ہوں اور ایک عورت ہو یا ایک مرد ایک عورت ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ صرف آگے کی طرف سڑک اور ٹریفک سگنل ہی کو دیکھتا ہے؟ نہیں، وہ آئینے کی مدد سے پیچھے کی طرف بھی دیکھتا ہے۔ وہ صرف سامنے کی گاڑیوں کا ہارن ہی نہیں سنتا، ہلکی سے ہلکی سرگوشی بھی سن لیتا ہے۔

میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ گزشتہ بیس سال سے لندن میں ٹیکسی چلا رہا ہوں۔ یہ ایک خطرناک پیشہ ہے کیونکہ مجرموں، بدمعاشوں، قاتلوں اور اغوا کرنے والوں سے شب وروز واسطہ پڑتا ہے۔ کتنے ٹیکسی ڈرائیور اس عظیم شہر میں ہر روز لٹتے ہیں بلکہ اپنی ٹیکسی سے محروم ہو جاتے ہیں لیکن یہ ایک مزیدار پیشہ بھی ہے۔

تجارت اپنے نفع، ملازمت اپنی ڈیوٹی، جوانی دیوانی اپنی رنگ رلیوں کے لیے ٹیکسی کی محتاج ہے۔ یہ چار پہیے چلتے ہیں تو زندگی چلتی ہے، وقت چلتا ہے، جدید دنیا چلتی ہے۔ لندن جیسے شہر میں ہر ٹیکسی ڈرائیور کو ہر روز ایک ناقابل فراموش واقعہ سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ کبھی رومان، کبھی ایڈونچر، کبھی جاسوسی، کبھی تجارتی، کبھی سیاسی۔ میرے ذہن میں بھی سینکڑوں دلچسپ اور دل گداز واقعات محفوظ ہیں۔ افسوس کہ مجھے افسانہ نویسی نہیں آتی۔

پھر ایک تازہ خلش ہے جو چبھ رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سنا کر بوجھ ہلکا کروں۔ یہ واقعہ حال ہی میں پیش آیا ہے۔ ایک مقامی فیشن ایبل ہوٹل سے ایک مرد اور عورت میری ٹیکسی میں سوار ہوئے۔ یقیناً وہ میاں بیوی نہ تھے۔ یقیناً وہ میاں بیوی

بننے والے بھی نہ تھے۔ نہیں نہیں، وہ مجرم پیشہ بھی نہ تھے۔ محکمہ جاسوسی سے بھی ان کا تعلق نہ تھا۔ مرد کی عمر چالیس سال کے قریب تھی اور عورت کی تیس سال کے قریب، مرد کا چہرہ اور ڈیل ڈول صحت مند تھا۔ عورت کمزور تھی اور ذرا پیلی۔ دونوں ایک فیشن ایبل ہوٹل سے بانہوں میں بانہیں ڈالے نکلے تھے لیکن شراب کے نشے کا کوئی اثر ان پر نہ تھا۔

میں نے نہایت معصوم بلکہ نادان شکل بنائی اور پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''ہیتھرو ائیر پورٹ'' مرد نے کہا۔ ''اوہ دس بج کر دس منٹ ہو رہے ہیں'' اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''اور طیارہ گیارہ بج کر پچاس منٹ پر اڑ جائے گا۔ ڈرائیور! ذرا تیز، ٹپ کی فکر نہ کرنا۔''

ائیر پورٹ کا راستہ تیس منٹ کا بھی نہ تھا۔ پرواز میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا پھر ایسی جلدی کیوں؟ میں نے اپنے پرانے دوست بیک ویو مرر (پیچھے دکھانے والے آئینہ) سے مدد مانگی اور رفتار ذرا ہلکی کر دی۔

''ڈرائیور! ذرا تیز، مجھے جلد پہنچنا ہے۔''

''جناب! ٹریفک بہت گنجان ہے۔ آگے بڑی سڑک آنے دیجیے۔''

عورت خاموش تھی، اسے کوئی جلدی نہ تھی۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی، کہیں یہ اسمگلنگ یا اغوا کا کیس تو نہیں؟ مگر ایسی کوئی بات نظر نہ آئی۔ بہرکیف ان دونوں کی سرگوشی سے گتھی کسی قدر سلجھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ میں آئینے سے دیکھ رہا تھا کہ دونوں روٹھے ہوئے انداز میں ایک دوسرے سے الگ ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے ان دونوں کی سرگوشی سننے کے لیے ٹریفک کی لال روشنیوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور ٹیکسی جگہ جگہ کھڑی ہونے لگی۔

دونوں کی گفتگو نے مجھے بتایا کہ مرد سات سال مشرق وسطیٰ میں رہ کر ابھی ابھی لندن آیا ہے۔ عورت اس کی پرانی محبوبہ ہے اور ان دنوں کسی ہسپتال سے وابستہ شاید لیڈی ڈاکٹر ہے یا نرس یا میٹرن۔ مزید گفتگو نے مجھے بتایا کہ مرد دبئی میں ملازم ہے جہاں وہ عورت کو شادی کر کے لے جانا چاہتا ہے۔

معاملات اب اندھیرے سے روشنی کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ بیمار اور قدرے بدصورت عورت کو بیوی بنا کر لے جانے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ کیا وہ دولت مند تھی؟ مگر ایسا ظاہر نہ تھا۔ پھر؟ اوہو ہو! اب میں نے جانا۔ دبئی میں لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں کی بڑی مانگ ہے اور یہ مرد اسے بیوی بنانے کے لیے کیوں پریشان تھا؟ تاکہ اپنے لیے گراں قدر تنخواہ کمانے کا راستہ پیدا کر سکے۔

''لاری!'' نہایت عاجزانہ لہجے میں وہ مرد سے مخاطب ہوئی۔ ''خدا کے لیے مجھے اس طرح چھوڑ کر نہ جاؤ۔ کیا تم اپنی کمپنی سے اپنا تبادلہ لندن نہیں کروا سکتے؟''

''نہیں''۔ مرد نے جواب دیا۔ ''اب میں دبئی نہیں چھوڑ سکتا۔ وہاں میں نے ایک خوبصورت مکان بنوا لیا ہے۔ کچھ کمپنیوں میں حصص خرید لیے ہیں۔ وہاں کی سوسائٹی میں اپنے لیے ایک معزز مقام پیدا کر لیا ہے۔ وہاں میری کمپنی کا ہیڈ آفس ہے۔ ہیڈ آفس میں رہنے سے ترقی کے مواقع زیادہ ملتے ہیں۔ ہاں تم لندن چھوڑ سکتی ہو۔ آخر کچھ تو بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ تین گھنٹے تک ہوٹل میں بحث کرنے کے باوجود ہم لوگ ضد کے اسی مقام پر ہیں۔''

''تم تو جانتے ہی ہو کہ میں میڈیکل سائنس میں آج کل ڈاکٹر لانگ اسکاٹ کے ماتحت اہم نوعیت کی تحقیق کر رہی ہوں۔ جب تک مجھے سند نہیں مل جاتی، میں لندن چھوڑ نہیں سکتی۔ بس ایک سال کی بات ہے۔''

''پھر کیا تم ایک سال کے بعد میرے پاس دبئی آ جاؤ گی؟ ڈرائیور! وقت جا رہا ہے۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''کیا تم تیز نہیں جا سکتے؟''

''بس اب بڑی سڑک آنے والی ہے۔ پھر ہم لوگ دس منٹ میں ائیر پورٹ پہنچ جائیں گے۔'' میں نے اسے تسکین دی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ لندن میں تازہ وارد ہے۔ اسے کیا خبر کہ بڑی سڑک کہاں ہے۔ ''بیلی۔'' مرد نے پھر سرگوشی شروع کر دی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جب میں مشرق وسطیٰ جا رہا تھا تو تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے شادی کر لو گی۔ اب جب کہ میرے پاس خوبصورت اور آرام دہ گھر ہے۔ ایک اعلیٰ ملازمت کر رہا ہوں اور کافی رقم بھی جمع کر لی ہے تم شادی سے انکار کر رہی ہو۔ دیکھو بیلی! ہم دونوں ابھی تک جوان ہیں۔ لیکن اب یہ جوانی جانے والی ہے۔ ہم دونوں ابھی تک کنوارے ہیں لیکن کب تک؟ تم بھی کسی نہ کسی سے شادی کر لو گی اور میں بھی۔ مستقبل کا خطرہ کیوں مول لیتی ہو۔ تم اب بھی راضی ہو جاؤ تو میں پرواز چھوڑ دوں۔''

بیلی نے کہا ''لاری! تم پرواز مت چھوڑو۔ تمہارے مستقبل سے میرا مستقبل وابستہ ہے۔ مجھے یہ تحقیق کر لینے دو۔ ہاں کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میری تعلیم کے لیے مجھے معقول خرچہ بھیج دو تاکہ میں ناکام نہ ہو جاؤں اور ایک سال بعد بہترین سند لے کر تمہارے پاس پہنچوں۔ پھر میں پریکٹس کروں گی اور تم نوکری۔''

لاری نے دو منٹ غور کیا اور پھر بولا۔ ''اچھا بیلی! میں تین ہزار پونڈ ماہوار بھیج دیا کروں گا۔ اور تمہارا منتظر رہوں گا۔''

بیلی نے کہا ''ہم دونوں کو جذباتی نہیں بلکہ عملی بننا چاہیے''۔ ائیر پورٹ آ گیا تھا۔ ٹیکسی رکی۔ مرد اترا۔ اس کے پیچھے عورت بھی اتری۔ سامان اتارا گیا۔ مرد نے کرایہ اور ٹپ دینا چاہا لیکن عورت نے فوراً روک دیا۔ ''نہیں نہیں کرایہ میں دوں گی۔ مجھے اسی ٹیکسی سے واپس شہر جانا ہے۔''

پھر بھی مرد نے مجھے دو پونڈ ٹپ دے دیے۔ اس نے گھڑی دیکھی، وقت قریب تھا۔ پھر عورت سے الوداعی مصافحہ کیا۔ ''میں ضرور رقم بھیج دوں گا اور تمہارے انتظار میں ایک سال مزید کنوارا رہوں گا۔''

''اور میں بھی کنواری رہوں گی۔''

وہ ٹرمینل کی طرف چلا گیا اور فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

عورت پندرہ منٹ تک ادھر ادھر ٹہلتی گھومتی رہی۔ میں حیران ہوتا رہا کہ وہ وقت کیوں ضائع کر رہی ہے۔ مجھے بھی جلدی تھی۔

اچانک ایک دوسرا مرد وہیں کہیں سے برآمد ہوا۔ عورت اس سے ایسے ملی گویا بہت پرانا بے تکلف ملاقاتی ہو۔ پھر اسے ساتھ لے کر ٹیکسی میں آ بیٹھی۔ ''ڈرائیور! شہر واپس چلو۔ اسی ہوٹل میں۔''

میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ میاں بیوی ہیں۔ عورت نے سرگوشی میں اسے سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح نہایت چالاکی و مکاری کے ساتھ اس نے کم از کم ایک سال کے لیے تین ہزار پونڈ ماہوار کی مزید آمدنی پیدا کر لی۔

''میں جانتا ہوں کہ تم ایکٹنگ کی ماہر ہو۔'' شوہر نے کہا اور مسکرانے لگا۔

متفق

ایک سیاسی لیڈر دوسرے لیڈر سے کہہ رہے تھے۔ ''بھئی تم خواہ مخواہ اپنی تقریر پر اتنی محنت کرتے ہو۔ اتنے لوگوں سے لکھواتے ہو، رد و بدل کرتے ہو پھر فائنل مسودہ تیار کر کے اسے یاد کرتے ہو۔ مجھے دیکھو...... میں تو مجمع کے سامنے جاتا ہوں اور بغیر سوچے سمجھے بولنا شروع کر دیتا ہوں۔''

''آپ کی تقریریں سننے والے آپ کے خیال سے بالکل متفق ہیں۔'' دوسرے سیاسی لیڈر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔



اسرائیل اور بھارت کا گٹھ جوڑ

ذیشان محمد بیگ

مسلم حکمرانوں کی نااتفاقی سے دنیا میں دو مکار ترین اسلام دشمن طاقتوں کو کھلے عام یکجا ہونے کا سنہری موقع مل گیا

یہ انیس سو اسی کا عشرہ تھا۔ رات کے بارے بج چکے تھے۔ بھارتی ریاست گجرات کے جمان گڑھ ائیر فیلڈ پر اسرائیلی جہازوں کا ایک سکوارڈن پاکستان کے کہوٹہ ایٹمی پلانٹ پر حملہ کرنے تیار کھڑا تھا۔ منصوبہ بہت بے داغ تھا۔ پاکستان کے ایک مسافر بردار جہاز نے صبح سویرے بحرِ ہند کے اُوپر سے گزر کر اسلام آباد جانا تھا۔ پلان یہ تھا کہ اِس جہاز کو مار گرایا جائے۔ پھر اسرائیلی لڑاکا طیارے ایک گروہ کی شکل میں پرواز کرتے پاکستان میں داخل ہوں تاکہ پاکستانی ریڈاروں کو دھوکا دیا جا سکے۔ وہ یہ سمجھیں کہ شاید یہ وہی بڑا مسافر بردار جہاز ہے۔ پھر اسرائیلی لڑاکا طیارے کہوٹہ پر بمباری کر کے اُسے تباہ کر ڈالیں اور وہاں سے سیدھے جموں کشمیر پہنچ ری فیولنگ کروا کر واپس اسرائیل نکل جائیں۔

لیکن دشمنوں نے پاکستان کے محافظوں کی چوکسی کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ پاکستان کی مایہ ناز خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی نے حملے سے صرف چند گھنٹے پہلے حملے اور سازش کا سراغ لگا لیا تھا۔ رات بارہ بجے ہی اُس وقت کے صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کو اطلاع ملی۔ جنرل ضیاء نے ساری صورتِ حال کا تیزی سے جائزہ لیا اور فوری فیصلہ کیا کہ حملے کو روکا نہ جائے بلکہ ناکام بنا دیا جائے تاکہ پاکستان کو جوابی حملے کا جواز مل جائے۔ فوراً ہی ایک بھرپور جوابی حملے کا پلان بنا لیا گیا۔ پاکستانی ائیر فورس کے تین دستے تشکیل دیے گئے۔

پہلے کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ اسرائیلی جہازوں کے حملے کو ناکام بنائے اور اُن کو مار گرائے۔ (عرب، اسرائیل جنگ میں پاکستانی پائلٹ بہت مہارت سے یہ کام انجام دے چکے تھے)۔ دوسرے دستے کو انڈیا کے بھابھا نیوکلیئر پلانٹ تباہ کرنے کا ٹاسک ملا۔ تیسرے دستے کو صحرائے النقب (Negev) میں واقع اسرائیل کا نیوکلیئر پلانٹ تباہ کرنا تھا۔ لیکن اسرائیل پر

حملے میں مسئلہ یہ تھا کہ پاکستانی جہاز وہاں ری فیولنگ نہ کر پاتے اور اِن کا راستے میں تباہ ہو جانا لازمی تھا۔ یعنی واپسی ناممکن تھی اور یہ ایک فدائی مشن تھا۔

یہ مشن مکمّل کرنے کے لیے چار جوانوں کی ضرورت تھی۔ جب ائیر فورس کے جوانوں سے پوچھا گیا تو دس جوان فوراً تیار ہو گئے۔ اُن میں سے چار کا انتخاب کرنے کے لیے قرعہ اندازی کرنا پڑی۔ ہر جوان یہ اعزاز حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے عزم و ہمت، قوتِ فیصلہ اور جنگی حکمت عملیوں سے خوف زدہ بھارتی جرنیل اِس حملے کے حق میں نہیں تھے اور اِس کو خودکشی قرار دے رہے تھے۔ اِن کو قائل کرنے کے لیے اسرائیل اور اُس وقت کی بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کو بہت محنت کرنا پڑی۔

جنرل ضیاء اور پاک فضائیہ شدت سے حملے کے منتظر تھے۔ وہ اِسے عالمِ اسلام کے دو بڑے دشمنوں کو اُن کی ایٹمی قوت سے محروم کرنے کا سنہرا موقع سمجھ رہے تھے۔ امریکی مصنوعی سیاروں نے پاکستانی لڑاکا طیاروں کی غیر معمولی نقل و حرکت کو نوٹ کیا اور فوراً اسرائیل اور انڈیا کو آگاہ کر دیا۔ اِس پر انہوں نے نہایت بھونڈے انداز میں اپنے مشن سے پسپائی اختیار کر لی اور اِس کو چھپایا بھی نہ جا سکا۔ نتیجتاً پوری دنیا میں دونوں کی سُبکی ہوئی۔ تب پاکستان نے اسرائیل کو خبردار کیا کہ نہ پاکستان عراق ہے اور نہ ہی پاکستانی فوج عراقی فوج ہے (اِس واقعے سے چند سال پہلے عراق کا ایٹمی ری ایکٹر اسرائیل ایسے ہی ایک آپریشن کے ذریعے تباہ کر چکا تھا)۔ آئندہ ایسی کسی بھی مہم جوئی کو اسرائیل کے لیے ایک بھیانک خواب میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

۱۹۹۰ء میں بھی جب حکومتِ پاکستان کو یہ اطلاعات ملیں کہ بھارت اور اسرائیل نے امریکا کے ساتھ مِل کر پاکستانی ایٹمی تنصیبات تباہ کرنے کا مشترکہ منصوبہ بنایا ہے تو حکومت نے نئی دہلی کو پیغام بھیجا ''اگر پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ ہوا تو اُس کا ذمہ دار بھارت کو ٹھہراتے ہوئے بھرپور جوابی کاروائی کی جائے گی۔'' بعدازاں امریکی سیٹلائٹ سے لی گئی تصاویر سے یہ انکشاف ہوا کہ پاکستان نے ایٹمی اسلحے سے لیس ایف سولہ طیاروں کا ایک سکوارڈن ائیر بیس منتقل کر دیا ہے جنھیں حکم ملتے ہی بھارتی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کر دینا تھا۔ اِس انکشاف کے بعد دشمن طاقتیں پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ کرنے سے باز رہیں۔

☆☆☆

بھارت اور اسرائیل' دنیا میں یہ دو ممالک ایسے ہیں جنھوں نے اسلام کے نام پر بننے والے پاکستان کو کبھی قبول نہیں کیا۔ ''دشمن کا دشمن، دوست ہوتا ہے'' کے محاورے کے مصداق آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ہمیشہ پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے ہیں۔

گو بھارت نے اسرائیل کو ۱۹۵۰ء میں تسلیم کر لیا تھا مگر چانکیائی سیاست پر عمل کرتے ہوئے اُس نے تیل کی دولت سے مالا مال عرب ممالک سے قریبی تعلّقات رکھنے کی پالیسی پر عملدرآمد کیا۔ مدعا یہ تھا کہ اُن سے تیل حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی افرادی قوت وہاں کھپا کے ذخائر زرِ مبادلہ میں اضافے کے ذریعے اپنی معیشت کو تقویت دے سکے۔

یوں بھارتی حکمرانوں نے اپنی نام و نہاد غیر جانبدارانہ پالیسی کے تحت دِکھاوے کے طور پر مسئلہ فلسطین پر مؤقف کی حمایت کر کے عربوں کے دِلوں میں نرم گوشہ حاصل کرنے میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔ تاہم سَرد جنگ کے دِنوں میں اندرونِ خانہ دوغلی پالیسی اپناتے ہوئے امریکہ اور روس' دونوں سے بیک وقت تعلّقات استوار رکھتے ہوئے فوائد حاصل کرنے کے تجربے پر عمل کرتے ہوئے عربوں کے

ساتھ ساتھ اسرائیل سے تعلقات کو بھی استعمال کیا۔

بھارت اور اسرائیل کے باہمی تعلقات کی ابتداء اور ارتقاء کے مطالعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ تقسیم ہندوستان سے قبل ۱۹۱۹ء میں ترک عثمانی خلافت کے خاتمے کی کوششوں کے دوران کانگریس نے انگریزی راج سے آزادی حاصل کرنے میں مسلمانوں کی ہمدردیوں کے حصول کے لیے تحریک خلافت میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ مگر پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے اور اُس میں جرمنی اور ترکی کی شکست کے بعد جب اتحادی قوتوں نے ترکی کے حصے بخرے کر کے عثمانی خلافت میں شامل عرب علاقوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کیا تو ارضِ فلسطین میں دنیا بھر سے نقل مکانی کر کے آبسنے والے یہودیوں کی آبادکاری بھی شروع ہوگئی۔

اس پر کانگریس کے پلیٹ فارم سے گاندھی اور نہرو نے اپنی نام نہاد سامراجیت مخالف پالیسی کے اظہار کے طور پر فلسطینیوں کی حمایت کی۔ اِس میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ یوں مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کر کے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے میں مسلمانوں کو اپنے ساتھ مِلایا جائے اور بعد میں جمہوریت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق ہندوستان پر ہندو اکثریت کے بل بوتے پر حکمرانی کی جائے۔

جب بھارت کا قیام عمل میں آیا' تو عرب ممالک سے جُڑے اپنے مفادات اور بھارتی مسلمان آبادی کو مطمئن کرنے اور اُن کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے پنڈت نہرو نے فلسطینیوں کی حمایت جاری رکھی۔ ایران اور یوگوسلاویہ کے ساتھ فلسطین کے مستقبل کے بارے میں تجاویز مرتب کرنے والی اقوام متحدہ کی کمیٹی میں شامل ہو کر فلسطین کی تقسیم کی مخالفت کی۔ ازاں بعد ۱۹۴۸ء میں جب کشمیر پر پاکستان اور ہندوستان کی جنگ ہوئی تو نہرو مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں لے گیا۔ وہاں تیرہ عرب ممالک کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اُس نے فلسطین کے مسئلے پر فلسطینیوں کے موقف کی تائید کا اعادہ کیا۔

۱۹۵۰ء میں جب اسرائیل اقوام متحدہ کا رکن بنا تو امریکی دباؤ پر بھارت نے اُسے تسلیم تو کر لیا مگر تل ابیب میں اپنا سفارت خانہ نہیں بنایا اور اسرائیل کو بھی بمبئی میں فقط ایک چھوٹا سا قونصل خانہ کھولنے کی اجازت دی۔ اِن تمام اقدامات کے پیچھے بھی وہی بھارتی مسلمانوں کو مطمئن کرنے اور عرب ممالک سے گرم جوش تعلقات استوار رکھنے کا جذبہ کارفرما تھا۔ نہر سویز کے قومیائے جانے کے مسئلے پر بھی نہرو نے مصر کے موقف کی تائید اور اسرائیل کی مخالفت کی۔

بھارت اسرائیل تعلقات میں ایک موڑ ۱۹۶۲ء کی چین بھارت جنگ کے موقع پر اُس وقت آیا جب نہرو نے اسرائیل سے مدد مانگی۔ اسرائیل کی طرف سے بہت گرم جوشی سے جواب دیا گیا۔ اُس وقت کے اسرائیلی وزیراعظم بن گوریان نے بھارت کے لیے اپنے ذخائر اسلحہ کے منہ کھول دیے اور پھر دونوں ممالک میں قربتیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ اب بڑھتے بڑھتے یہ تعلقات اس نہج پر پہنچ چکے کہ موجودہ بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کے حالیہ دورۂ اسرائیل کے دوران اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو نے بھارت اسرائیل تعلقات کو وہ شادی قرار دیا جو" آسمانوں پر طے ہو چکی تھی"۔ انھوں نے کہا" بھارت اور اسرائیل کا ساتھ ابدی ہے، ہماری جوڑی جنت میں بنائی گئی تھی۔" گویا اُن کے نزدیک اِن تعلقات کی اہمیت اِس قدر زیادہ ہے کہ اِس کو تائید ایزدی بھی حاصل ہے۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں بھی اسرائیل نے ہندوستان کو وافر مقدار میں ہتھیار فراہم کیے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں کیونکہ بھارت پاکستان کو توڑ کر بنگلہ دیش بنانے کی سازش میں مصروف تھا اور اقوامِ متحدہ میں تمام عرب

ممالک پاکستان کا ساتھ دے رہے تھے' اس لیے بھارت کو بھی حمایتی درکار تھے۔ اِس پر اسرائیل نے اقوام متحدہ میں کُھل کر بھارت کا ساتھ دیا۔ یوں تمام ادوارِ حکومت میں اسرائیل صلے کی تمنا کیے بغیر بھارت کے ساتھ تعاون کرتا رہا۔ جواب میں کانگریسی حکومت کا رویہ نسبتاً محتاط رہا تاکہ بھارت کی مسلمان آبادی میں اشتعال پیدا نہ ہو اور عرب ممالک سے جُڑے مفادات پانے کی خاطر اُن کے ساتھ بھی پُرجوش تعلقات قائم رہیں۔ دوسری طرف اسرائیل کو بھی ایشیا میں اتحادی چاہیے تھے۔ اِس لیے وہ مستقبل میں مزید بہتر تعلقات کی اُمید پر بھارت کو ہر مرحلے پر تعاون فراہم کرتا رہا۔

۱۹۷۷ء کے بعد بھارت میں انتہا پسند ہندوؤں کو عروج ملنے لگا۔ تب بھارت اور اسرائیل کے مابین تعلقات میں نئی گرم جوشی پیدا ہونے لگی۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب ۱۹۷۸ء میں اُس وقت کے اسرائیلی وزیر دفاع موشے دایان نے بھارت کا خُفیہ دورہ کیا۔ ۱۹۹۲ء میں اوسلو معاہدے کے وقت بھارت پر کانگریس پارٹی کی حکومت تھی۔ لیکن اِس بار پارٹی نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات میں اپنی محتاط روش کو پس پُشت ڈال دیا۔ راجیو گاندھی وہ پہلا وزیر اعظم تھا جو اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے دوران کُھلم کُھلا اسرائیلی وزیرِ اعظم شمعون پیریز کو مِلا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں اپنی کمزور معیشت کو تقویت دینے کے لیے بھارتی وزیر اعظم نرسیما راؤ نے اسرائیل سے پینگیں بڑھائیں تاکہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اسرائیل کے سرپرست امریکہ کو رام کیا جا سکے۔

۱۹۹۸ء میں ایٹمی دھماکا کرنے کے بعد بھارت پر عالمی برادری نے دکھاوے کے لیے اقتصادی اور فوجی پابندیاں لگادی تھیں۔ اِس موقع پر بھی اسرائیل بھارت کی مدد کو آیا اور اُسے ہتھیاروں کی فراہمی جاری رکھی۔ ۱۹۹۹ء کی کارگل جنگ میں اسرائیل نے بڑھ چڑھ کر قیمتی اور جدید ترین ہتھیار بھارت کو دیے۔ اِن میں جدید ٹیکنالوجی کے حامل ڈرون بھی شامل تھے جو انتہائی بلندی پر پرواز کر کے علاقے کی جاسوسی اور نگرانی کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یوں اِن ڈرونز نے کارگل کے اونچے پہاڑوں پر پرواز کر کے مصیبت میں پھنسے بھارت کو میدانِ جنگ کی صحیح صحیح معلومات پہنچائیں اور بھارتی جنگی طیارے اپنے ہدف پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگانے میں کامیاب ہوئے۔

اسرائیل کے اِس فراخ دلانہ تعاون کو بھارتی فوج نے کُھل کے سراہا اور اُن میں یہ سوچ پروان چڑھی کہ اسرائیل اِن کا ایک قابلِ اعتماد اتحادی ہے جو ہر بُرے وقت پر اُن کے کام آتا ہے۔ کارگل جنگ کے وقت نئی دہلی میں بی جے پی حکومت تھی۔ ۲۰۰۰ء میں جسونت سنگھ بھارت کا وہ پہلا وزیر خارجہ تھا جس نے اسرائیل کا دورہ کیا اور پھر جواباً صیہونی وزیر اعظم ایریل شیرون نے ۲۰۰۳ء میں بھارت کا دورہ کیا۔

اِسی دوران بھارت کی مختلف ریاستوں میں کانگریس مخالف پارٹیوں کی حکومتیں اپنے طور پر دیگر ممالک سے معاشی منصوبوں میں مدد لینے کے لیے رابطے کرنے لگیں۔ اس ہی تناظر میں ۲۰۰۶ء میں بھارتی گجرات کے وزیرِ اعلیٰ نریندر مودی نے اسرائیل کا دورہ کیا۔ اِس دورے کا ایک خفیہ ایجنڈہ بھی تھا جس کے مطابق نریندر مودی اسرائیل سے مسلمانوں کی نسل کشی کے طور طریقے سیکھنے گئے تھے۔

۲۰۱۴ء میں جب بی جے پی دوبارہ اقتدار میں آئی تو بھارت اسرائیل تعلقات میں پھر گرم جوشی کی تازہ لہر پیدا ہوئی۔ آخر جولائی ۲۰۱۷ء میں نریندر مودی اسرائیل کا دورہ کرنے والا پہلا بھارتی وزیرِ اعظم بن گیا۔ گو وہ اس معاملے میں بہت محتاط رہا۔ چند ماہ پہلے عرب ممالک کا دورہ کرنے کے بعد اب وہ اسرائیل گیا تاکہ مشرق وسطیٰ میں بھارت کے

مفادات کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

سوال یہ ہے کہ اَب وہ کون سی تبدیلی آئی ہے کہ بھارت اور اسرائیل شیر وشکر ہو رہے ہیں؟ پہلی بات تو یہ کہ مصر کی اسرائیل پالیسی کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے بعد تبدیل ہوگئی تھی۔ اِس کے بعد اسرائیل کی مزاحمت کرنے والے ملک شام، عراق اور لیبیا تھے۔ یہ تینوں ممالک اَب اِس قدر کمزور اور لاغر ہو چکے کہ اسرائیل مخالفت کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اسرائیل کے سرپرست یعنی امریکا سے بھارت کے تعلّقات میں بہت گرم جوشی آئی ہے۔ سب سے اہم یہ بات کہ عرب خلیجی ممالک کی سوچ کے مطابق اَب اسرائیل سے بڑھ کر ایران خطرہ بن چکا۔

۴/ جولائی ۲۰۱۷ء کو مودی تل ابیب کے بن گوریان ائیرپورٹ پر اُترے تو اسرائیلی وزیرِ اعظم بنیامین نیتن یاہو کے ساتھ اسرائیل کی پوری کابینہ استقبال کے لیے موجود تھی۔ مودی نے یاہو کو ہاتھ جوڑ کر 'شلوم' کہا اور اُدھر سے 'نمستے' کی صورت میں جواب آیا۔ اسرائیلی وزیرِ اعظم کا کہنا تھا کہ ہم برس ہا برس سے کسی بھارتی لیڈر کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ بتانا ضروری ہے کہ اکثر عالمی لیڈر اگر یروشلم جائیں تو فلسطینیوں کے زیرِ انتظام علاقے رملّہ کا دورہ بھی کرتے ہیں۔ امریکی صدر ٹرمپ نے بھی اپنے حالیہ دورۂ اسرائیل میں ایسا ہی کیا تھا۔ مقصد یہ ہے کہ فلسطینی قیادت کی اشک شوئی کی اور ممکنہ حد تک غیر جانبدارانہ تاثر دیا جائے۔ لیکن بھارتی وزیرِ اعظم نے ایسا کرنے کا کوئی تکلّف نہیں کیا۔ انھوں نے فلسطینی قیادت کو نظر انداز کر دیا۔ ۱۹۳۶ء میں پنڈت نہرو کو اسرائیلی منصوبے میں مغربی سامراج کی سازش نظر آئی تھی۔ اب بھارتی مہاراجوں کا خیال ہے کہ اسرائیل عالمی برادری کا ایک بہت ہی اچھا اور معتبر رُکن بن چکا۔

ایک حکمران کے دوسرے ملک میں اہم دورے کو دو زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پہلا یہ کہ باہمی محبّت اور احترام کا اظہار کرنے کے لیے کون سے طریقے آزمائے گئے۔ نریندر مودی کی اسرائیل یاترا اِس لحاظ سے بہت کامیاب رہی۔ مودی اور نیتن یاہو نے ایک دوسرے کو خوب گلے لگایا۔ نریندر مودی نے ایک تقریب میں سفید اور نیلے رنگ کے کپڑے زیبِ تن کیے، یہ دونوں اسرائیلی پرچم کے رنگ ہیں۔ ایک جگہ یہ کہا کہ بھارت اور اسرائیل دونوں کے نام انگریزی حروفِ تہجّی آئی (I) سے شروع ہوتے ہیں۔

بھارت سے آئے ہوئے اور اَب اسرائیل میں مقیم یہودیوں سے ملنے پر مودی نے کہا "بھارت میں کوئی مذہبی تفریق نہیں۔ ہمارے ہاں یہودی اعلیٰ ترین مناصب تک پہنچے ہیں۔" ثبوت کے طور پر جنرل جیکب اور چند دوسرے افسروں کے نام لیے۔ وہ ہولوکاسٹ کی یادگار پر گئے اور جرمنی میں ہٹلر کے ظلم وستم کا نشانہ بننے والے یہودیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ وہ اسرائیلی لیڈر 'ہرزل' کی آخری آرام گاہ 'ہرز' پر بھی گئے حالانکہ یہ اُن کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ پھر وہ اُس دس سالہ لڑکے کو ملنے گئے جس کے والدین نومبر ۲۰۰۸ء کے ممبئی کے واقعے میں مارے گئے تھے۔ اِس لڑکے کا نام 'ہولزبرگ موشے' ہے اور وہ اسرائیل میں اپنے دادا، دادی کے پاس رہتا ہے۔ ممبئی واقعہ کے وقت اُس کی عمر کوئی سوا سال تھی۔

بھارت کے انسٹیٹیوٹ آف پیس اینڈ کونفلکٹ کے سنیئر فیلو 'بھیجت ایئر متھرا' دنیا میں اسرائیل کے کردار کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے "بھارت کے ساتھ، جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، اسرائیل کی ہتھیاروں کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی تجارت کرنے سے اُس کا تاثر ایک معاشی طاقت کے طور پر دُنیا میں مزید بہتر ہوگا۔"

بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کے حالیہ دورۂ اسرائیل

اِن دونوں ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدوں کی کُل مالیت تقریباً دو بلین ڈالر ہے۔ یوں اسرائیل امریکہ کے بعد بھارت کا سب سے بڑا تجارتی ساتھی بن گیا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان زراعت، ادویہ سازی اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعاون کے منصوبوں پر اتفاق ہوا۔ اس کے علاوہ ڈرپ واٹر ٹیکنالوجی، جس میں اسرائیل کو خاص مہارت حاصل ہے، میں معاونت کے ذریعے اسرائیلی ماہرین بھارت کی مدد کریں گے تاکہ کم سے کم پانی کے استعمال سے بہتر زراعت کا حصول ممکن بنایا جا سکے۔

آئی ٹی کی بڑی کمپنیاں آئی بی ایم، مائیکروسافٹ، گوگل، ایچ پی، یاہو اور اِنٹیل وغیرہ نے بھارت کے ٹاٹا گروپ کے ساتھ مِل کر ایک فنڈ قائم کیا ہے جو اسرائیل میں آر اینڈ ڈی کی سہولتیں فراہم کرے گا۔ اِس میں بھارت کی دیگر کمپنیوں کے تعاون سے بھی اسرائیل میں کئی ملین ڈالرز کی سرمایہ کاری ہو رہی ہے۔ یاد رہے اِن تمام بین الاقوامی کمپنیوں کی آر اینڈ ڈی کی سہولیات امریکہ سے باہر سب سے زیادہ صرف اسرائیل میں میسر ہیں۔

دونوں ممالک کے درمیان چھ سو تیس ملین ڈالر کے ہتھیاروں کا سودا بھی ہوا جس میں بھارتی بحریہ کے لیے زمین سے فضا میں مار کرنے والا میزائل سسٹم بھی شامل ہے۔ اِس سے قبل فروری ۲۰۱۵ء میں اسرائیل اور بھارت کے درمیان معاہدہ بھی ہو چکا کہ دونوں ممالک مل کر بھارتی فوج کے لیے میزائل سسٹم بنائیں گے۔ میزائل کا دفاعی نظام 'براق-۸' دونوں مُلکوں کا مشترکہ پروگرام ہے جو گزشتہ دس سال سے چل رہا ہے۔ بھارت اسرائیل سے سالانہ ایک ارب ڈالر کا دفاعی ساز وسامان خریدتا ہے۔ اسرائیل سے دفاعی تعاون کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بھارت کو جدید ترین امریکی ٹیکنالوجی تک رسائی حاصل ہوگئی ہے۔

اندیشہ

ریل میں ایک صاحب اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اپنا بڑا سا بیگ انھوں نے بیچ راستے میں رکھا ہوا تھا۔ آتے جاتے مسافر اس سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہے تھے۔

ایک مسافر اسے ایک طرف ہٹانے لگا تو وہ صاحب فوراً اخبار چھوڑ کر اسے روکتے ہوئے بولے: "ارے میاں! یہ کیا کر رہے ہو؟ بیگ تو یہیں رکھا رہنے دو۔"

"جناب! لوگ اس سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہے ہیں۔ آپ اسے کہیں ایک طرف رکھیں۔" مسافر نے شائستگی سے کہا۔

"ہرگز نہیں!" وہ صاحب فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ "اسے یہیں رکھا رہنے دو۔ میں بھلکڑ آدمی ہوں۔ اگر لوگ اس بیگ سے ٹکرا ٹکرا کر نہیں گریں گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں اسے ریل میں ہی بھول جاؤں گا۔"

ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ یہ دونوں ممالک خود ریاستی دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ اسرائیل فلسطینیوں پر ظلم وستم ڈھاتا ہے' تو بھارت نے کشمیر میں مظالم کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے، مگر حالیہ دورے میں دونوں ہی نے یہ اعلان کیا کہ وہ مِل کر دہشت گردی کے خلاف کام کریں گے۔ جس سے غالباً اُن کی مراد 'اسلامی دہشت گردی' ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی 'را' اور اسرائیلی 'موساد' میں قریبی تعاون موجود ہے۔ دورے کے اخیر میں اسرائیلی وزارتِ خارجہ کے جاری کردہ اعلامیے میں بیان کیا گیا ہے کہ حماس اور لشکرِ طیبہ میں کوئی فرق نہیں۔

اِن سارے حقائق سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ پاکستان اور اسلام کے دشمن کل بھی ایک تھے اور آج بھی اُن کا گٹھ جوڑ اِس بات کا متقاضی ہے کہ نہ صرف اُس پر نظر رکھی جائے بلکہ خطرات کا مقابلہ کرنے کی خاطر اتفاق اور اتحاد سے کام کیا جائے۔

اُستاد نے اچانک گاڑی سڑک کنارے روک دی۔
میں نے پوچھا: ''اُستاد! کیا ہوا، اچانک کیوں رک گئے؟''

''چل تو نیچے اُتر...... میں بتاتا ہوں...... وہ دیکھ! سامنے کیا تماشا ہورہا ہے؟'' اُستاد مجھ سے پہلے گاڑی سے نیچے اُتر آیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ شہر کے مصروف چوراہے میں ایک شخص مجمع جمائے بیٹھا تھا۔ عمر کوئی ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ گاڑیوں کا بے ہنگم سیلاب مجمعے کے اردگرد سے بمشکل گزر رہا تھا۔ مجمعے کی مشرقی سمت شہر، شمالی سمت ہاکی اسٹیڈیم، مغربی سمت پریس کلب اور جنوبی سمت جنرل پوسٹ آفس کی بلند وبالا اور پُرشکوہ عمارت تھی۔ یہ شخص دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں مگن تھا۔

اس پراگندہ حال شخص کے بالوں پہ مٹی کی دبیز تہ جمی ہوئی تھی جیسے سالہاسال سے نہایا نہ ہو۔ جس چٹائی پر آلتی پالتی مار کر وہ بیٹھا ہوا تھا، اس کی حالت دیکھ کر ہی گھن آنے لگتی۔ مستزاد یہ کہ ادھ جلے سگریٹ کے بیسیوں ٹوٹے قریب ہی ایش ٹرے میں پڑے تھے۔ کریہہ النظر شخص تھوڑی دیر بعد ایک سگریٹ سلگاتا اور کش لگا کر دھواں ہوا میں چھوڑ دیتا۔ دو تین کش لینے کے بعد جلتا سگریٹ جوتے سے مسل کر قریب پڑی ایش ٹرے میں پھینک دیتا۔ اردگرد درجنوں افراد کا ہجوم تھا۔ ٹریفک کی روانی بری طرح متاثر تھی لیکن چند گز فاصلے پر کھڑا ایک ٹریفک پولیس اہلکار بھی اسی بھدے شخص کا ''عقیدت مند'' نظر آرہا تھا۔

استاد نے گاڑی سے اترتے ہی اس مجمعے کا رخ کیا۔ قریب پہنچ کر ایک نظر اس شخص پر ڈالی جو مجمع جمائے بیٹھا تھا۔ پھر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ لوگ دیوانوں کی طرح اس کے اردگرد جمع تھے۔ کچھ لوگوں نے ہاتھوں میں سو روپے کے نوٹ رکھے تھے۔ وہ سگریٹ کے ٹکڑے پانے کی خاطر بے چین تھے۔ جیسے ہی کوئی شخص سو روپے کا نوٹ شعبدہ باز کی ہتھیلی پر رکھتا، اس کے عوض اسے سگریٹ کا ایک ٹوٹا ''عنایت'' کردیا جاتا۔ ساتھ ہی ارشاد جاری ہوتا۔ ''یہ سگریٹ کا ایک ٹوٹا تیرے



سارے غم ہوا کردے گا۔'' وہ اردگرد جمع ہونے والے تماش بینوں پر ایک نگاہ ڈالتا اور پھر اپنے کام میں جُت جاتا۔

میں کبھی اس غلاظت میں لتھڑے شخص کو دیکھتا، تو کبھی استاد کو جو بڑے تحمل سے یہ سارا منظر دیکھتا رہا۔ تماش بینوں میں زیادہ تر نشہ کے عادی افراد نظر آرہے تھے۔ تاہم ایک بڑی تعداد اجلے کپڑوں میں بھی ملبوس تھی۔

''اُستاد! یہ کیا ڈرامہ ہورہا ہے؟... یہ سگریٹ کے ٹوٹے... اور لوگوں کی بے چینی... میری تو سمجھ سے باہر ہے یہ سب کچھ...'' میں نے اُستاد سے کہا۔

''یہ اپنی اُستادیاں دکھا کر لوگوں کو بے وقوف بنارہا ہے...... دیکھ نہیں رہے کہ جلے سگریٹ کے ٹوٹے، غلیظ ہاتھوں سے ان تماش بینوں کو دے رہا ہے...... اور ان لوگوں کی حالت دیکھو، ٹوٹے حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہوئے جاتے ہیں۔ نمناک ہوئے جاتے ہیں۔ خانہ خراب ہوئے جاتے ہیں۔ ماہیٔ بے آب ہوئے جاتے ہیں۔ معتقد بے حساب ہوئے جاتے ہیں۔'' استاد نے اپنے شاعرانہ انداز میں جواب دیا۔

''اُستاد! آپ کے ہوتے ہوئے اس غلیظ شخص کی استادی میری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''ارے چپ کر! مجھے جائزہ لینے دے... دیکھنے دے کہ یہ کیا بلا ہے؟ یہ سلسلہ کیوں چلا؟ یہ درِ بے وقوفی یہاں کیوں کھُلا؟ میں چاہوں تو ایک پل میں اس کی ساری بساط لپیٹ دوں۔ یہ سارا منظر ہی تہس نہس کرکے رکھ دوں۔ اس کا بوریا بستر گول کردوں۔ تتر بتر یہ سارا غول کردوں لیکن نہیں، ابھی نہیں...... ہاں! مجھے لوگوں کی جہالت پہ حیرانی ہورہی ہے، یہاں کھلے عام شیطانی ہورہی ہے...... ایک غلیظ الجثّہ، کریہہ النسل اور ماؤف العقل شخص سے پتا نہیں یہ لوگ کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟...... یہی تو شرک ہے...... اور شرک کے سینگ تھوڑے ہوتے ہیں۔'' اُستاد غصے میں بولتا گیا۔

اُستاد نے ایک دم پیچھے مڑ کے دیکھا، چند گز کے فاصلے پر پولیس اہلکار کھڑا تھا۔ اُستاد لمحہ بھر میں اس کے پاس جا پہنچا اور گویا ہوا: ''اے قانون کے محافظ! یہ تیری ناک کے نیچے بلکہ تیری ناک کے عین سامنے وہ دیکھ کیا ہورہا ہے؟ لگتا ہے تُو سو رہا ہے۔ ہوش وحواس اپنے کھو رہا ہے۔ تُو کل وہی کاٹے گا جو آج بو رہا ہے۔''

''نہیں، میں سو تو نہیں رہا... میں تو جاگ رہا ہوں۔'' پولیس اہلکار ایک دم چوکنا ہوگیا۔ ''میں تو اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہوں...'' وہ استاد کی باتیں سن کر پریشان ہوگیا۔

''بھاڑ میں گئی تیری ڈیوٹی...... تُو بھی جا بھاڑ میں...... بلکہ تیرے جیسے اہلکاروں کو تو جہنّم میں ہونا چاہیے۔ وہ دیکھ! تیری آنکھوں کے سامنے، عین بیچ چوراہے میں اُس غلیظ الجثّہ مداری نے لوگوں کو سگریٹ کے ٹوٹوں پر لگا رکھا ہے۔ آنے جانے والوں کو مشکل پیش آرہی ہے۔ اُس نے ساری سڑک بند کر رکھی ہے اور تو کہاں سویا ہوا ہے، تُو کہاں کھویا ہوا ہے...... تجھے کچھ نظر نہیں آتا؟ لگتا ہے تُو یہاں آم بیچنے آیا ہے۔'' استاد کا پارہ ایک دم بلند ہوگیا۔

''بابا! مجھے معاف کر...... یہ ''پہنچی ہوئی سرکار'' ہے۔ اس کے سگریٹ کے ٹوٹوں پر تو لوگ مرتے ہیں۔ میں اس شخص کو یہاں سے نہیں ہٹا سکتا۔'' پولیس اہلکار بھی اُس غلیظ شخص کے جاہلانہ پن کا شکار ہوچکا تھا۔

''ہاں ہاں! تُو بھی اُسی کے ٹوٹوں پر مرتا ہوگا... جا سو روپے کا نوٹ دے کر تُو بھی ایک سگریٹ کا ٹوٹا لے آ... شاید تیرے نصیب بھی جاگ پڑیں...... نکھٹّو کہیں کا! ایسے قانون کے رکھوالوں کو تو کسی کال کوٹھڑی میں ہونا چاہیے۔'' استاد نے اُسے اچھی خاصی جھاڑ پلادی۔

''اُس میں کوئی دم خم ہے، تو لوگ اُس کے پاس جمع ہوتے ہیں۔'' پولیس اہلکار اس کی وکالت شروع کرنے لگا۔

''ہاں ہاں! سارا دم خم غلاظت میں لتھڑے اسی کریہہ النسل شخص میں ہے۔'' اُستاد ایک دم بھنا گیا۔ ''لگتا ہے تُو جاہل اور احمق ہے...... میں دیکھتا ہوں اس ملنگ بے مہار کو، اس خانہ خراب کو کہ یہ کتنی ''پہنچی ہوئی سرکار'' ہے...... اب اُس ''سرکار'' سے کہو کہ اپنا بچاؤ کرلے...... میں جارہا ہوں اُس کی خیر خبر لینے۔''

اُستاد نے اپنے قدم پھراس ''پہنچی ہوئی سرکار'' کی طرف بڑھادیے۔

''رُک جاؤ بابا جی، رُک جاؤ...... کچھ نہ کہنا اس کو...... نہیں تو بابا......! تیری زندگی عذاب ہوجائے گی......'' سپاہی پیچھے سے آوازیں دیتا رہ گیا۔

اُستاد پولیس اہلکار کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے ''پہنچی ہوئی سرکار'' کے قریب پہنچ گیا۔ ایک اُچٹتی سی نگاہ مجمع پر ڈالی۔ پھراس شخص سے کڑک دار آواز میں پوچھا: ''اے ''پہنچی ہوئی سرکار؟'' تُو کتنی پہنچی ہوئی سرکار ہے؟... اور یہ کیا تونے ٹوٹوں کی ہول سیل لگارکھی ہے...''

اس شخص نے خاموشی سے اُستاد کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑدیں۔ وہ اُستاد کو گھورے جارہا تھا۔

''کچھ پوچھا ہے میں نے......؟'' استاد نے اسے کھاجانے والی نظروں سے دیکھا لیکن وہ شخص ذرا ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے ادھ جلا سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسلا اور آرام سے ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ پھر غلاظت بھرے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اس غلاظت کے مارے شخص کی ''پُراسرار'' خاموشی پر اُستاد کو غصہ چڑھ گیا۔

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے کے مصداق شاید اس کو بھی ''لاتوں'' کی ضرورت تھی۔ استاد نے اس پر اچانک حملہ کردیا۔ پہلا بھرپور وار چٹائی پر کیا۔ استاد نے نیچے سے چٹائی کو پورے زور سے کھینچا اور پھر دور ہوا میں اچھال دیا جیسے کسی گیند کو پھینک جاتا ہے۔ اگلے ہی لمحے اُستاد نے گاؤ تکیے اُٹھائے اور وہیں کھڑے کھڑے سڑک کے دوسرے کنارے پر پھینک دیے۔ ساتھ ہی سگریٹ کے ٹوٹے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

یہ پہنچی ہوئی سرکار اپنی جگہ سے اٹھ کر بیسیوں گز دُور بھاگ گئی۔ اس کی کسی ''کرامت'' نے کوئی کمال دکھایا اور نہ اس کے مریدین میں سے کوئی اس کی مدد کو آگے بڑھا۔ پولیس اہلکار نے بھی رخنہ اندازی ضروری نہیں سمجھی۔ وہ پوری تندہی سے اپنی ڈیوٹی دینے میں ''مصروف'' ہوگیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجمع منتشر ہوگیا۔

''ارے واااہ استاد! وااااہ ... تیرے آگے کسی کی اُستادی کام نہیں آئی۔ یہ شخص تو لوگوں کو اُلو بنا کر اُن کا اُستاد بنا ہوا تھا۔ اُس کا بوریا بستر ہوا میں کیا اُچھلا، وہ تو خود ہی بے تحاشا یہاں سے بھاگ نکلا۔ پولیس اہلکار کو بھی شاید کسی سانپ نے سونگھ لیا تھا۔ وہ اس پہنچی ہوئی سرکار کو بچانے نہیں آیا... ہاہاہا'' میں نے قہقہہ لگا کر اُستاد کی بھرپور تعریف کردی۔ ''اور اس کے مریدین تو بے چارے اُس کے کسی کام نہ آئے۔''

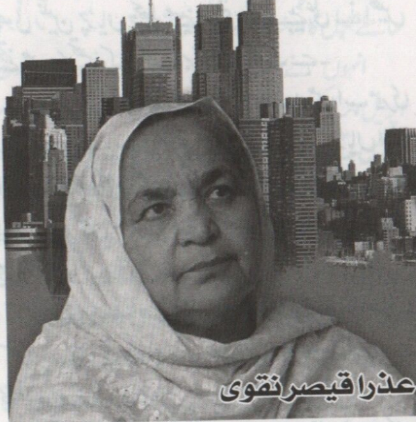
''ارے ایسے جاہل لوگوں کا یہی علاج ہونا چاہیے۔ کل نہیں آج ہونا چاہیے۔ جھوٹ کا نہیں، سچ کا راج ہونا چاہیے۔ سچے لوگوں کے سر ہی سچ کا تاج ہونا چاہیے۔ صاف ستھرا سماج ہونا چاہیے۔'' اُستاد نے فاتحانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا اور گاڑی کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔

اُستاد نے چند لمحوں میں ''پہنچی ہوئی سرکار'' کی بساط لپیٹ دی تھی۔ سگریٹ بابا اور اندھی عقیدت کے مارے لوگ غائب ہوچکے تھے۔ ''پہنچی ہوئی سرکار'' پتا نہیں کہاں پہنچ گئی تھی۔ اُستاد کی اُستادی نے اپنا کام کردکھایا تھا۔

اب ٹریفک رواں دواں تھی۔ پولیس اہلکار پہلے سے بھی زیادہ چوکنّا ہوگیا۔ اُستاد ایک بار پھر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تاکہ سفر جاری رکھ سکے۔

◆◆◆

دیارِ غیر کی مکین ایک متوحش بوڑھی کا قصہ، وہ اپنے پیارے وطن کو کبھی نہ بھول پائی



آٹھ ہزار ڈالر

عذرا قیصر نقوی

نماز پڑھنے کے بعد امّاں کمرے سے نکلیں تو مرتضیٰ گھر کے باہر راستے سے برف ہٹا کر آرہا تھا۔ ٹوپی اور دستانے برف سے اٹے ہوئے تھے۔ کان اور ناک سرخ ہوگئے تھے۔ اس نے جب دستانے اتارے تو انہوں نے دیکھا کہ انگلیاں بھی لال ہوگئی تھیں۔ دل بیٹے کے لیے تڑپ گیا، بولیں ''ارے کیوں مصیبت میں پڑتا ہے روز صبح، پڑی رہنے دے برف، خود پگھل جائے گی''۔

مرتضیٰ نے جھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے بڑے رسان سے اماں کو سمجھانے کی کوشش کی ''ارے اماں! اگر روز برف نہ ہٹاؤں تو برف کا ایک پہاڑ کھڑا ہو جائے گا دروازے کے سامنے! اور پھر گیراج سے گاڑی نکالنے کے لیے بھی تو راستہ صاف کرنا تھا نا! کل رات بھر برف پڑی ہے''۔

تنویر زہرا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، پچھواڑے کے مکان میں مسٹر سوائے اپنی گاڑی سے برف ہٹا رہے تھے۔ وہ بولیں ''ارے! سردیوں میں گاڑی چلانے کی کیا ضرورت ہے؟ بس سے چلا جایا کر۔ برف کے موسم میں تو گاڑی لے کر جاتا ہے تو دن بھر مراجی ہولتا رہتا ہے''۔

مرتضیٰ کو اماں پر غصہ آیا اور پیار بھی، بولے: ''اماں آپ کو کسی طرح چین نہیں۔ کراچی میں جب بس میں بیٹھ کر ناظم آباد سے کلفٹن جاتی تھیں تو دعا مانگا کرتیں کہ مولا! ایک دن ایسا بھی کرنا کہ میرے مرتضیٰ اور ارتضیٰ کے پاس بھی گاڑی ہو...... آپ کو کلفٹن والے خالو ابا کی گاڑی دیکھ کر کیسا رشک آتا تھا۔''

باورچی خانے میں ان کی بہو رضیہ جلدی جلدی بچوں کا لنچ باندھ رہی تھی۔ مرتضیٰ کو بھی کاغذ کے لفافے میں سینڈوچ، جوس اور ایک سیب رکھ کر لنچ کے لیے دیا اور جلدی جلدی کوٹ، بوٹ، دستانے اور ٹوپی پہن کر اپنے لنچ کا لفافہ لیے کام پر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ بچے اسکول کی بس لینے قریبی بس اسٹاپ پر چلے گئے۔

دھڑ، دھڑ دروازے بند ہونے کی آوازیں، گیراج کا شٹر بند ہونے کی آواز۔ ''سب چلے گئے۔'' تنویر زہرا خود سے بولیں۔ اب گھر میں مکمّل سناٹا تھا، سوائے نیچے جلتے ہوئے

گرمائش پہنچانے والے فرنس کی آواز کے جو متواتر آرہی تھی۔

وہ چڑیوں والے پنجرے کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی رنگین چڑیاں پچھلے مہینے مرتضٰی کے بیٹے علی نے انھیں تحفے میں دی تھیں کہ یہ آپ کا برتھ ڈے گفٹ ہے۔

وہ ہنس پڑیں اور کہا، ''اوئی اس بڑھاپے میں اب میری سالگرہ ہوگی...... ساری عمر تو منائی نہیں......'' یہ چڑیاں اب ان کی دن بھر کی ساتھی بن گئی تھیں۔ تنویر زہرا چڑیوں سے باتیں کرتی تھیں مگر ان کا خیال تھا کہ چڑیاں اردو سمجھ تو جاتی ہیں مگر بولتی انگریزی ہیں۔

تنویر زہرا نے باورچی خانے پر نظر ڈالی، چمکتا ہوا، صاف ستھرا، ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ پھر چڑیوں سے مخاطب ہوئیں:

''ایک تو میں رضیہ کے سگھڑاپے سے پریشان ہوں، کام کر کر کے مری جائے ہے، کتنا کہا کہ رہنے دے، روز کوئی سالن پکا دیا کروں گی مگر نہیں، سب خود ہی کرے گی۔ اتوار کو دن بھر کھڑے ہو کر ہفتے بھر کے لیے کھانے پکا پکا کر فریزر میں رکھ دے گی، اے ہے! یہ بھی کوئی بات ہوئی، کہتی ہے روز روز کھانا پکانے سے گھر میں پیاز اور مسالوں کی بو بس جاتی ہے۔ دوپہر میں علی آئے گا اسکول سے، خود ہی فریج سے اپنی اسپگیٹی یا پیزا نکالے گا، مائیکرو ویو میں گرم کرے گا اور کھا لے گا۔ کتنا کہا کہ لاؤ تمہارے لیے تازہ روٹی ڈال دوں، پراٹھا پکا دوں، مگر نہیں...... اسے تو یہ ہی امریکن کھانے پسند ہیں۔''

تنویر زہرا ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوئیں۔ سامنے صاف ستھرے مکانوں کی قطار تھی۔ چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ برف سے مکانوں کی چھتیں اور راستے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ برف صاف کرنے والی مشین کے انتظار میں کھڑی ہو گئیں۔ ابھی وہ دیو جیسی مشین آتی ہو گی اور سڑک کی ساری برف سرکا کر کنارے کر دے گی۔ سڑک کے دونوں طرف برف کی چھوٹی سی دیوار اور اونچی ہو جائے گی۔

اب صبح کے نو بج چکے تھے۔ دفتر اور دوسری ملازمتوں پر جانے والے جا چکے تھے۔ اس لیے سڑک پر کوئی اِکّا دُکّا گاڑی گزر جاتی۔ دس بجے ایک بڑی بی سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں ملفوف، اپنے کتے کو ٹہلانے نکلیں گی۔ ''غضب کی ہمت ہے بڑھیا کی کہ اس سردی اور برف باری میں بھی گھومنے سے باز نہیں آتی۔'' وہ حیران ہوتیں۔

گھڑی پر نظر ڈالی، ابھی تو صرف ساڑھے نو بجے تھے۔

''اب کیا کروں؟ ناشتہ کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ فریج میں جوس، پھل، ڈبل روٹی، انڈے سب بھرے پڑے ہیں مگر کھانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ اکیلے کیا خاک اچھا لگتا ہے کھانا پینا''۔

وہ سوچنے لگیں ''اب مجھے یہاں کینیڈا آئے تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا مگر لگتا ہے کہ جیسے برسوں ہو گئے''۔ ارتضٰی کے پاس سعودی عرب میں بھی چند مہینے رہ کر آئی تھیں۔ وہاں بھی اماں اور ارتضٰی کی بیوی دن بھر گھر میں بند رہتے۔ شام کو ارتضٰی آتے۔ اگر تھکے ہوئے نہیں ہوتے تو گاڑی میں بٹھا کر گھما پھرا لاتے۔ خیر سے وہاں حج تو ہو گیا۔ مگر وہاں بھی کیا جی لگتا؟ مرتضٰی نے یہاں کینیڈا بلانے کی ضد پکڑ لی۔ کہتا تھا کہ اماں اور بابا کیا کریں گے اکیلے کراچی میں؟ ارم باجی بھی شادی ہو کے دبئی چلی گئی ہیں۔

مرتضٰی کے ابا کسی صورت کینیڈا آنے پر راضی نہیں تھے اور نہ ہی آئے۔ جب تک کینیڈا کا امیگریشن کا ویزا آتا، اللہ ہی نے ان کا ویزا بھیج دیا۔ ابا کے مرنے پر دونوں بھائی آئے۔ باپ کا بنوایا ہوا گھر بیچ باچ کر، ماں کو ساتھ لے گئے۔ کیا نام ہے اس شہر کا؟ ونڈسر! جب وہ یہاں آئی تھی تو مرتضٰی پندرہ منزلہ اونچی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ وہ بلڈنگ اندرونِ شہر میں تھی۔ وہ بلڈنگ کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر سڑک کی چہل پہل دیکھ لیتی تھیں۔

اب دس مہینے ہوئے ماشاء اللہ یہ مکان خرید لیا ہے۔

رضیہ کتنے فخر سے دکھاتی ہے اپنے ملنے والوں کو۔ چار بیڈ روم کا مکان ہے۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے بیسمنٹ بھی ہے۔ گیراج میں کہتے ہیں دو گاڑیاں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ مکان جب سے خریدا ہے مرتضٰی نے، بس میاں بیوی مورگیج کی ہی باتیں کرتے ہیں۔ ایک دن اماں نے پوچھا کہ یہ مورگیج کیا بلا ہے تو رضیہ نے کچھ سمجھایا تھا: ''اماں! اتنا پیسا ہر مہینے بینک کو دینا ہوتا ہے ورنہ مکان وہ لے لے گا۔ اماں کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ ایک وہ انڈیا میں کسٹوڈین کا قصہ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جب چچا ابا کراچی آئے تھے تو کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا تھا ان کے مکان پر۔

اب پتا نہیں یہ مورگیج کا کیا قصہ ہے۔ اماں سوچتی، جب ہم پاکستان آئے تو ہر وقت قصہ رہتا تھا کلیم اور الاٹمنٹ کا۔ مگر ہمیں کیا ہاتھ آیا...... خاک۔ مرتضٰی کے ابا سرکاری ملازم تھے انڈیا میں، سو وہ پاکستان آ گئے۔ وہاں بھی کیا تھا، ایک پرانا آبائی مکاں امروہے میں اور کراچی میں وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ سنا ہے لوگوں نے کئی کئی گھر الاٹ کروائے۔

اماں نے غیر ارادی طور پر گھڑی کی طرف دیکھا تو دن کے دس بج چکے تھے۔ سوچا کہ چلو پودوں میں پانی ڈال دوں۔ رضیہ نے گملوں میں طرح طرح کے پودے لگائے تھے۔ گھر کے اندر اچھی خاصی پھلواری بن گئی تھی۔ پودوں کی دیکھ بھال کا کام انہوں نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ کراچی کے چھوٹے سے مکان کے آنگن میں بھی تنویر زہرا نے کچھ حصہ کچا رہنے دیا تھا اور وہاں بیلے کے پھول لگائے تھے۔

''نہ جانے وہ بیلا زندہ ہو گا یا مر گیا ہو گا؟'' وہ آزردہ ہو گئیں۔

ان کے دماغ میں تو ابھی میرٹھ والے گھر کے آنگن کے امرود اور موگرے کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

وہ بہت لگن سے ہر گملے میں پانی ڈالتی رہیں۔ ربڑ پلانٹ کے پتے گیلے کپڑے سے صاف کیے۔ پودوں پر اسپرے کیا۔ وہ روز ہر گملے کو دیکھتیں کہ کتنے نئے پتے نکلے۔ کبھی کبھی اُنہیں پودوں پر ترس آتا کہ بیچارے کبھی باہر کی تازہ ہوا نہیں لے پاتے۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی، سامنے میپل کا درخت ٹنڈ منڈ کھڑا تھا۔

انہوں نے حساب لگایا...... جنوری، فروری، مارچ، اپریل، تب کہیں اپریل کے آخر میں سوکھی شاخوں سے پتے سر نکالیں گے۔ جون جولائی میں درخت خوب ہرا بھرا ہو جائے گا۔ پھر اکتوبر میں پتے سرخ ہو جائیں گے تو پیڑ پر آگ سی لگتی معلوم ہو گی۔ تب بہت خوبصورت لگتے ہیں یہ میپل کے درخت اور ابھی اکتوبر ختم بھی نہیں ہو گا کہ سوکھے پتوں سے پھر صحن بھر جائے گا۔ پھر وہی ٹنڈ منڈ درخت پھر وہی گرمیوں کا انتظار! ''نہ جانے اگلی گرمی دیکھوں گی یا نہیں......'' انہوں نے سوچا۔

اب انہیں دن کے ایک بجے کا انتظار تھا جب مرتضٰی کا بیٹا علی اسکول سے آئے گا تو ذرا رونق ہو گی۔ بڑی بیٹی سارہ تین بجے اسکول سے آئے گی۔ مرتضٰی اور رضیہ شام کو چھ بجے آئیں گے۔ سردیوں میں تو چھ بجے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ مرتضٰی واپسی میں رضیہ کو لیتا آتا ہے۔ انہیں رضیہ پر ترس آتا تھا۔ وہ کام سے واپس آ کر کھانا گرم کرتی، کھلاتی، کچن صاف کرتی، برتن دھوتی اور مرتضٰی بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے تھے۔ رضیہ خواہ مخواہ گھر سے باہر کام کرتی ہے۔ کیا فائدہ جان کھپانے سے؟ ایک بار انہوں نے مرتضٰی سے کہا تھا ''کیوں بیوی سے نوکری کرواتا ہے؟''

اس نے جواب دیا تھا۔ ''اماں! رضیہ ہی کو زیادہ شوق تھا مکان خریدنے کا' صرف میری تنخواہ سے تو مورگیج ادا ہو نہیں سکتا تھا۔ اس لیے رضیہ نے بھی کام شروع کر دیا۔ فیکٹری میں پرزے جوڑنے کا کام ہے رضیہ کا۔''

فون کی گھنٹی بجی۔ تنویر زہرا فون کی گھنٹی سے ہمیشہ گھبرا جاتی تھیں۔ انہوں نے سوچا۔ ''ہو سکتا ہے مرتضٰی کا فون ہو۔ میری خیر خبر لے لیتا ہے دن میں ایک آدھ بار۔ کیا پتا کسی اور کا

فون ہو۔ کوئی انگریزی نہ بولتا ہو۔ کوئی بات نہیں کہہ دوں گی، مسٹر مرتضیٰ ناٹ ہوم اور رکھ دوں گی فون"۔

گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ انہوں نے فون اٹھایا۔ فون پر رضیہ کی دوست ثمینہ چودھری تھی۔ وہ بھی دن میں کبھی کبھار فون کر لیتی تھی۔ اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے تنویر زہرا کا دل بہل جاتا۔ ثمینہ پنجابی تھی۔ آج تنویر زہرا کے دماغ میں بس ایک جملہ اٹک کر رہ گیا...... آٹھ ہزار ڈالر۔

رات کو کھانے کے بعد جب مرتضیٰ اور رضیہ بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے تو زہرا کے اس سوال نے دونوں کو چونکا دیا۔

"بیٹا! مرتضیٰ، کیا آٹھ ہزار ڈالر کی رقم بہت ہوتی ہے؟"

مرتضیٰ حیران ہوا کہ اماں آج روپے پیسے کے چکر میں کیسے پڑ گئیں۔ وہ تو یہ بھی بڑی مشکل سے سمجھ پاتی تھیں کہ ایک ڈالر میں کتنے پاکستانی روپے آتے ہیں۔

مرتضیٰ نے پوچھا "کیوں اماں کیا ہوگا آٹھ ہزار ڈالر کا؟"

تنویر زہرا ٹال گئیں۔ بولیں "کچھ نہیں! یوں ہی پوچھ رہی تھی۔" وہ اٹھ کر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نیند کی گولی کھائی۔ رات کی دعائیں پڑھیں۔ دعا پڑھی اور لیٹ رہیں۔ وہی سوال دماغ میں گھومے جا رہا تھا...... آٹھ ہزار ڈالر۔ "اچھا اگر مرتضیٰ کے پاس نہ ہوئے تو ارتضیٰ کو خط لکھوں گی وہ دے دے گا"۔ یہ سوچ کر انہیں تھوڑا سکون ہوا۔ آنکھیں مندنے لگیں۔ لگتا ہے آج کمرے میں گرمائش زیادہ تیز ہے، نیند جلد آ گئی۔

یہ کیسا مجمع ہے...... کس کا جنازہ ہے...... چالیسواں ہے، اماں کا نہیں مرتضیٰ کے ابا کا سوئم ہے۔ یہ کس کی قبر ہے...... بیری کے پیڑ کے نیچے۔ فاطمہ زہرا لکھا ہے کتبے پر۔ اچھا! میرٹھ میں اماں کی قبر شاید بھائی شان حیدر نے مرمت کروائی ہے۔ ابا کی قبر پر گھاس اگ آئی ہے۔ یہ کس کی تازہ قبر ہے...... مرتضیٰ کے ابا سوئے ہوئے ہیں۔ یہ برف سی کیسی گری ہے اس قبر پر...... یہ کون سی جگہ ہے۔ یہ کس کس کا جنازہ چوبی تابوت میں رکھا ہے۔ ہوائی جہاز کی گھڑگھڑاہٹ...... اور اماں ہڑبڑا کر اٹھ گئیں۔ یہ کیسا عجیب خواب تھا۔ تنویر زہرا بہت دیر تک دعائیں پڑھتی رہیں۔

"مرتضیٰ کے ابا ہم آپ کو کراچی میں اکیلا چھوڑ آئے"۔ وہ بدبدائیں۔ صبح جب وہ نیچے گئیں تو خلاف معمول سب موجود تھے۔ انہیں یاد آیا کہ آج تو سنیچر ہے، چھٹی کا دن۔ مرتضیٰ نے ان کی شکل دیکھ کر کہا:

"کیا ہوا اماں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ رات کو کیا نیند نہیں آئی آپ کو"۔

تنویر زہرا نے کوئی جواب نہیں دیا مگر کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔ "کل رضیہ کی دوست ثمینہ کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ صداقت مرزا کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کو دفن کہاں کیا جائے گا؟"

مرتضیٰ مسکرا کر بولے "اماں آپ کیا اسی وجہ سے اتنی پریشان ہیں؟ دفن ہو جائیں گے وہ قبرستان میں۔ مسجد والوں نے یہودیوں کے قبرستان میں کچھ جگہ خرید لی ہے، وہیں دفن ہو جاتے ہیں"۔

"ہاں ثمینہ بھی یہی کہہ رہی تھی"۔ وہ تسبیح گھماتے ہوئے بولیں۔ پھر ذرا جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا:

"مرتضیٰ بیٹا۔ تیرے پاس آٹھ ہزار ڈالر جمع ہوں گے؟ ورنہ ارتضیٰ کو سعودی عرب فون کر کے پوچھنا کہ وہ پیسوں کا انتظام کر سکتا ہے؟

مرتضیٰ اور رضیہ نے چونک کر تنویر زہرا کی طرف دیکھا۔ دونوں تقریباً ساتھ ہی بولے۔ "کیوں اماں؟"

وہ باہر کھڑکی میں گرتی ہوئی برف دیکھ کر بولیں! "ثمینہ بتا رہی تھی کہ یہاں سے لاش پاکستان بھیجنے میں آٹھ ہزار ڈالر خرچ آتا ہے۔ اچھا یہ بتا کہ انڈیا لے جانا کیا سستا پڑے گا؟"

◆◆◆

انسان دوست ڈولفن

معدوم ہونے کے خطرے سے دوچار خوبصورت سمندری جانور

اسد شریف

اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی دنیا میں بے شمار خوبصورت و عجیب مخلوقات پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک ڈولفن بھی ہے۔ اس جانور کو ذہین ترین جانوروں میں مانا جاتا ہے۔ ڈولفن کی دنیا بھر میں تقریباً چالیس اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے چھتیس اقسام سمندر جبکہ چار کی ڈولفن دریاؤں میں پائی جاتی ہیں۔ ڈولفن کی مشہور اقسام میں کلر وھیل، عام ڈولفن، بوٹل نوز ڈولفن اور پائلٹ وھیل شامل ہیں۔ ڈولفن سردیوں میں سرد علاقوں سے ہجرت کر کے گرم علاقوں کی جانب پیش قدمی کرتی ہے۔

اس آبی ممالیہ کی زیادہ تر اقسام کم سطح والے پانی میں پائی جاتی ہیں۔ ڈولفن کی اوسط عمر پچاس سال تک ہوتی ہے لیکن کچھ اقسام کی ڈولفنیں سو سال تک بھی زندہ رہتی ہیں۔ یہ آبی جانور سمندری پودے، چھوٹی مچھلیاں، اور آکٹوپس وغیرہ کو اپنی خوراک بناتا ہے۔ ڈولفن پانچ سے لے کر تیس مچھلیوں کا ایک گروہ بنا کر رہتی ہیں جسے پوڈ (pod) کہا جاتا ہے۔ ان کا گروہ کبھی کبھار پانچ سے لے کر سو مچھلیوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ان کے کچھ گروہ پوری دنیا میں سفر کرتے رہتے ہیں۔

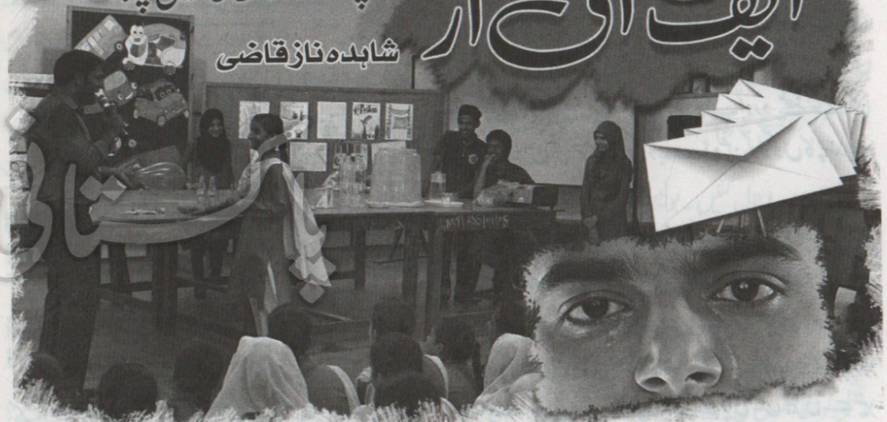
ڈولفن ساڑھے پانچ فٹ سے لے کر اکتیس فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ اقسام کے لحاظ سے اس کا وزن پچاس کلو سے لے کر دس ٹن تک ہوتا ہے۔

ڈولفن کی سب سے بڑی قسم کلر وھیل ہے۔ کلر وھیل کی لمبائی ۲۳ سے ۳۲ فٹ تک ہوتی ہے جبکہ وزن ۱۰ ٹن تک ہوتا ہے۔ کلر وھیل پیدائش کے وقت ہی ۲.۵ میٹر لمبی ہوتی ہے۔ یہ مچھلی تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے تیر سکتی ہے۔ ڈولفنیں سمندر کی اوپری سطح پر آ کر کھیل کود اور کرتب دکھانے میں مشغول رہتی ہیں۔ پانی میں ماہر تیراک کی طرح بڑی بڑی چھلانگیں لگاتی ہیں۔ یہ منظر بڑا ہی دلچسپ اور دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے ڈولفن کو لوگوں کا پسندیدہ جانور مانا جاتا ہے۔

ڈولفن ایک وقت میں صرف ایک ہی بچہ دیتی ہے، جسے جوان ہونے میں چار سے پانچ سال کا وقت درکار ہوتا ہے۔ یہ انسان دوست جانور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اسی خوبی کی بدولت انہیں سماجی جانور بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی طاقتور دم کی وجہ سے پانی میں تیزی سے تیر سکتی ہے۔ سطح سمندر میں رفتار ۲۰ میل فی گھنٹا ہے۔

آسٹریلیا کے قانون کے تحت ڈولفن مچھلیوں کو تنگ کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ ان کو تنگ کرنے والے افراد کو سخت سزا کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ پریشان کن امر یہ ہے کہ ڈولفن زیادہ شکار کیے جانے اور آبی آلودگی کی وجہ سے ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ اگر اس خوبصورت جانور کو بچانے کے لیے سنجیدہ کوششیں نہ کی گئیں تو آئندہ چند دہائیوں میں ڈولفن صفحۂ ہستی سے مٹ سکتی ہے۔

◆◆◆



اسکول کا میدان جو چند لمحے پیشتر معصوم بچے اور بچیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، خالی ہو چکا تھا۔ گھاس پر کہیں کہیں کاغذ کے ٹکڑے اور چیونگم کے ریپر بکھرے نظر آرہے تھے۔ اساتذہ اسٹاف روم سے نکل کر اپنی اپنی جماعت کی فائل دبائے سامنے برآمدے سے گزرتے چلے جارہے تھے۔

بچوں کو پڑھانے کا یہ تجربہ کتنا دلکش تھا! تدریس کی یہ ملازمت اُس نے بہت شوق سے اپنائی تھی۔ ایم اے اکنامکس کے بعد اسکول میں پڑھانے کے رجحان نے گھر والوں کو حیران کردیا تھا۔ ان کا خیال تھا، وہ کسی ملٹی نیشنل فرم یا بینک میں ملازمت کرے گا...... کئی رشتے دار بھی اس سے خفا خفا تھے۔

ایک استاد کے لیے اس کے دل میں جو احترام' وقعت اور حیثیت تھی، یہ اُسی کا نتیجہ تھا۔ امتحان کا نتیجہ آتے ہی وہ اپنے والد کے پرانے دوست، انکل سعود جان سے ملنے جا پہنچا جو ایک پرائیوٹ اسکول کے سربراہ اور پرنسپل تھے۔ اسکول میں خالی آسامی کی جگہ پاتے ہی اس نے بحیثیت استاد عملی زندگی کا آغاز کردیا۔

وہ جانتا تھا کہ اگر کسی کے ساتھ زیادتی ہورہی ہے تو وہ استاد ہے۔ جسے اتنی مراعات نہیں مل سکیں جو اس کا حق ہیں۔ اور اس اکھاڑ پچھاڑ میں سب سے بڑھ کر جو متاثر ہوا، وہ ہمارا نوخیز ذہن، ہمارا مستقبل ہے۔ وہ معصوم بچے جو ایسے معمار وطن کے سپرد ہیں جس کی اپنی صبح کا آغاز مایوس کن ہوتا ہے۔ جو گھر سے مالی پریشانیوں و الجھنوں کے انبار لیے اسکول آتا اور شام گئے اپنی الجھنوں سے نمٹنے اور دن بدن بڑھتی مہنگائی سے جنگ لڑتے پریشان حال گھر کی دہلیز پہ دوبارہ قدم رکھتا ہے۔

کچھ ناعاقبت اندیش ایک ٹیچر کے خلاف یہ ہرزہ سرائی بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ بس جی...... جسے کہیں نوکری نہ ملے، وہ استاد بن جاتا ہے۔ کاش یہ ملک اچھے اساتذہ کے سپرد ہو جائے جو بچوں کے ذہنوں کی آبیاری کریں...... پھر یہ جو رونا رویا جاتا ہے کہ ملک میں انصاف نہیں، بے ایمانی ہے، دھاندلی ہے، وہ قِصّہ پارینہ بن جائے۔

مگر ہو کیا رہا ہے؟ نہ اساتذہ کو علم بانٹنے کا ذوق شوق نہ طالب علم کو علم سیکھنے کا جذبہ۔ ٹیوشن کے چکروں میں الجھا ہوا تھکا ہوا بیزار صورت استاد! بورڈ پہ چاک سے چند لائنیں کھینچتا اور سبق رٹواتا ہوا ایسا شخص جس کا علم صرف کتاب کے چند اوراق میں سمٹ کر ٹھٹھر چکا۔ جسے نہ نئی کتابوں کی جستجو ہے نہ نئے خزانوں سے کچھ انوکھا ڈھونڈ لانے کا جذبہ...... نہ تحقیق نہ جستجو......

بچے بھی پیریڈ ختم ہونے کے اِنتظار میں کتابوں کی سیاہ لائنوں پر بے سوچے سمجھے نظریں دوڑاتے رہتے ہیں۔ چند سر پھرے اساتذہ کو چھوڑ کر بچے رٹو طوطے بنائے جارہے ہیں۔ علم کی لو، خود علم دینے والے کے ہاتھ میں پھڑ پھڑا رہی ہے۔ تقریباً اَسی فیصد سکولوں کی لائبریریوں کو تالے لگے ہیں۔ صرف انسپکشن ٹیم کے لیے لائبریری کھول کر چند تصاویر اتروالی جاتی ہیں۔

فہیم ایک مشن، مقصد اور انقلابی سوچ لے کر اسکول میں آیا تھا۔ وہ علم کا امین تھا۔ اس امانت کو پوری دیانتداری کے ساتھ اگلی نسل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ پڑھاتے ہوئے جتنا سکون اور روحانی اطمینان اُسے نصیب ہوا تھا، وہ اس کی زندگی کو اور بھی روشن بنا رہا تھا۔

فہیم کے والد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ اس کے بڑے بھائی گریجوایشن کے بعد والد کے ساتھ ہی کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ اس کے اسکول جانے پر والد کچھ دن ناراض رہے۔ دراصل وہ اُسے اعلیٰ مقام پر دیکھنے کے متمنّی تھے اور اسی لیے اس کے چچا اور ماموں بھی نوکریوں کے تراشے لا لا کر اُسے دکھا رہے تھے۔

لیکن......!! وہ خود سے سوال کرتا...... جب وہ پڑھاتے ہوئے سکون محسوس کرتا ہے تو یہ سب مجھے اس مقدس مشن سے کیوں ہٹانا چاہتے ہیں؟ کیا یہ سب بھول گئے کہ ان کی شخصیت سازی میں اساتذہ کا کتنا حِصّہ ہے؟ ایک استاد کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ شاگرد کے ذہن پہ کیسے کنندہ ہوتے ہیں۔ ایک بہترین استاد کی ذہنی، اخلاقی و روحانی راہنمائی انسان کو کس طرح عروج پر لے جاتی ہے مگر...... وہ سب اس سے بھی زیادہ وزنی دلائل رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ تمام عمر ایک دوسرے درجے کی زندگی بسر کرے گا۔

اُس نے سب کو ایک جواب دے کر خاموش کردیا کہ خود حضور پاک ﷺ بھی معلمؐ تھے اور علم پانے کی ہی دعا مانگا کرتے تھے۔ اس کی باتوں اور دلائل کے سامنے وہ چپ رہ جاتے لیکن تنہائی میں کہتے:

"یہ اگر سمجھنا نہیں چاہتا تو ہم کچھ نہیں کر سکتے...... مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ اخراجات بڑھ رہے ہیں۔ یہ کل کو شادی کے بعد اپنے خاندان کا سہارا بن سکے گا یا نہیں؟"

ادھر وہ سوچتا "اللہ پاک رزق دیتا ہے، مجھے بھی دے گا"۔

ابھی اسے آئے دو ماہ بھی مکمّل نہیں ہوئے تھے کہ ایک افتاد آن پڑی۔ آدھی چھٹی کے بعد جب دوبارہ کلاسوں میں حاضری لی جارہی تھی تب اچانک ایک بچے نے دروازے پہ دستک دی۔

"سر یہ آپ کا خط ہے شاید...... یہ مجھے ایک انکل نے ابھی چلتے چلتے پکڑایا ہے کہ آپ کو دے دوں......"

"خط...... کس کا آگیا؟ شاید کوئی دعوت نامہ ہوگا"۔ اس نے سوچا۔

لیکن خط تھا یا بندوق کی گولی۔ القابات کے بعد لکھا تھا۔

"یہ سیٹ فی الفور خالی کردو...... اس اسکول سے شکل گم کرو...... یہ اسکول نہیں کھائی ہے۔ اس میں گر کر بچ نہیں سکو گے۔

"تمھارا خیر خواہ......"

بچے اس لمحے اسی کی طرف متوجہ تھے۔ اپنی حیرانی اور پریشانی کو اس نے بڑی مہارت سے چھپا کر خط جیب میں ڈالا اور بچوں کو معمول کے مطابق پڑھانے لگا۔

بچے اسکول کا کام کر رہے تھے، لیکن وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا..... یہ خط...... ؟ کیسے؟ آخر کسی کو میری موجودگی اتنی کیوں کھٹک رہی ہے... یہ بچے نہیں بلکہ کسی بالغ انسان کے الفاظ ہیں۔ کیا اُسے دھمکایا جا رہا ہے؟ اُسے بے وقوف بنایا جا رہا ہے؟ کیا اُسے آزمایا جا رہا ہے......؟ خط اُس نے گھر جا کر ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا۔ یہ ضرور کسی کی شرارت ہے، اسے سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔

چند دن خیریت سے گزر گئے۔

پرنسپل صاحب اس کی جماعت میں دو تین بار آئے۔ نارمل انداز میں پڑھائی اور بچوں کے بارے میں پوچھا...... اُس نے خط کا ذکر گول کر دیا۔

چوتھے روز یونہی کلاس لیتے لیتے اچانک چھوٹے سے بچے نے کے دروازے پہ رک کر کہا۔

"سر آپ کا خط"۔

وہ یہ جملہ سنتے ہی تیزی سے باہر لپکا تا کہ خط بھیجنے والے کو دیکھ سکے۔ اگر سامنے ہو تو پکڑ سکے لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔

اس نے خط جیب میں ڈال لیا...... وہ بچوں کے سامنے اپنے کسی بھی ردعمل کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھر جا کر تنہائی کا موقع پاتے ہی اُس نے خط جیب سے نکال کر پڑھا۔ خط تھا یا انگارے۔ وہی طرز تحریر، وہی دھمکی...... تم ابھی تک یہیں ہو۔ تم نے ابھی تک استعفا کیوں نہیں دیا؟ اس سیٹ کو خالی کر دو ورنہ میں تمھیں ایسی سزا دوں گا جو تمھیں عمر بھر یاد رہے گی۔

تمھارا خیر خواہ

یہ خط بھی اُس نے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا۔ لیکن دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ کون اس کا نادیدہ دشمن تھا جو ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا......؟ وہ تو اس سکول میں بالکل نیا تھا۔

چند دن بعد پھر خط ملا جس میں پرنسپل اور سکول کے خلاف اچھے ریمارکس نہیں تھے۔ لکھا تھا۔ "اپنی جان بچاؤ اور یہاں سے جلدی دفع ہو جاؤ۔ ورنہ یہ پرنسپل تمھیں اتنا تنگ کرے گا کہ تم جان سے تنگ آجاؤ گے۔ فقط تمھارا خیر خواہ۔

> فہیم ایک مشن، مقصد اور انقلابی سوچ لے کر اسکول میں آیا تھا۔ وہ علم کا امین تھا۔ اس امانت کو پوری دیانتداری کے ساتھ اگلی نسل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ پڑھاتے ہوئے جتنا سکون اور روحانی اطمینان اُسے نصیب ہوا تھا، وہ اس کی زندگی کو اور بھی روشن بنا رہا تھا۔

یہ خط اُس نے نہیں پھاڑا، اُسے چھپا لیا۔ لیکن وہ اپنی اڑتی رنگت کو اپنی ماں کی نظروں سے چھپا نہیں سکا۔

"کیا بات ہے فہیم بیٹے...... تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تمھارے ابو نے اسی لیے تو پڑھانے سے منع کیا تھا کہ تم دماغ سوزی کرتے رہو گے"۔

"ارے نہیں میری پیاری امی جان...... بس میری طبیعت خراب ہے۔ پڑھانا پڑھنا تو میری کمزوری ہے"۔

"تم خاصے کمزور لگ رہے ہو۔ کیا پڑھانا بہت مشکل کام ہے؟ دیکھو تو چہرہ بھی زرد ہو رہا ہے۔ یا تم اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھ رہے۔ اگر ایک دن چھٹی لے لو تو تازہ دم ہو جاؤ گے"۔

"یہ ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے تھوڑا سا آرام مجھے سکون بخشے گا"۔

چھٹی کا دن اس کے غور و فکر کرنے کا دن تھا۔ وہ اپنے

کمرے میں خط سامنے رکھے سوچ رہا تھا کہ ایسے لایعنی خطوط کا کیا حل کرے۔ کسے اپنا رازِ دل سنائے؟ خطوط میں دھمکیاں بھی تھیں، اس کی تحقیر بھی۔ اچانک اُسے اپنے دوست راشد بھٹی کا خیال آیا۔ اس کے والد پولیس میں اعلیٰ عہدے پہ تعینات تھے۔ راشد نے تحمل سے اس کی بات سنی۔ پھر اسے کہا کہ وہ چند روز بعد فراغت ملتے ہی اپنے والد سے بات ضرور کرے گا۔ اس کے والد دورے پہ غیر ملک گئے ہوئے تھے۔

وہ اسکول جو اس کا جذبہ، اس کا سکون اور مشن تھا، وہی اب اُسے عجیب سا گورکھ دھندہ لگنے لگا۔ علم بانٹنے آیا تھا اور کوئی نادیدہ ہاتھ اس کے ہاتھ سے علم کی شمع چھین لینا چاہتا تھا۔

وہ عجیب سے خوف میں مبتلا ہو گیا لیکن اس خوف سے اسے جنگ کرنا تھی۔ وہ کسی نادیدہ دشمن کے آگے سرنگوں نہیں ہونا چاہتا تھا۔

چند روز بعد راشد کا فون آیا کہ اس کے والد وطن واپس آ چکے۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے دوست کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور پھر ساری داستان بلا کم و کاست سنا ڈالی...... وہ خطوط جو پھاڑے نہیں تھے، ساتھ لیتا آیا تھا۔

راشد کے والد شیر خان کے ماتھے پر سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے کہا "یہ خاصا گھمبیر کیس ہے۔ اسے آپ تنہا حل نہیں کر سکتے۔ آپ کو پرنسپل صاحب کے علم میں یہ سب کچھ لانا ہوگا"۔

پھر کچھ ہی دیر میں تینوں پرنسپل کی رہائش گاہ پہ موجود تھے۔ پرنسپل سعود جان رات کے آٹھ بجے ایک اہم شخصیت اور پھر فہیم کو اپنے گھر میں اس وقت دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکے لیکن تحمل اور بردباری جو اُن کا شیوہ تھا، اُسے بروئے کار لاتے ہوئے گویا ہوئے...... "خوش آمدید! آپ سب اس وقت تشریف لائے۔ خیریت ہے نا؟"

"سر خیریت نہیں ہے، اسی لیے آپ کو اس وقت زحمت دی"۔ وہ بولا۔

جب اپنے آنے کا مقصد اور وہ خطوط نکال کر ان کی میز پر رکھ چکے تو پرنسپل سعود جان کا چہرہ املتاس کی طرح پیلا پڑ گیا۔

"اوہ میرے اللہ...... یہ کیا ڈراما چل رہا ہے۔ پچھلے چند ماہ سے میں اپنے دو ٹیچر اس لیے فارغ کر چکا کہ ان کے بارے میں مجھے ایسے ہی خطوط ملے کہ یہ لوگ اچھے نہیں، انہیں فوراً نکال دو۔ ورنہ انجام بُرا ہوگا"۔

"کیا میرے بارے میں بھی......"

"ہاں...... تمھارے بارے میں بھی ایسے ہی خطوط ملنا شروع ہوئے تو میں چونک گیا۔ اگر تمھارے پس منظر اور شرافت کو میں ذاتی طور پہ نہ جانتا ہوتا تو شاید میں بدگمان ہو جاتا۔ لیکن میں اس بار سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہے۔ کوئی سازش کر رہا ہے اور میں نے نادانستگی میں اپنے بے گناہ اساتذہ کو سکول سے نکال دیا۔ آہ۔ وہ کیسے رو رہے تھے، گڑگڑا رہے تھے...... اور اب یہ......!"

"مسئلہ یہ ہے کہ مجرم کون ہے اور وہ کیا چاہتا ہے؟ آخر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ ہمیں سوچنا ہوگا......" شیر خان بولے۔

"کوئی میرے ادارے اور میرے اس لگائے ہوئے پودے کا دشمن ہے۔ لیکن کون؟ کون ہو سکتا ہے؟ میرے تمام اساتذہ بہت سلجھے ہوئے اور نیک سیرت لوگ ہیں۔ میں اُن کے بارے میں ایسا سوچ نہیں سکتا"۔

"لیکن یاد رکھیں پرنسپل صاحب، دشمن بعض اوقات گھات لگا کر وار کرتا ہے اور وہ شخص دشمن نکلتا ہے جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا"۔

پرنسپل سعود جان نے پریشانی سے سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور پوچھا "اب کیا کریں؟"

"چوکنا رہنا ہوگا۔ میں اپنی صوابدید پر دو عام کپڑوں میں ملبوس اپنے بہترین سپاہی اسکول بھیج دوں گا۔ انہیں کسی چھوٹے موٹے کام پر لگا کر کسی پہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ پولیس کے آدمی ہیں۔ ہم اب خطوط کا ڈراما زیادہ دیر چلنے نہیں

دیں گے‘‘۔

دوسری صبح عام سی تھی۔ سورج کی کرنیں پھولوں کو تازگی اور ہوا میں گرماہٹ بخش رہی تھیں۔ اسکول حسب معمول چہل پہل اور آوازوں سے معمور تھا۔ لیکن پرنسپل سعود جان پریشانی کے عالم میں بڑی سی کھڑکی سے باہر آتے جاتے اسٹاف اور بچوں کو دیکھ رہے تھے۔

ایک ایک استاد کا چہرہ ان کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

ماجد......؟ نہیں نہیں، وہ بہت شریف سلجھا ہوا ہے‘ کام سے کام رکھنے والا۔ سیلف میڈ آدمی ہے۔ بال بچوں کی ذمہ داریوں میں الجھا ہوا۔ گزشتہ تین سال سے ملازم ہے۔ کبھی اس کے بارے میں کسی بچے نے یا اُن کے والدین نے شکایت نہیں کی۔

فیاض صاحب...... نہیں بھئی نہیں۔ وہ بہت سنیئر ٹیچر ہیں۔ وہ تو ایسی اوچھی حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

غنی صاحب ...... نہیں وہ باریش مذہبی خیالات رکھنے والے نیک آدمی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ سوچنا بھی عبث ہے۔

نذیر صاحب...... نہ نہ۔ وہ تو آنکھ کے آپریشن کے بعد ابھی لوٹے ہیں۔

فاران صاحب...... چلو مانا وہ بہت ہنس مکھ اور زندہ دل آدمی ہے لیکن وہ اپنے کام میں یکتا اور اسکول کی فلاح میں پیش پیش ہوتا ہے۔ ایسا وہ ہرگز نہیں کرسکتا۔

امجد صاحب...... کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ بعض اوقات کرسی پہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتے ہیں۔ والدہ اور بہن بھائیوں کے واحد کفیل، وہ بھی ایسا نہیں کرسکتے۔

ساری لیڈیز ٹیچرز بھی سلجھی ہوئی ہیں، ذمہ دار، کام کی لگن میں مگن‘ ہمہ وقت بچوں کی کاپیاں چیک کرتی ہوئیں۔ کلاس روم میں آرٹ ورک کرواتی ہیں۔ کبھی ڈراموں اور ڈیبیٹ کی تیاری جاری ہے۔ کسی پر منفی شخصیت کا شک بھی نہیں ہو سکتا؟ اوہ اللہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایک گرہ ہے جو کھل ہی نہیں پا رہی......؟؟

اُس دِن اسکول میں بظاہر ماحول پرسکون تھا۔ بے چینی اور بے قراری جن دلوں میں تھی‘ وہ دل میں ہی پوشیدہ تھی......

یہ خط بھی اُس نے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا۔ لیکن دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ کون اس کا نادیدہ دشمن تھا جو ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ آخر کیوں؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا......؟ وہ تو اس سکول میں بالکل نیا تھا۔

سب کچھ معمول کے مطابق لگ رہا تھا۔ جماعتوں میں تمام اساتذہ اپنی اپنی پڑھائی میں مشغول تھے۔ اپنی سوچوں میں گم پرنسپل اس وقت کاریڈور سے گزرتے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ تبھی پولیس کا آدمی جو سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا، ایک منحنی سے نوجوان کو گلے سے دبوچے ہوئے لایا......

’’سر، یہ دیکھیں، یہ ہے مجرم۔ میں نے اسے خط ایک بچے کو پکڑاتے ہوئے دیکھا۔ اور ایک خط ابھی اس کی جیب میں بھی ہے......‘‘

پرنسپل کی میز پہ ایک جیسی تحریر کے دو خط پڑے تھے۔ وہ خط نہیں انگارے تھے۔ وہ اُسے شعلہ باز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے:

’’ٹھہرو‘‘ تم پہلے بتاؤ، تم کون ہو؟ اور کس کے ایما پر یہ کام کررہے ہو......‘‘

نوجوان منمنایا اور بولا ’’سَر، سَر میں ...... میں خاکروب فرید کا بیٹا ہوں‘‘۔

’’جاؤ سر فہیم کو جلدی بلا کر لاؤ۔ وہ اس وقت دسویں جماعت میں ہوں گے۔ اُنہیں کہو، آ کر اُس شیطان کا دیدار کر لیں جس نے ان کی اور میری نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ اس کے باپ کو بھی بلاؤ۔ پتا کرو۔ پچھلے کوارٹروں میں رہتا ہے‘‘۔

’’ج۔ جی...... جی......‘‘ سپاہی بھاگتا ہوا باہر نکلا۔

پرنسپل کا چہرہ اُس وقت غُصے سے تپ کر لال ہو رہا تھا۔

فہیم پرنسپل صاحب کے دفتر میں داخل ہوا...... دھڑکتے ہوئے دل میں سوچوں کا طوفان اُمڈا چلا آرہا تھا۔ دشمن کا پکڑے جانا بہت بڑی کامیابی ہے۔ وہ آج ہی واقف ہوا تھا کہ چور اور سپاہی کے کھیل میں جب سپاہی چور کو پکڑ لیتے ہیں تو کتنی خوشی ہوتی ہے۔

پرنسپل سعود جان کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ فہیم کو دیکھتے ہی وہ اس کی طرف پلٹتے ہوئے بولے:

’’اس منحوس آدمی سے ملو۔ یہ مجھ سے زیادہ تمھارا مجرم ہے اور شاید تم سے بھی زیادہ میرا مجرم۔ اس سے پوچھو...... اس نے ایسا کیوں؟...... کیوں کیا؟

فہیم نے زمین پر بیٹھے اس منحنی سے نوجوان کو دیکھا جس کے بال خشک جھاڑی کی طرح بے رونق اور چہرہ کسی مریض کی طرح مدقوق تھا۔ لڑکے کی آنکھیں دہشت اور وحشت سے پھیل کر بڑی لگ رہی تھیں۔

’’کیوں تم نے مجھے دھمکیاں دیں؟ کیا دشمنی تھی میری اور تمھاری؟ میں تو تمھیں جانتا بھی نہیں کہ تم کون ہو؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟......‘‘ فہیم نے اس کا سر اونچا کرتے ہوئے پوچھا...... وہ کانپ رہا تھا...... اس کے ہونٹ سِل چکے تھے۔

’’یہ نہیں بولے گا۔ یہ ایسے نہیں بولے گا......‘‘

پرنسپل سعود جان نے اس کی کمر پہ بید رسید کیا۔ درد کی شدت سے وہ کلبلایا...... اور اپنا سر بازؤں میں چھپا کر رونے لگا......

اس کا بوڑھا باپ بھی تھوڑی دیر میں ہانپتا کانپتا آپہنچا۔ پرنسپل نے دو خط نوجوان کی پھٹی جیب سے نکال کر باپ کے سامنے کردیے اور بولے:

’’اپنے بیٹے کے کارنامے دکھانے کے لیے تجھے بلایا ہے بابا دینو۔ تجھ پر ترس کھا کر اسکول میں نوکری دی، کوارٹر دیا اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ تیرا ہی بیٹا، تیری ناخلف اولاد ہمارے لیے گڑھے کھود رہا ہے۔ یہ دیکھ اس کے خطوط جو وہ لکھ لکھ کر دھمکیاں دیتا رہا ہے‘‘۔

بوڑھے باپ کے چہرے کا رنگ جو پہلے ہی اُڑا ہوا تھا‘ غم سے تاریک ہو گیا۔ کالی کالی پتلی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ زبان گالیاں بکنے لگی۔ وہ اپنے بچے پہ باز کی طرح جھپٹا۔ پرنسپل صاحب سے بید لے کر اچانک اس پر پل پڑا......:

’’میں نے کیا آج کے دن کے لیے تجھے پڑھایا تھا۔ میں نے تیرے لیے دن رات محنت کی‘ فاقے کاٹے‘ خود فقیروں کی طرح رہا تاکہ تو پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جائے۔ تیرے چھوٹے بہن بھائی اسی انتظار میں رہے کہ تجھے ڈِگری مل جائے اور ہمارے دن پھر جائیں۔ میں نے تیرے اچھے مستقبل کے خواب دیکھے اور تو نے یہ صِلہ دیا! تو پیدا ہوتے ہی مَر کیوں نہیں گیا۔! یا تیری یہ ذلت اور اپنی بدنامی دیکھنے سے پہلے میں کیوں نہیں مر گیا......‘‘

بوڑھا باپ اپنے دکھ کی انتہا پہ کھڑا تھا۔ اس ملاح کی طرح جس کی عمر بھر کی پونجی آنکھوں کے سامنے ڈوب رہی ہو۔

لگاتار مار کھانے کے بعد نوجوان کے چہرے پہ جا بجا نیل پڑ گئے۔ قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے اور وہ ایک طرف جھول رہی تھی۔ ایک ہونٹ پھٹ گیا اور اس سے خون رسنے لگا جسے وہ قمیص کی آستین سے مسلسل پونچھ رہا تھا۔

’’صرف یہ بتا دو...... تمھارا ایسا کرنے کا مقصد کیا تھا؟‘‘ فہیم نے پوچھا۔

کمرے میں کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی کیونکہ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا۔

’’ہاں...... ہاں...... بولو...... جواب دو......‘‘

نوجوان کے ہونٹ کپکپائے......لیکن آواز نہ نکل سکی۔

''بولو! جواب دو......تم نے ایسا کیوں کیا؟ جب کہ تم پڑھے لکھے ہو۔ مانا کہ تمھارا باپ جاہل ہے لیکن تم تو جاہل نہیں''۔ فہیم زور سے بولا۔

''بولو...... بولو......'' پرنسپل صاحب کی آواز بہت اونچی تھی......

''سر......میں...... میں گناہ گار ہوں......لیکن سر...... میرے پاس ٹیچر کی ایک سیٹ خالی کروانے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مم...... میں نے تین سال سے مختلف دفتروں میں نوکری کی درخواست دے رکھی ہے، لیکن مجھے نوکری نہیں ملی۔ میں......میں نے بھی دفاتر کے کئی چکر لگائے، لوگوں کی منتیں کیں لیکن مجھے میرے کمزور خاندانی پس منظر کی وجہ سے ویٹنگ لسٹ میں ڈال رکھا ہے۔ سب نے...... سب نے...... کیونکہ میں ایک غریب کا بیٹا ہوں...... میری کوئی شناخت، میری کوئی پہچان نہیں۔ کوئی سفارش نہیں۔ میں یہ سیٹ اپنے لیے خالی کروانا چاہتا تھا کہ پرنسپل صاحب مجبور ہو جائیں اور مجھے نوکری پہ رکھ لیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ......مجھے معاف کر دیں''۔

اب وہ بازوؤں میں سر چھپائے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

سب حیرت اور صدمے سے معاشرے کے اس ٹوٹے پھوٹے نوجوان کو دیکھتے رہ گئے جس کے وجود سے معاشرتی ناہمواری، ناقدری اور اونچ نیچ کی سڑاند اُٹھ رہی تھی۔

''سر! ایف۔ آئی۔ آر اس نوجوان کے خلاف کٹوانی ہے یا اس کے والد کے خلاف بھی؟'' ایک سپاہی نے پوچھا۔

تبھی فہیم اپنے سینے میں گھٹن لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایف۔ آئی۔ آر ایک فرد کے خلاف ہونی چاہیے یا پورے معاشرے کے خلاف...... جہاں پڑھا لکھا بے روزگار نوجوان تشنہ خوابوں کے لاشے اُٹھائے جرائم کی زمین پر پاؤں دھر چکا ہے۔ فہیم جو سوچ رہا ہے اس کا جواب شاید کسی کے بھی پاس نہیں۔

رسول کریم ﷺ نے فرمایا

حضرت مقدام بن معدی کربؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی پیٹ سے بُرا کوئی برتن نہیں بھرتا۔ آدمی کو تو چند لقمے ہی کافی ہیں، جن سے اس کی کمر سیدھی رہے۔ اگر آدمی پر اس کا نفس غالب آجائے (اور وہ زیادہ کھانا چاہے) تو ایک تہائی کھانے کے لیے ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے (رکھ لے)''۔

فوائد و مسائل:

۱۔ ضرورت سے زیادہ کھانا ہضم نہیں ہوتا اور کوئی فائدہ پہنچائے بغیر جسم سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس لیے اتنا ہی کھانا چاہیے جو پوری طرح ہضم ہو کر جسم کے لیے مفید ثابت ہو۔

۲۔ کھانے کا مقصد زندگی قائم رکھنا ہے، لہٰذا طرح طرح کے پُرتکلف کھانے تیار کرنے اور انھیں کھانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کسی نیکی کے مفید اور بامقصد کام میں صرف کیا جانا چاہیے۔

☆☆☆

کسی نے حضرت علیؓ سے پوچھا: ''اگر کسی شخص کو کمرے میں بند کر دیا جائے تو اس کا رزق کہاں سے آئے گا؟''
آپؓ نے فرمایا: ''جہاں سے موت آئے گی''۔

دنیا بھر میں اپنی ذہانت و محنت سے ملک و قوم کا نام روشن کرنے والی دلیر پاکستانی خاتون کی پُرعزم داستان

رضوان علی شاہ

شمع زہرہ

Jetzy

''میری ماں، بہن اور میں...... ہم سب مل کر کام کرتے تھے''۔ یہ کہنا ہے پاکستان میں اپنے گھر سے گارمنٹس کا معمولی کاروبار شروع کر کے دنیا کے معاشی مرکز وال اسٹریٹ' نیویارک میں ایک فرم قائم کرنے والی خاتون شمع زہرہ کا، جو آج کامیاب کاروباری شخصیت ہیں۔

کراچی کے ایک چھوٹے اپارٹمنٹ سے نکل کر امریکی شہر نیویارک کی وال اسٹریٹ تک پہنچنے کا یہ سفر بہت متاثر کن ہے۔ اس کے پیچھے جہد مسلسل کی ایک سبق آموز داستان پوشیدہ ہے۔ سفر کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب شمع زہرہ نے انتہائی کم عمری میں صرف ہائی سکول پاس کرنے کے بعد اپنا کاروبار کرنے کا سوچا۔ فوراً ہی اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے انھوں نے ماں اور بہن کے ساتھ مل کر اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں محدود پیمانے پر گارمنٹس کا کاروبار شروع کر دیا۔

دن رات کی محنت شاقہ کے بعد ان کا یہ کاروبار چل نکلا۔ بتدریج ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے وہ وقت بھی آیا جب انھوں نے گارمنٹس کی اپنی ایک چھوٹی سی فیکٹری قائم کر لی جس میں کارکنوں کی تعداد محض چھ افراد پر مشتمل تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کا کاروبار اس عروج تک جا پہنچا کہ وہ نہ صرف فائیو اسٹار ہوٹلوں میں اپنے فلیگ شپ سٹور کھولنے میں کامیاب ہو گئیں جو آمدن کے لحاظ سے امریکہ کے مشہور ''Macy's and pop up'' سٹور کے ہم پلہ پاکستانی سٹور سمجھے جانے لگے بلکہ ملبوسات برآمد بھی کیے جانے لگے۔

شمع زہرہ کا کہنا ہے کہ ''خواتین ہونے کی وجہ سے ہمیں اپنے کاروبار میں کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا مگر میری ماں بہت بہادر تھیں۔ انھوں نے میری بہت ہمت افزائی کی اور آج میں ایک بلند مقام پر استادہ ہوں۔ اگر میری ماں میرا سہارا نہ بنتیں تو میں کبھی یہ اعلیٰ مقام حاصل نہ کر پاتی''۔

۱۹۹۴ء میں صرف انیس سال کی عمر میں شمع زہرہ نے اپنا گارمنٹس کا یہ کاروبار فروخت کر کے پائلٹ بننے کی ٹھانی، جو ان کی مہم جویانہ طبیعت کی غمازی کرتا ہے اور جس کے اثرات بعد میں ان کے ایک اور کاروباری منصوبے میں بھی نظر آتے ہیں۔ چلتا ہوا اپنا کاروبار فروخت کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

''میں پاکستان میں پلی بڑھی۔ میں اپنے گھر میں اپنے خاندان کے ساتھ بہت خوش تھی مگر پاکستانی معاشرے میں مردوں کو برتری حاصل ہے اور ان سے مقابلہ کرنا ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ پھر بجلی کے سنگین بحران کے علاوہ چوری چکاری، نوے کی دہائی میں امن و امان کی ناگفتہ بہ صورتحال اور کرفیو کے علاوہ سیکورٹی کے معاملے میں عدم تحفظ جیسے مسائل سے نبرد آزما ہونا بہت مشکل کام تھا۔ اسی وجہ سے مجھے اپنا گارمنٹس کا کاروبار فروخت کرنا پڑا''۔

ٹرینی پائلٹ بننے کے بعد ۱۹۹۵ء میں وہ سٹینڈرڈ چارٹرڈ پاکستان سے منسلک ہوگئیں جہاں انھوں نے اپنے کیریئر کی ابتدا ''ویلتھ مینجمنٹ'' سے کی۔ ترقی کرتے کرتے ان کا شمار ملک کے ''پرسنل ویلتھ ایڈوائزرز'' کی فہرست میں پہلے نمبر پر ہونے لگا۔ انھوں نے شعبۂ بینکاری سے ملحقہ دیگر کاروباری سرگرمیوں مثلاً کریڈٹ کارڈ اور موبائل بینکاری کے قیام اور فروغ میں بھی اعانت کی اور آئی وی آر یعنی Interactive Voice Response کے قیام میں مددگار بنیں۔ ''IVR'' وہ نظام ہے جس کے ذریعے کمپیوٹر انسانی آواز کے ذریعے کسٹمرز کو معلومات فراہم کرتا ہے اور کی پیڈ کے ذریعے اس سے راہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس کے علاوہ ''کسٹمر سروس واک ان سینٹرز'' اور بکثرت فضائی سفر کرنے والے مسافروں کے لیے کریڈٹ کارڈ کے قیام میں بھی شمع زہرہ نے اہم کردار ادا کیا۔ ان کا کہنا ہے ''گو میں ایک بڑے بینک کے لیے کام کر رہی تھی لیکن نئی مصنوعات کے فروغ کے بہت سے مواقع وہاں موجود تھے۔ اس کام میں فائدے کی امید کے لیے معاشی رسک لینے کی جرأت، اپنا کاروبار شروع کرنے اور اس کو ترقی دینے کا پس منظر بہت فائدہ مند رہا اور بہت کام آیا''۔

شمع زہرہ نے بزنس اور فنانس میں ماسٹرز کی دو ڈگریاں لی ہیں۔ ایک آئی بی اے، کراچی سے جو دنیا بھر میں اچھی ساکھ رکھنے والی بہترین اور قدیم درسگاہ ہے۔ آئی بی اے کراچی ۱۹۵۵ء میں یونیورسٹی آف پینسلوانیہ کے وارٹن سکول کے اشتراک سے قائم کی گئی تھی۔ دوسری ڈگری انھوں نے ''ان ار بور مشی گن روس سکول آف بزنس سے حاصل کی۔ اُن کا کہنا ہے ''وہ پاکستان میں دس سال تک فنانس کے شعبے میں سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک اور ایم سی بی بینک میں کام کرتی رہیں اور اس کے بعد امریکہ چلی آئیں۔

۲۰۰۵ء میں مشی گن روس سے گریجویشن کرنے کے بعد شمع زہرہ نے ''مورگن سٹینلے'' (Morgan Stanley) میں ملازمت کر لی۔ ''مورگن سٹینلے'' ایک بین الاقوامی فرم ہے جو عالمی سطح پر مختلف کمپنیوں کو فنانشل سروسز فراہم کرتی ہے۔

۲۰۰۸ء میں پوری دنیا میں جنم لینے والے معاشی بحران سے اس فرم کے ماتحت بینک ''لیہمن برادرز'' (Lehman Brothers) کے راتوں رات دیوالیہ ہونے کے دوران انھیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے بینک اس بحران سے نکل آیا۔

وہ وقت یاد کرتے ہوئے شمع زہرہ کا کہنا تھا: ''مجھے یاد ہے کہ اس معاشی بحران کے دوران جب میں نے مارکیٹیں

کریش ہوتے ہوئے دیکھیں تو میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ یہ صورتحال سب کے لیے سخت ذہنی دباؤ کا باعث تھی اور میرے لیے تو خاص طور پر، کیونکہ اس وقت امریکہ میں میرے قیام کی مدت بڑھنے کا انحصار میری ملازمت پر تھا''۔

شمع زہرہ بتاتی ہیں ''زندگی میں پیش آنے والی مشکلات انسان کو مضبوط بناتی ہیں۔ میں پاکستان کی سب سے کم عمر خاتون کاروباری شخصیت تھی اور یہ مقام پانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بعد میں ایک خاتون ہونے کے ناتے معاشیات اور بینکنگ کی دنیا میں کام کرنا بھی آسان نہیں لیکن ان مشکلات کے ساتھ ساتھ زندگی کئی مواقع بھی فراہم کرتی گئی۔ اگر کبھی مجھے مطلوبہ موقع نہیں بھی ملا تو میں نے اس کو حاصل کرنے کے لیے اور زیادہ محنت کی یہاں کہ اسے حاصل کر لیا''۔

اس تجربے کے بعد وہ پرائیویٹ ویلتھ مینجمنٹ کی طرف چلی آئیں اور امریکہ کی ایک اور مشہور بین الاقوامی فنانس کمپنی ''گولڈ مین ساچس'' (Goldman Sacha) کے ساتھ منسلک ہوگئیں۔ ان کا کہنا تھا ''گولڈ مین ساچس میں میں نے سیکھا کہ ہر وہ کام کرو جو کامیابی میں آپ کا مددگار ہو اور لوگوں کی ترقی پر یقین رکھو۔ گولڈ مین ساچس اور ''مورگن سٹینلے'' میں کام کرنا اُن کے لیے بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ یہاں سے حاصل ہونے والے تجربات نے شمع کے کیریئر کے لیے مہمیز کا کام کیا۔

ان کمپنیوں میں کام کرنے کے بعد وہ اپنے کلائنٹس کے لیے سرمایہ کاری کے طریقۂ کار کو تھوڑا تبدیل کرنا چاہتی تھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے وال اسٹریٹ میں ...سات کے کاروبار میں سرمایہ کاری کی مشاورت فراہم کرنے والی ایک فرم ''الائنڈ انڈیپنڈنٹ ایڈوائزرز'' (Aligned Independent Advisors) کے نام سے قائم کر لی۔

یہ فرم قائم کرنے میں ان کا گارمنٹس کے کاروبار سے وابستہ تجربہ بہت کام آیا جس کو انھوں نے نوعمری میں بھی بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔ اُن کی یہ فرم ''ایگیس کیپٹل'' (Aegis Capital) سے الحاق شدہ ہے۔ یہ ایک لائسنس یافتہ بروکر ڈیلر کمپنی ہے جو FINRA (فنانس انڈسٹری ریگولٹری اتھارٹی) کی رکن ہے۔ یہ گروپ اپنے کلائنٹس کے بلین ڈالروں کے اثاثوں اور ان کے مفادات کی نگرانی کرتا ہے۔ وال اسٹریٹ میں مردوں کی معاشی حکمرانی کے مقابلے میں خواتین کا غالب آنا آسان نہیں جہاں کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو آفیسر کے عہدوں تک پہنچنے والی خواتین کی شرح ہر ۵۰۰ میں سے محض ۸ء۴ فیصد اور ہر ۱۰۰۰ میں سے صرف ۱ء۵ فیصد ہے۔

شمع زہرہ کا کہنا ہے ''ہمارا مشن ایسے لوگوں کے لیے کام کرنا ہے جن کو صرف ایسے فنانس ایڈوائزرز کی ہی ضرورت نہیں جو ان کی مصنوعات فروخت کریں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کی وہ مکمل معاشی ضروریات بھی پوری کر سکیں جو عام مشیران سرمایہ کاری نہیں کر پاتے''۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم اپنے کلائنٹس کو کسی خاص قسم کی مصنوعات کے لیے مجبور کرنے کا کام نہیں کرتے بلکہ اپنے ہر کلائنٹ کی ضروریات کو ذاتی اور انفرادی توجہ دیتے ہیں تاکہ معاشی ترجیحات کے حصول میں ان کی مدد کر سکیں۔

شمع زہرہ مادہ پرستی پر یقین نہیں رکھتیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پیسے کی مینجمنٹ کا تعلق صرف پیسے سے نہیں بلکہ یہ دل کا معاملہ ہے۔ ان کا کہنا تھا ''ہم اپنے معروف کلائنٹس کی قلبی احساس کے ساتھ پرخلوص مدد کرتے ہیں تاکہ وہ محفوظ سرمایہ کاری کے ثمرات سے مستفید ہو سکیں''۔

ان کا ایک اور شوق سیاحت بھی ہے۔ انھیں خیال آیا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس کی مدد سے لوگ اپنے سیاحتی یا کسی بھی نوعیت کے سفر کے دوران بامعنی روابط قائم کر سکیں۔ اپنی

فطری کاروباری صلاحیت بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے سیاحت کے شوقین دیگر لوگوں کی سہولت کے لیے ۲۰۱۴ء میں ایک موبائل ایپ بنانے کا سوچا۔ اسی عرصے میں ان کی ملاقات ''ٹے سایر'' (Ty Sawyer) سے ہوئی جو سیرو سیاحت کی دنیا میں کافی آزمودہ کار شخصیت تھے۔

ان دونوں نے مل کر موبائل فون کی ایک سوشل ایپ بنائی جس کا نام جیٹ زی ''Jetzy'' ہے۔ اس ایپ کے ذریعے سیاح زیادہ سہولت کے ساتھ اپنے سیاحتی سفر کے تجربے سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ وجہ یہ کہ اسی ایپ سے وہ علاقے میں موجود دوسرے سیاحوں اور مقامی افراد کے ساتھ رابطے میں رہتے اور اپنے مزاج اور ذوق کے مطابق کھانے، ثقافتی سرگرمیوں، ساحل سمندر اور ہائکنگ وغیرہ کی معلومات ایک دوسرے کو فراہم کر سکتے ہیں۔ اس ایپ کا ایک نیا فیچر جو حال ہی میں متعارف کروایا گیا ہے، اُس کا نام ''شاوٹ آوٹس'' (Shout Outs) ہے۔ اس فیچر کے ذریعے ارکان اس ایپ کو استعمال کرنے والے تمام لوگوں کو ''شاوٹ آوٹس'' پوسٹ کر کے مختلف سوالات پوچھ سکتے ہیں۔

''Jetzy'' شمع زہرہ کے اعزازات میں ایک قابل فخر اضافہ ہے۔ وہ اکثر و بیشتر سفر کرتی رہتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ سیاحت کے ذریعے زندگی کا مکمل لطف اٹھانا چاہیے۔ وہ لوگوں کی مدد کرنے کے حوالے سے بہت پر جوش ہیں، خاص طور پر زندگی میں ان کا کیریئر بنانے کے لیے۔ اپنے ایم بی اے پروگرام کے دوران وہ کیریئر کونسلر کی حیثیت سے کام بھی کرتی رہی ہیں۔ اپنی ایپ Jetzy کے ذریعے وہ خواتین کی تربیت کرنے کے علاوہ کمپنی کے انٹرنیز کی ٹریننگ بھی مستقل بنیاد پر کرتی رہتی ہیں۔

کاروباری دنیا میں ایک اعلیٰ اور ممتاز مقام حاصل کرنے کے بعد شمع زہرہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے منصوبے بنانے کے بارے میں پرعزم ہیں۔ وہ خاص طور پر خواتین اور بچوں کے لیے کام کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ان منصوبوں کے ذریعے وہ خواتین کو معاشی طور پر اپنے پاؤں کھڑا کرنے میں مدد دیں۔

یہ ہے شمع زہرہ کے عزم و ہمت کی داستان! اس میں خواتین ہی نہیں بلکہ مردوں کے لیے بھی کئی اسباق پوشیدہ ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ اگر انسان کسی کام کا ارادہ باندھ لے اور اس پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہے تو زندگی میں بہت اونچا مقام حاصل کر سکتا ہے۔

باتیں سنوارنے والی

☆ راستوں کی ویرانی اور جلتی دھوپ سے ڈرنے والے منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔

☆ جہاں سے گزرو پھول برساتے جاؤ تاکہ تمھیں اپنی واپسی پر بڑا سا باغ دکھائی دے۔

☆ اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا ہے تو یقین کرو زندگی کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا۔

☆ آتش فشاں پہاڑوں سے ایش ٹرے استعمال کرنے کی توقع نہیں ہونی چاہیے۔

☆ سناٹا جب روح کی گہرائیوں میں اُتر جائے تو رونقیں متاثر نہیں کرتیں۔

☆ محبت حاصل کرنا ہر کسی کے لیے ممکن نہیں لیکن محبت پھیلانا ہر ایک کے لیے ممکن ہے۔

☆ زندگی ہمیں وہ ''کچھ'' کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جس کا ہم نے تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔

☆ ہم کسی کو تب تک مجبور نہیں کر سکتے' جب تک اس کی کسی کمزوری سے واقف نہ ہوں۔

☆ ٹھیس لگے تو ہی شاہکار بنتے اور منظر عام پر آتے ہیں۔



اصول کی خاطر

مرزا ادیب

زر کو رشتوں پر مقدم رکھنے والے ایک حریص نوجوان کا طرح دار فسانہ

فرخندہ نے تیسری بار سامنے گھنٹے کو دیکھا اور بڑبڑائی ''سوا چھے بج چکے، اُف میرے اللہ۔'' جلال کو چار بجے چھٹی ہو جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا راستے میں صرف ہوتا تھا۔ ساڑھے چار بجے تک وہ گھر کی کال بیل پر انگلی رکھ دیتا اور فرخندہ جو اُس کی منتظر ہوتی تھی، فوراً ہی آرام کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑتی۔ مگر اِس شام تو سوا چھے بج گئے تھے اور ابھی تک کال بیل نے اُس کی آمد کی خبر نہیں دی تھی۔

بے اختیاری کے عالم میں وہ دروازے پر گئی۔ ایک پٹ کھولا اور باہر دیکھنے لگی۔ گلی میں لوگ آ جا رہے تھے مگر اِن میں جلال نہیں تھا۔ اُس نے ایک منٹ کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ واپس آ کر کُرسی پر گر پڑی۔ گھڑی میں دو منٹ اوپر ہو چکے تھے۔ وہ کچھ زیادہ مضطرب ہو گئی۔ یکایک کال بیل نے اطلاع دی کہ دروازے پر کوئی آیا ہے۔ اُس نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ جلال آ چکا تھا۔

''اتنی دیر؟''

''ہاں فرخو! کچھ دیر ہو گئی۔ وہاں چلا گیا تھا''۔

''وہاں کہاں؟''

جلال نے اِس سوال کا جواب نہ دیا۔ اندر آیا۔ اپنے تھیلے کو جو سال ہا سال سے اُس کا ساتھ دے رہا تھا، کُرسی کے بازو سے لٹکایا اور خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔

فرخندہ معمول کے مطابق چائے تیار کرنے کی خاطر باورچی خانے کی طرف جانے لگی مگر جاتے جاتے ایک دم رک گئی، پوچھا: ''بتایا نہیں کہاں چلے گئے تھے؟''

جلال نے اُسے واپس آنے کا اشارہ کیا اور وہ تذبذب کی حالت میں وہیں کھڑی ہو گئی۔

''آج چائے نہیں چلے گی، آؤ بیٹھ جاؤ''۔

وہ کُرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں نے بس یونہی اُسے فون کر دیا، ارشد کو"۔

"اپنے بھتیجے کو!" فرخندہ کے چہرے کا تاثر بتا رہا تھا کہ اِس خبر سے اُسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔

"سنو تو! میں بھی یہ ہی سمجھا تھا کہ اُس کا خون سفید ہو گیا ہے۔ اپنے غریب رشتہ داروں کی اُسے کیا پروا ہو گی۔ مگر فرخو جب میں نے اُسے بتایا کہ میں جلال بول رہا ہوں تو کہنے لگا، کہیے انکل! کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ گھر میں خیریت ہے وغیرہ وغیرہ۔"

"کام کی بات نہیں کی؟" فرخندہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"کی کیوں نہیں۔ آخر اُسے فون کرنے کا مقصد کیا تھا۔ میں نے بتایا کہ ایک معاملے میں تمھاری مدد کی ضرورت ہے تو کہنے لگا انکل جب اپنے دفتر سے نکلیں تو یہاں آ جائیں۔ میں دیر تک اپنی فرم میں بیٹھتا ہوں اور اُس نے اپنی فرم کا پورا پتا بتا دیا۔"

"تو گئے وہاں"۔

"ضرور گیا فرخو! اتنا شاندار دفتر ہے کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ کرسی پر بٹھایا، نوکر کو چائے لانے کے لیے کہا اور بڑے ادب و احترام سے میری بات سنی"۔

"یہ تو ٹھیک ہے، یہ کہو کچھ کرے گا بھی یا نہیں"۔

"فرخو! آج تم کو کیا کہوں، لگتا ہے تمھارا موڈ اچھا نہیں"۔

"میرے موڈ کے اچھے یا بُرے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمھارے اس دولت مند مغرور بھتیجے نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ انکل مر گیا یا زندہ ہے۔ تم نہ جانے کیا اُمید لے کر اُس کے ہاں چلے گئے تھے"۔

"اُمید یہ لے کر گیا تھا کہ وہ سیدھے منہ بات نہیں کرے گا لیکن اُس کا رویہ میری سوچ کے بالکل برعکس نکلا۔ بڑی بڑی کوٹھیاں خریدتا اور بیچ دیتا ہے۔ لاکھوں روپے کمائے ہیں۔ بڑا وسیع کاروبار ہے۔ میرا مسئلہ سُن کر بولا، انکل! آپ مطمئن ہو جائیں اب یہ مسئلہ میرا ہے آپ کا نہیں"۔

"تو ہمارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا؟"

بیوی کے اِس استفسار پر جلال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"فرخو! میں نے اُسے گود میں کھلایا ہے۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ایک روز اتنا دولت مند اور بڑا آدمی بن جائے گا" اور تیسرے روز وہ بڑا آدمی جلال کے ہاں چائے پی رہا تھا۔

جلال اُسے دیکھ کر نہال ہو رہا تھا۔ مارے خوشی کے چائے کا کپ وہ ہونٹوں کی طرف لے جانا بھول گیا۔ ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا۔ اُس کے مقابلے میں فرخندہ اُسے کن انکھیوں سے دیکھ کر چائے کا ایک آدھ گھونٹ حلق سے نیچے اُتار لیتی تھی۔

"آنٹی! آپ ذرا وضاحت سے بتائیں، چاہتی کیا ہیں؟" فرخندہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اُسے اظہار کے لیے شاید مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"ارشد بیٹا! میں نے اپنا مسئلہ تمھیں بتا دیا تھا"۔ جلال نے یہ دیکھ کر کہ اُس کی بیوی اظہارِ مطلب میں کچھ ہچکچا رہی ہے، یہ الفاظ کہہ دیے۔

"وہ تو میں سمجھ چکا، مگر آنٹی کی زبانی بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں"۔ ارشد نے ذرا مسکرا کر کہا اور خالی پیالی میز پر رکھ دی۔

جلال ہنس پڑا "گویا آپ کا مطلب ہے کہ ہم میاں بیوی میں اتفاق رائے نہیں"۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، تاہم اُن کی زبانی بھی معاملے کی وضاحت ہو جانی چاہیے"۔

فرخندہ جو ارشد کے لیے نیا کپ بنا رہی تھی، بولی "آپ کے انکل نے بتایا ہو گا کہ شادی کے بعد بیٹی کے لندن چلی

جانے سے ہم دو رہ گئے ہیں۔ ہمارا بڑا گھر ہے جس کی اب ہمیں ضرورت نہیں ہے"۔

"سمجھ گیا"۔ ارشد نے اپنا سر ہلایا۔

"پھر ارشد بیٹا! ہم نے آمنہ کی شادی کے لیے ایک دوست سے ستر ہزار روپے قرض لیا تھا"۔ جلال کہنے لگا

"ستر ہزار؟" ارشد دوسری پیالی ہونٹوں سے لگا کر بولا۔

"جی ہاں۔ وہ دوست اپنا مکان بنانا چاہتا ہے۔ قرض کی رقم واپس کرنا ہو گی۔ تمھاری آنٹی نے اپنا زیور رہن رکھ کر بینک سے دس ہزار لیے تھے جو شادی پر خرچ ہو گئے تھے"۔

"کل اَسّی ہزار قرض ہے"۔ فرخندہ نے بات اختصار سے کہہ دی۔

"اب میں کچھ سمجھ گیا"۔ ارشد چائے کے جلدی جلدی گھونٹ بھر رہا تھا۔ "یہ مکان بک جانا چاہیے اور آپ دونوں کے گزارہ لائق ایک چھوٹا مکان خریدنا ہو گا۔ یہی آپ کا مقصد ہے نا؟"

"بالکل"۔ جلال نے بے تابی سے جواب دیا۔

"آنٹی! آپ بھی یقیناً یہی چاہتی ہیں؟"

جلال پھر ہنس پڑا، کہنے لگا: "ارشد ہم دونوں میں شاذ و نادر ہی کسی معاملے میں اختلاف رائے ہوا ہے"۔

"تو ٹھیک ہے۔ آپ مطمئن ہو جائیں۔ اصل میں، میں ایک بااصول کاروباری آدمی ہوں۔ کسی صورت بھی اصول سے روگردانی نہیں کرتا۔ آنٹی سے پوچھنا بھی ضروری تھا ہی"۔ یہ کہہ کر ارشد نے اپنے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ارشد! پہلی مرتبہ اپنے چچا کی جھونپڑی میں آئے ہو۔ ذرا رُک جاؤ"۔ جلال کے لہجے میں غیر شعوری طور پر جذبہ تشکر کے ساتھ ملتجیانہ انداز بھی تھا۔

"آپ اسے جھونپڑی کہتے ہیں... واہ انکل شاندار مکان میں رہتے ہیں، یہ بتایئے اور کوئی جائیداد ہے"؟

"اور کوئی جائیداد کہاں سے آتی؟ کلرک بھرتی ہو کر سپرنٹنڈنٹ کی سیٹ تک پہنچا ہوں"۔

"انکل! بُرا نہ مانیے، ابا جی مرحوم اور آپ دونوں نے ترقی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کسی اچھے اصول کو اپنایا ہی نہیں۔ اصول کے بغیر زندگی میں ترقی نہیں ہوتی"۔

"اب بڈھے طوطے کو کیا نصیحت کر رہے ہو"۔ جلال نے کہا اور اِس پر ارشد کے علاوہ فرخندہ بھی ہنس پڑی۔

"انکل! بُرا نہ مانیے، ابا جی مرحوم اور آپ دونوں نے ترقی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کسی اچھے اصول کو اپنایا ہی نہیں۔ اصول کے بغیر زندگی میں ترقی نہیں ہوتی"۔ "اب بڈھے طوطے کو کیا نصیحت کر رہے ہو"۔ جلال نے کہا

کھانے سے فارغ ہو کر جب سب کھانے کی میز سے اُٹھ کر دوبارہ ڈرائنگ روم کے صوفوں پر آ بیٹھے اور چائے کا دور چلنے لگا تو ارشد بولا:

"انکل! میں نے اپنی طرف سے آپ کی پریشانی دور کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو میرا منصوبہ پسند نہ آئے مگر میں نے اس میں کوئی کمی نہ آنے دی"۔

جلال نے جو اپنے بھتیجے کے احسان تلے دبا جا رہا تھا کہنے لگا۔

"مجھے اِس منصوبے کا علم نہیں۔ مگر مجھے مکمل یقین ہے، یہ ہمارے لیے بیحد مفید ہو گا"۔

"جی ہاں۔ آپ نے ہماری بہتری ہی سوچی ہو گی"۔ فرخندہ نے اپنے الفاظ سے شوہر کی تائید کی۔

آپ کا مسئلہ جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ بیٹی کے ولایت چلے جانے سے آپ صرف میاں بیوی رہ گئے ہیں"۔

"جی"۔ جلال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ مکان جس میں آپ رہتے ہیں بڑا ہے۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں"۔

"پھر قرض بھی ہے ہم پر"۔ جلال نے مزید وضاحت کی۔

"یہ بات بھی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ مکان فروخت کر دیا جائے۔ اِس سے جو رقم ملے اُس سے ایک گزارہ لائق چھوٹا سا مکان خرید لیا جائے اور قرض کی رقم بھی ادا کر دی جائے۔ کیا میں درست کہتا ہوں" ارشد نے مُسکرا کر سوال کیا اور دونوں میاں بیوی بیک آواز بولے:

"بالکل درست"۔

"تو آج ہی میری متواتر کوششوں سے ایک صاحب آپ کے مکان کے لیے تین لاکھ بیس ہزار ادا کرنے پر رضا مند ہو گئے ہیں۔ یہ رقم مناسب ہے"۔

جلال نے بیوی کی طرف دیکھا اور بیوی نے شوہر کی طرف۔

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ رقم معقول ہے۔ اِس سے زیادہ قیمت نہیں مِل سکے گی۔ کیوں انکل!"

"ہاں ہاں اور دو باتیں بھی ہو جائیں"۔

"دو باتیں! یہ بھی سن لیں۔ میں نے ایک اچھے خاصے مکان کے لیے دو لاکھ بیس ہزار کی پیش کش دی ہے۔ اس کے مالک نے گلبرگ میں نیا مکان خرید لیا ہے"۔

"اچھا ہے ہمارے لیے؟" فرخندہ نے پوچھا

"میرے خیال میں تو ٹھیک ہے۔ وہیں چلتے ہیں، دیکھ لیں۔ آپ خود بھی پسند کر لیں۔ پسند تو آپ کی ہونی چاہیے"۔

"شکریہ..... بہت بہت شکریہ"۔

ارشد نے کسی قدر غصے سے کہا "انکل اللہ کے لیے تکلف نہ کیا کریں۔ میرے ساتھ آپ کا خونی رشتہ ہے۔ خونی رشتے کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ورنہ شکریہ کا لفظ کہہ کر آپ مجھے شرمندہ کر دیتے ہیں"۔

جلال واقعی شرمندہ ہو گیا۔ "ٹھیک ہے بیٹا۔ یہ تمھاری برخورداری ہے۔ آج کل کون خونی رشتوں کا خیال کرتا ہے۔"

"میں تو کرتا ہوں"۔

"میں نے کہا نا یہ تمھاری برخورداری ہے"۔

تھوڑی دیر بعد جلال اور فرخندہ ارشد کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی ایک نئی آبادی کے مکان کے آگے رُک گئی۔ "آیئے انکل! اندر سے بھی آپ کو دکھا دوں"۔

مکان دیکھ کر جلال اور فرخندہ دونوں نے اپنی رضا مندی ہی نہیں، خوشی کا اظہار بھی کر دیا۔

دوسرے روز ارشد نے ٹیلی فون پر جلال کو بتایا "انکل! سارا معاملہ بڑی آسانی سے طے ہو جائے گا۔ میں نے انتظام کر لیا ہے۔ آج پانچ بجے تک میرے دفتر میں آجائیں"۔

جلال نے بقیہ وقت دفتر میں بڑی بے تابی سے گزارا۔ کمرے سے باہر نکل کر سیدھا گھر پہنچا اور بیوی کو یہ خوش خبری سُنا دی۔

"کتنا اچھا ہے یہ تمھارا بھتیجا۔ ہم خوامخواہ غلط فہمی میں مبتلا رہے"۔

"بیگم! اپنا خون آخر اپنا خون ہی ہوتا ہے۔ آخر انھیں کے ساتھ ہمارا خونی رشتہ ہے۔ لو اب میں چلتا ہوں"۔

جلال جب ارشد کے ہاں پہنچا تو کئی لوگوں کو اپنا منتظر پایا۔ رجسٹرار کے نمائندے کی موجودگی میں دونوں مکانوں کی رجسٹری ہو گئی۔ رقم لی اور دی بھی گئی۔ ایک لاکھ کی گڈی ارشد نے اپنے بریف کیس میں ڈالی اور بریف کیس اپنے انکل کے حوالے کر دیا۔

"لیجیے انکل! فیصلے کے مطابق آپ ایک ماہ اور اپنے مکان میں رہ سکتے ہیں اور جس مکان میں آپ کو جانا ہے وہ ایک ہفتے کے اندر اندر خالی ہو جائے گا۔ آپ کی مرضی جب جی چاہے آپ وہاں چلے جائیں"۔

جلال نے بریف کیس ساتھ میں لے لیا۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے اُسے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ صرف ممنون نظروں سے اپنے بھتیجے کو دیکھ سکا۔

"انکل! آپ گھر جائیں۔ میری گاڑی آپ کو چھوڑ آئے گی۔ میں خود چلتا مگر ایک صاحب کو ابھی آنا ہے۔ شام کے بعد حاضر ہوں گا"۔ ارشد کی گاڑی جلال کو اُس کے گھر پر پہنچا آئی۔

فرخندہ نے ساری بات سُنی تو فرطِ مسرت سے اُس کا چہرہ دمک اُٹھا۔

"جلال! وہ مکان بہت اچھا ہے مگر ہمیں رنگ و روغن کروانا ہو گا، سفیدی کروانا ہو گی تو اور خوبصورت ہو جائے گا"۔

"بالکل ٹھیک۔ مگر سب سے پہلے وہ ستر ہزار اور دس ہزار کا قرض اُتارنا ہو گا کل سب سے پہلے یہ ہی کام کریں گے"۔

"ہاں کچھ فرنیچر بھی نیا خریدیں گے"۔

"منظور۔ بلکہ میری تجویز یہ ہے کہ ڈرائنگ روم کے علاوہ بھی کچھ فرنیچر بھی نیا خریدیں گے۔ میرا خیال ہے جو رقم ہمیں خرچ کرنا ہو گی وہ پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی"۔

"ہاں یہاں سے سامان لے جانے کا بھی خرچہ ہو گا۔ ٹھیک سوچا ہے تم نے پانچ ہزار تو ضرور اُٹھ جائیں گے"۔

"فرخو!"

"کہو"۔

"تمھاری تجویز میں نے مان لی ہے۔ اب تمھیں میری تجویز ماننا ہو گی"۔

"کیا تجویز ہے تمھاری؟"

"دیکھو فرخو! جب سے ہماری شادی ہوئی ہے ہم ایک بار بھی اپنے شہر سے باہر نہیں جا سکے۔ اب تمھیں میری بات ماننا ہو گی۔ کم و بیش پندرہ ہزار کی رقم ہمارے پاس ہے۔ یہ رقم ہم سیر و تفریح میں صرف کریں گے"۔

فرخندہ کا چہرہ کِھل اُٹھا، بولی "میرے دِل کی بات کہہ دی تم نے"۔

"تو پھر طے ہو گیا معاملہ؟"

"بالکل"۔

فرطِ مسرت سے وہ رات کا کھانا ہی نہ کھا سکے۔ نو بجے کے قریب ارشد آ گیا۔ دونوں میاں بیوی نے اُس کا دلی شکریہ ادا کیا۔

"شکریے کی بالکل ضرورت نہیں۔ آخر رشتے دار کس کام آتے ہیں اور میرا تو آپ کے ساتھ خونی رشتہ ہے۔ ہاں ایک ذرا زحمت کیجیے"۔

"کہیے بیٹا"۔ دونوں بیک وقت بول اُٹھے۔

"وہ میرے کمیشن کے چودہ ہزار دے دیں سارے اخراجات بھی اس رقم میں شامل ہیں"۔

"جی؟" دونوں نے بیک آواز کہا

"میری کمیشن زیادہ نہیں ہے۔ یہ رقم اصول کی خاطر لے رہا ہوں"۔

جلال ہکا بکا رہ گیا۔ فرخندہ نے بریف کیس خاموشی سے ارشد کی طرف بڑھا دیا۔ ارشد نے بریف کیس میں سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ نوٹوں کا ایک حصہ میز کے اوپر رکھا اور باقی گڈی واپس اُس میں رکھ دی۔

"شکریہ انکل آنٹی"۔

اور وہ جانے لگا۔ دروازہ پر ٹھہر کر بولا "انکل! آئندہ جب بھی میری ضرورت پڑے۔ فون کر کے بُلا لیں۔ فوراً حاضر ہو جاؤں گا"۔

یہ کہہ کر وہ دروازے سے نکل گیا۔

جلال اور فرخندہ میز پہ پڑی گڈی کو چند لمحے دیکھتے رہے پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اِن کی نظروں میں ایک ہی سوال اُلجھا ہوا تھا۔ مگر یہ سوال کسی صورت الفاظ کا جامہ نہ پہن سکا۔

●●●



بظاہر بے ضرر سا یہ جانور غذا میں گر کر اُسے زہریلا بنا سکتا ہے

۱۲/ اکتوبر ۲۰۱۱ء فیصل آباد کی ایک سرد شام سات سالہ عمر اپنی والدہ سے ضد کرنے لگا ''امی بھوک لگی ہے...... جلدی سے دودھ گرم کردیں نا''۔

''اچھا بیٹا گرم کررہی ہوں''۔ یہ کہہ کر عشرت بی بی نے جلدی سے دودھ گرم کیا اور اسے ڈھانپے بغیر ٹھنڈا ہونے کی غرض سے رکھ کر باورچی خانے کے دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ اچانک اسے لگا کوئی چیز دودھ میں گری ہے۔ اس نے مڑ کر دودھ کو دیکھا لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ دیر بعد جب دودھ قدرے ٹھنڈا ہوگیا تو عشرت بی بی نے اپنے دونوں بچوں عمر اور نجیب کو گلاسوں میں ڈال کر دیا۔

دودھ کا پینا تھا کہ تھوڑی دیر بعد ہی دونوں بچوں نے الٹیاں کرنی شروع کردیں۔ انہیں فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے بچوں کے والدین سے پوچھا کہ انہوں نے کیا کھایا تھا؟ عشرت بی بی نے بتایا کہ بچوں نے دودھ پیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ''دودھ کو لا کر لیبارٹری میں چیک کروائیں۔ لگتا ہے اس میں کوئی زہریلی چیز ملی ہوئی تھی''۔ جب دودھ کی پڑتال ہوئی تو اس سے مری چھپکلی برآمد ہوئی۔ ادھر ڈاکٹروں نے بچوں کو بچانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن وہ جانبر نہ ہوسکے اور خالق حقیقی سے جاملے۔ یوں ماں کی ذرا سی غفلت کے باعث دونوں بچے اپنی زندگی کی بازی ہار گئے۔

☆☆☆

ایسی بد احتیاطی گھر، ہوٹلوں، ریستورانوں غرض، ہر جگہ دیکھنے میں آتی ہے۔ خصوصاً موسم گرما شروع ہوتے ہی گھر، دفتر وغیرہ کے ہر کونے کھدرے میں چھپکلیاں نظر آنے لگتی

ہیں۔ بالخصوص جن گھروں میں روشنی وہوا کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو اور اندھیرا ہو تو الماریوں اور فرنیچر کے پیچھے کونے کھدروں میں جہاں باقاعدگی سے صفائی نہیں ہوتی، لازمی طور پر چھپکلیاں ایسی جگہوں پر افزائش پاتی ہیں۔ اسی طرح باورچی خانے میں اگر گندگی ہے، برتن باقاعدگی سے نہیں دھلتے، خوراک کے ذرات اور آٹا ادھر ادھر گرا رہے تو یہ سب چیزیں کیڑے مکوڑوں کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں جن کو کھانے کے لیے ہی چھپکلیاں کچن میں نظر آتی رہتی ہیں۔

دنیا میں چھپکلیوں کی چھ ہزار سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان میں کچھ بہت بڑی اور چار ٹانگوں والی ہوتی ہیں جبکہ کچھ ایسی اقسام ہیں جو بغیر ٹانگوں کے ہوتی ہیں۔ عام طور پر چھپکلیوں کے چھوٹے سر، لمبا جسم اور لمبی دم ہوتی ہے۔ دنیا میں ان کی بے شمار اقسام پائی جاتی ہیں، اس لحاظ سے ان کا سائز بھی مختلف ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی چھپکلی کموڈو ڈریگن (Kumodo Dragon) ہے۔ یہ تقریباً ۱۰ فٹ لمبی ہوتی ہے۔ وزن تقریباً ۸۰ کلوگرام کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے چھوٹی چھپکلی ڈوارف گیکو (Dwarf Gecko) ہے۔ جس کی لمبائی ۶ء۱۰ انچ اور وزن تقریباً ۱۲۰ ملی گرام ہوتا ہے۔ کچھ اقسام دس سال تک زندہ رہتی ہیں جب کہ کئی چھپکلیاں پچاس سال تک کی بھی عمر پاتی ہیں۔

چھپکلیاں کرہ ارض میں ہر جگہ موجود ہیں سوائے انٹارٹکا کے۔ یہ سرد موسم کے علاوہ ہر قسم کی آب وہوا میں گزارہ کرلیتی ہیں۔ چھپکلیوں کی وسیع اقسام میں سے اکثریت درختوں پر رہتی ہے بعض بلوں میں رہتی ہیں۔ کچھ زمین پر، کئی چھپکلیوں کا ٹھکانا صحرا ہے تو کچھ کا پہاڑ، غرض یہ ہر جگہ موجود ہوتی ہیں۔ کچھ چھپکلیاں نیم آبی ہیں اور بہت اچھی طرح تیر سکتی ہیں۔ کچھ اقسام ایسے پھسلتے ہوئے چلتی ہیں کہ دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اڑ رہی ہوں جیسے کہ اڑتی چھپکلی (Flying Lizard Dragon) جس کا مسکن جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلات ہیں۔ اگر ان کے رنگ کی بات کی جائے تو جتنے بھی ہم تصور کرسکتے ہیں، ہر رنگ میں پائی جاتی ہیں۔ چھپکلیوں کی اکثر اقسام اپنے موڈ اور ماحول کے مطابق جلد کا رنگ بدل سکتی ہیں۔

عام طور پر چھپکلیاں دن میں سرگرم ہوتی ہیں۔ ان کا شمار سرد خون والے (Cold Blooded) جانوروں میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے اجسام کو گرم رکھنے کے لیے ماحول پر انحصار کرتی ہیں۔ سورج کی حرارت کو توانائی اور وٹامن ڈی حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہ دن ہی کو شکار کرنے نکلتی ہیں۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی کی ریسرچ کے مطابق کچھ چھپکلیاں اپنے خاندان کے ساتھ گروہ کی صورت میں رہتی ہیں جیسے صحرائی چھپکلی۔

اکثر چھپکلیاں اپنی کھردری جلد گرادیتی یا انہیں کھپروں کی صورت میں تبدیل کرلیتی ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت بھی ہوتی ہے کہ جب کوئی دشمن ان کو پکڑ لے تو وہ اپنی دم جسم سے الگ کرکے فرار ہوسکتی ہیں تاکہ خود کو دشمن سے محفوظ رکھ سکیں۔ چھپکلیوں کی زیادہ تر اقسام میں اگر ان کے دانت ٹوٹ جائیں یا گر جائیں تو پھر نکل آتے ہیں۔ یہ اپنی زبان کو اشیاء سونگھنے کے لیے بھی استعمال کرتی ہیں۔ اس لیے آپ نے چھپکلیوں کو سانپ کی طرح اپنی زبان منہ سے اندر اور باہر نکالتے دیکھا ہوگا۔ چھپکلیوں کی اقسام میں سے گیکو (Gecko) کی آنکھوں پر پلکیں نہیں ہوتیں۔ چھپکلیوں کے پیر بہت منفرد ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ پہاڑوں اور دیواروں پر باآسانی چڑھ جاتی ہیں۔

چھپکلیوں کی کچھ اقسام قیمتی اور نایاب ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی خطرناک ہوتی ہیں کہ کاٹنے کی صورت میں پانچ منٹ کے اندر جاندار کی موت واقع ہوسکتی ہے۔ ان کی اکثریت بہت زیادہ زہریلی نہیں ہوتیں۔ سب سے زہریلی میکسیکن چھپکلی (Mexican Lizard)، گیلا مونسٹر (Gila Monster) اور لیپرڈ چھپکلی (Leopard Lizard)

ہیں۔ لیپرڈ چھپکلی کے جسم پر چیتے کی طرح کے دھبے ہوتے ہیں۔ یہ چھپکلی پاکستان، افغانستان، ایران اور بھارت میں بھی پائی جاتی ہے۔ امریکا اور مغربی ممالک میں کینسر اور ایڈز جیسی خطرناک بیماریوں کے علاج میں یہ نایاب نسل کی چھپکلی استعمال ہوتی ہے۔ اس چھپکلی کی قیمت کا تعین وزن کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ اگر یہ سائز میں چھوٹی ہو تو چھ ہزار روپے میں فروخت ہوتی ہے جبکہ ۱۵۰ گرام سے زائد وزن کی چھپکلی ۴۵ لاکھ روپے یا اس سے زائد میں فروخت ہوتی ہے۔

زیادہ تر چھپکلیاں گوشت خور ہوتی ہیں۔ عام طور پر چیونٹیاں، مکڑے، چھوٹے ممالیہ جانور حتیٰ کہ دوسری چھپکلیاں بھی کھا جاتی ہیں۔ ان کی بیشتر اقسام انڈے دیتی ہیں جبکہ کچھ بچے۔ چھپکلیوں کے بچے پیدائش سے چلنے پھرنے لگتے اور اپنے لیے خوراک تلاش کرتے ہیں۔

عام طور پر ہمیں گھروں میں جو چھپکلیاں نظر آتی ہیں اس کو گھریلو چھپکلی (Common House Gecko) کہا جاتا ہے۔ یہ دن کے وقت عموماً چھپی رہتی ہیں۔ رات کے وقت کیڑے مکوڑے پکڑنے کے لیے ہمیں دیواروں پر، لائٹوں کے آس پاس گھومتی نظر آتی ہیں۔ ان کی لمبائی ۳ سے ۶ انچ ہوتی ہیں۔ یہ پانچ سے دس سال تک زندہ رہتی ہیں۔

گھریلو چھپکلی زہریلی نہیں ہوتی مگر یہ ہر گندی مندی شے کھا جاتی ہے۔ مزید برآں یہ اکثر گندگی کی جگہوں پر گھومتی پھرتی ہیں۔ اسی لیے گھریلو چھپکلی کا جسم مختلف اقسام کے جراثیم کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ جب کوئی ایسی چھپکلی سالن کی دیگچی میں گر جائے جس کے بدن میں خطرناک جراثیم موجود ہوں، تو وہ غذا کو زہریلا بنا دیتی ہے۔ یہ زہریلی غذا کھا کر خصوصاً بچے دم توڑ سکتے ہیں کیونکہ ان کا جسمانی مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے۔

اس باعث یہ ضروری ہے کہ جس گھر میں چھوٹے بچے رہتے بستے ہوں، وہاں چھپکلی کسی صورت نہیں ہونی چاہیے۔ ذیل میں گھر و دفتر سے گھریلو چھپکلی دور کرنے کے آسان طریقے پیش خدمت ہیں۔

اگر آپ چھپکلیوں سے تنگ ہیں اور انہیں گھر سے بھگانا چاہتے ہیں، تو سب سے پہلے کونے کونے کی باقاعدگی سے صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھیں۔ جہاں صفائی، روشنی اور ہوا کا مناسب انتظام ہو وہاں مختلف کیڑے مکوڑے اور دیگر حشرات الارض افزائش نہیں پاتے۔

۱۔ انڈوں کے چھلکے:

یہ چھپکلیوں کو بھگانے کا سب سے مشہور و معروف طریقہ ہے۔ چھپکلیاں انڈوں کی بو سے دور بھاگتی ہیں۔ اس لیے انڈے استعمال کرنے کے بعد ان کے چھلکے ہر اس جگہ رکھ دیں جہاں پر آپ کو چھپکلیاں نظر آتی ہوں۔ خاص طور پر باورچی خانے، کھڑکیوں اور روشندانوں میں جہاں سے چھپکلیوں کے گھر میں آنے کے امکانات ہوں۔ ایک دو دن بعد ان چھلکوں کی جگہ تازہ انڈے کے استعمال شدہ چھلکے رکھ دیجیے کیونکہ کچھ دن بعد ان چھلکوں کی بو کم ہو جاتی ہے۔

۲۔ کافی پاؤڈر

چھپکلیوں کو مارنے کا یہ بھی مؤثر طریقہ ہے۔ کافی پاؤڈر میں تمباکو کا پاؤڈر ڈالیں اور تھوڑا سا پانی ملا کر اس کی گولیاں بنا لیں۔ ان کو ماچس کی تیلیوں اور ٹوتھ پکس پر لگا کر یا پھر ایسے ہی چھوٹی چھوٹی گولیوں کی صورت میں جگہ جگہ رکھ دیں۔ خاص طور پر شیلف اور الماریوں کے پیچھے یا بیڈ کے نیچے۔ چھپکلیاں ان گولیوں کو کھا کر مر جاتی ہیں۔

۳۔ لہسن

لہسن کا ذائقہ اور خوشبو جتنا انسانوں کے لیے پسندیدہ ہے اتنا ہی اس کی بو چھپکلیوں کے لیے ناپسندیدہ ہے۔ لہسن یا اس کے جووؤں کو کچن، کھڑکیوں یا دروازوں کے آس پاس رکھیے۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو لہسن کا رس نکال کر اسپرے والی بوتل میں ڈال لیں اور جہاں جہاں چھپکلیوں کے گڑھ ہوں، وہاں اسپرے کر دیں۔ چھپکلیاں اس کی بو سے دور بھاگ جائیں گی۔

۴۔ مرچوں کا اسپرے:

پسی ہوئی کالی اور سرخ مرچ لے کر اس کو پانی میں ملائیں۔ پھر اسپرے والی بوتل میں ڈال کر اسپرے کریں۔ مرچوں کی بو چھپکلیوں کو بھاگنے پر مجبور کر دے گی۔

۵۔ پیاز:

لہسن کی طرح پیاز کی تیز چبھتی ہوئی بو بھی چھپکلیوں کو ناگوار گزرتی ہے۔ پیاز کا رس نکال کر اس کو پانی کے ساتھ ملا کر اسپرے کریں اور چھپکلیوں سے نجات پائیں۔

۶۔ فینائل کی گولیاں:

فینائل کی گولیاں کیڑے مکوڑوں اور کھٹملوں کو گھر سے دور رکھنے کے لیے نہایت فائدہ مند ہیں۔ یہی چھپکلیوں کے لیے بھی کارآمد ہیں۔ ان کی تیز خوشبو سے چھپکلیاں دور بھاگتی ہیں۔ گولیوں کو احتیاط کے ساتھ بچوں کی پہنچ سے دور الماریوں اور شیلف وغیرہ کے اندر اور باہر رکھا جا سکتا ہے۔

۷۔ پلائی پیپر:

پلائی پیپر کے ذریعے چھپکلیوں کو آسانی سے پکڑا جا سکتا ہے کیونکہ یہ دیوار پر آسانی سے چپک جاتا ہے۔ ہر اس جگہ پر جہاں پر چھپکلیاں موجود ہوتی ہیں، اس پیپر کو چپکا دیں مثلاً دیواروں کے کونے، لائٹوں کے قریب۔ چھپکلیاں جب ان کے اوپر سے گزرتی ہیں تو وہ ان پر چپک جاتی ہیں۔ آپ آسانی سے یہ کاغذ اتار کر چھپکلیوں سمیت باہر پھینک کر ان سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

۸۔ ٹھنڈا پانی:

چھپکلیاں درجہ حرارت کے معاملے میں کافی حساس ہیں۔ یہ سرد موسم میں نقل وحمل نہیں کر سکتیں۔ جہاں کہیں آپ چھپکلی دیکھیں، اس پر ٹھنڈا یخ پانی پھینک دیں۔ وہ صدمے میں آ کر وہیں رک جائے گی۔ اس کو مار کر گھر سے باہر پھینک دیں۔

۹۔ ٹوبیسکو ساس:

یہ مرچوں والے اسپرے ہی کی ایک قسم ہے۔ ٹوبیسکو ساس یا ہاٹ ساس میں پانی مکس کر کے اچھی طرح ہلا لیں۔ اسے اسپرے والی بوتل میں ذخیرہ کریں اور الماری، شیلف یا وارڈروب کے پیچھے چھڑکیں۔ یہ مسالے دار مرکب رینگنے والے کیڑوں کو ختم کر دے گا اور چھپکلیاں بھی گھر سے بھاگ جائیں گی۔

۱۰۔ پرندوں کے پر:

بہت سے پرندے عام طور پر چھپکلیوں کو شکار کرتے ہیں۔ اس لیے گھر میں جگہ جگہ پرندوں کے پر رکھ دیں۔ جب چھپکلیاں گھر میں پرندوں کے پر دیکھیں گی تو انہیں لگے گا کہ پرندے ان کا شکار کرنے کے لیے آس پاس موجود ہیں۔ پرندوں کے پروں سے بنی ہوئی سجاوٹی اشیاء اور تصاویر وغیرہ بھی دیواروں پر لگائی جا سکتی ہیں۔ چھپکلیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ بھی مؤثر طریقہ ہے۔

۱۱۔ پالتو بلی:

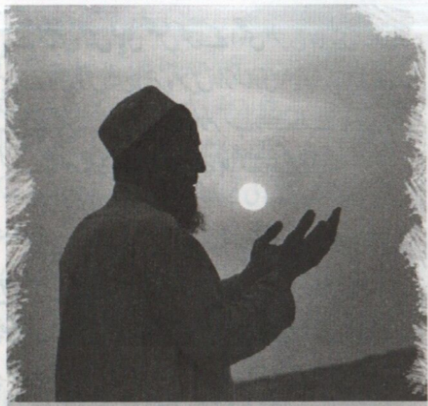
اگر آپ کے پاس پالتو بلی ہے تو خوش ہو جائیے۔ بلی نہ صرف چوہے پکڑتی بلکہ اکثر و بیشتر چھپکلیوں کا بھی شکار کر کے آپ کی پریشانی ختم کر سکتی ہے۔ بلی پالنے کے لیے آپ کو غور کرنا چاہیے۔

۱۲۔ الیکٹرک ریپلینٹ:

اگرچہ یہ کوئی گھریلو ٹوٹکا نہیں ہے، تاہم انسانوں کو نقصان بھی نہیں پہنچاتا۔ مارکیٹ میں اب کیڑے مکوڑے اور چھپکلیاں بھگانے والے ریپلینٹ موجود ہیں۔ یہ آلات ایسی الٹراسونک آوازیں پیدا کرتے ہیں جو چھپکلیوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ آپ کے گھر کے قریب نہیں آتیں۔

۱۳۔ چوہے دان:

چوہے دان جہاں چوہے پکڑنے کے لیے بہت مؤثر ہے، وہیں آپ اسے چھپکلیاں پکڑنے میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کے علم میں ہو کہ کہاں سے چھپکلیاں گھر کے اندر داخل ہوتی ہیں، تو آپ اسے کھڑکی یا روشن دان کے آگے لگا کر با آسانی چھپکلی کا شکار کر سکتے ہیں۔



ایک بزرگ کہیں جارہے تھے۔ بزرگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ لباس کی کچھ زیادہ خبر نہیں ہوتی۔ بس جیسا مل گیا، پہن لیا۔ کبھی شاہانہ لباس، کبھی پھٹے پرانے کپڑے۔ وہ بزرگ پھٹے پرانے کپڑوں میں چلے جارہے تھے۔ ایک شہر سامنے آیا تو دیکھا کہ سارے شہر کے دروازے بند ہیں۔ دروازے کے باہر کئی چھکڑے اور لوگ کھڑے تھے۔ دوسری طرف بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر طرف تجارت و کاروبار بھی سب بند تھا۔

انہوں نے لوگوں سے پوچھا، بھئی یہ دروازے کیوں بند ہو گئے؟ لوگوں نے بتایا، اس شہر کا باز کھو گیا ہے۔ بادشاہ نے کہا، چونکہ باز کھو گیا ہے لہٰذا شہر کے تمام دروازے بند کردو اور اسے کہیں سے پکڑ کر لاؤ۔

بزرگ نے کہا: " کیسا احمق بادشاہ ہے، پرندہ تو اُڑ کے باہر چلا جائے گا؟ بھئی اگر پکڑنا تھا تو شہر پر جال لگوا دیتا تاکہ اوپر سے اُڑ کر نہ نکلے۔ دروازے بند کروانے کی بھلا کیا تُک ہے۔ پھر بزرگ نے اللہ سے شکوہ کیا اور کہا!

”یااللہ یہ تیری عجیب قدرت ہے کہ اس کندہ ناتراش کو تو حکمران بنادیا، جس کو یہ بھی تمیز نہیں کہ باز روکنے کے لیے جال ڈالنا چاہیے یا شہر کے دروازے بند کروانے چاہئیں اور مجھ جیسے عالم فاضل کو بھیک منگا بنا رکھا ہے کہ جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں اور کوئی پوچھتا نہیں۔“

جب نیک بزرگ کے دل میں یہ وسوسہ گزرا تو حق تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا: ”کیا تم تیار ہو کہ تمہارے دل کی ایمان کی دولت ہم اس حکمران کو دے دیں اور اِس کی سلطنت تمہیں مل جائے“۔

بزرگ تھرّا گئے، عرض کیا: ”نہیں، یااللہ، میں اپنا ایمان نہیں دینا چاہتا۔“

حق سبحانہُ نے فرمایا: ”ہم نے تجھے اتنی بڑی دولت دے دی اور پھر بھی تُو بے وقوف اپنے کو بھیک منگا سمجھ رہا ہے۔ حکمران کی دولت ظاہری ہے جس کے پاس ہے وہ کل کو ختم ہوجائے گی۔ جس کے پاس ایمان کی دولت ہے، وہ ہی اصل دولت ہے جو ابد الا باد چلنے والی ہے۔ تجھے تو مَیں نے ابدی دولت اور اِس احمق کو عارضی دولت دی مگر تُو نے اپنی دولت کی قدر ہی نہ کی۔"

اب بزرگ سمجھے کہ سنجیدہ اور تجربے سے بھرپور عمر میں وہ کیسی غلطی کرنے جارہے تھے۔ عقل و خرد کی جو دولت اُن کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی، انھوں نے اسی کے بل بوتے پر پوری عمر بہترین ملازمت کی اور اب بہترین پینشن تاحیات اُن کا مقدر تھی کیونکہ وہ ایمان و عقل کی دولت سے مالا مال تھے۔ بزرگ نے فوراً توبہ کی اور کہا: ”یااللہ مجھ سے غلطی ہوگئ، مجھے معاف کردے۔ واقعی تُو نے مجھے حقیقی دولت مند بنایا۔“

میرے ہم وطنو! بھلا جس کے پاس ایمان و ایقان کی دولت ہے، اس سے بڑھ کر دولت مند کون ہے؟ یہی دولت آگے تک جانے والی ہے۔ مسلمانوں کو اگر مادی دولت ملے تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ رب العزت نے عقل و ایمان کی دولت الگ دی اور دنیا کی دولت بھی ساتھ دے ڈالی۔



”میرے میاں سرکاری ملازم ہیں۔ ہمارے چھ بچے ہیں۔ دو بیٹیوں کی شادی کر دی ہے باقی ورسٹی سے لے کر ہائی اسکول تک زیر تعلیم ہیں۔ ظاہر ہے ائی کے اس دور میں اتنے افراد کا معمولی تنخواہ میں عزت سے ارہ کرنا اور اپنا بھرم قائم رکھنا کس قدر مشکل ہے۔ ہمارے ماشاء اللہ شکل و صورت اور سیرت میں بے مثال ہیں لیکن شتے داروں نے اپنے بیٹوں کی شادیاں کرتے وقت ہمیں نا تو درکنار، دیکھنا تک گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ وہ جو بہوئیں کر لائے، کسی طرح بھی میری بیٹیوں سے بہتر نہیں“۔

چونکہ وہ کھاتے پیتے گھرانوں کی تھیں اور ٹرک بھر بھر کر لائی تھیں، اس لیے ان کی ہر خامی قیمتی جہیز کے مخملی پردے چھپ گئی۔ یہ الگ بات کہ بعد میں یہی امیر زادیاں ناکوں چبواتے ہوئے چند مہینے بعد ہی اپنے شوہروں کو لے کر ک ہوگئیں۔ جس مال و جہیز پر انہیں بہت ناز تھا، ایک ایک میٹ کر اپنے گھروں میں لے گئیں۔ اس کے برعکس اگر مارے گھروں کی نکھری اور نرم مزاج لڑکیوں کو اپنی بہو بناتے تو ان کے ہاں تقسیم کی دراڑ کبھی نہ پڑتی کیونکہ متوسط گھروں کی لڑکیاں نرم گرم حالات سہنے کی عادی ہوتی ہیں۔ کسی بڑے کی کڑوی بات کا نہ جلد برا مانتیں اور نہ ہی اتنی خودسر ہوتی ہیں کہ اپنے فیصلے خود کرتی پھریں لیکن ان امیر رشتے داروں کو کون سمجھائے کہ رشتے طے کرتے وقت غریب اور کم حیثیت رشتے داروں کو بھی ذہن میں رکھ لیا کریں“۔ پچپن سالہ خاتون نے انتہائی دلگرفتگی سے ہمیں بتایا۔

بسا اوقات مسلسل لگن، محنت اور اتفاقی واقعات کی بدولت غریب اور متوسط طبقے کے کچھ افراد طبقاتی فرق تبدیل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن طبقہ بالا میں ایڈجسٹ ہونے اور اس کے طور طریقے اپنانے میں بھی خاصا وقت درکار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے بعض اوقات انہیں ناگوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ترقی کر کے کلاس تبدیل کرنے والے افراد کو مدت تک ”نودولتیے“ کی چھاپ برداشت کرنا پڑتی ہے۔

معاشرے کے طبقات کی طرح ایک ہی خاندان میں بھی

مختلف حیثیت اور مرتبے کے لوگ موجود ہوتے ہیں جن کا آپس میں تعلق کمزور ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو ایک سے دوسری نسل تک پہنچتے پہنچتے شناسائی تک ختم ہو جاتی ہے اور افراد کی ملاقات محض کسی شادی بیاہ یا ہنگامی صورت حال میں ہی ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اور خون کے رشتے محض طبقاتی فرق کی وجہ سے کیوں دم توڑتے اور کمزور ہو جاتے ہیں؟

اس بارے میں جب امیر اور غریب رشتے داروں سے بات چیت کی گئی تو دونوں طرف سے شکایات کے انبار لگ گئے۔ بظاہر دونوں اپنی اپنی جگہ درست معلوم ہوئے، تاہم تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ دونوں کی شکایات درست بھی ہو سکتی ہیں لیکن اگر دینی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو زیادہ تر ذمہ داری امیر رشتے دار پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کم حیثیت عزیزوں کی خبر گیری کرے اور ان کے حقوق ادا کرنے میں بخل سے کام نہ لے۔ صلہ رحمی کا سلوک نہ صرف ذاتی بلکہ اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے میں بھی معاون ثابت ہوتا ہے۔ حقوق العباد کی ادائیگی پر جتنا زور دیا گیا ہے اتنا کسی اور چیز پر نہیں۔ یہ جاننا اور سمجھنا بہت ضروری ہے کہ یہ امیر اور غریب رشتے دار ایک دوسرے سے کیوں شاکی ہیں۔

اس بارے میں جب ایک صاحب حیثیت خاتون سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا: ’’یہ بات درست ہے کہ غریب اور متوسط طبقے کی لڑکیاں بعض اوقات شکل وصورت اور سلیقے میں امیر گھروں کی لڑکیوں سے بہتر ہوتی ہیں لیکن ان کے ساتھ بہت سے مسائل بھی ہوتے ہیں ایک تو اکثر وہ امیر گھر جا کر ایڈجسٹ ہی نہیں کر پاتیں ماحول کے فرق کو ناجائز آزادی سمجھ کر کیڑے نکالتیں اور اپنے میکے جا کر طرح طرح کے فسانے گھڑ کر سناتی ہیں۔ دوسرے بعض اوقات بھری محفل میں کوئی ایسی حرکت ضرور کر دیتی ہیں جو دوسروں کے لیے باعث شرمندگی ہوتی ہے۔ پھر ان کے گھرانے میں چونکہ مسائل کا انبار ہوتا ہے، اس لیے وقتاً فوقتاً وہ مختلف طریقوں سے اپنے میکے والوں کی چوری چھپے مدد کرنے کی کوشش میں بھی لگی رہتی ہیں۔ چھوٹے بہن بھائی تو مستقل کسی نہ کسی بہانے سے بہن کے گھر ڈیرہ جمائے ہی رکھتے ہیں۔ یہ صورتحال ہمیں ناگوار گزرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہو، اچھی لڑکیاں اور لڑکے بھی ہوتے ہیں لیکن ہم خطرہ کیوں مول لیں؟

یہ تو تھی لڑکیوں کی بات، لیکن لڑکوں کے بارے میں بھی کم وبیش ایسی ہی آرا سننے میں آئیں جن میں ان پر تنقید کی گئی۔ ایک خاتون کی بیٹی سے اس کے امیر چچازاد نے پسند سے شادی تو کر لی، لیکن وہ لڑکی کے گھر والوں سے اچھوتوں جیسا برتاؤ کرتا۔ جب کبھی سسرال آئے تو کھانا چائے تو دور، زیادہ دیر بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ہر حرکت سے نخوت اور غرور ٹپکتا ہے۔ بار بار چھوٹے بچوں سے کہتا ہے کہ جاؤ باہر دیکھو، کوئی گاڑی کو گندا تو نہیں کر رہا یا پھر تنگ و چھوٹی گلی میں گاڑی چلانے اور کھڑی کرنے کی تکلیف بیان کرتا رہتا ہے۔ بہترین چیز بھی پیش کریں تو نخرے اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔

لڑکی کی ماں بتاتی ہے: ’’اس کی موجودگی میں ہم سب کے ہاتھ پاؤں پھولے رہتے ہیں۔ ایسے میں ہماری بیٹی کی پریشانی دیدنی ہوتی ہے کہ کس کا ساتھ دے اور کس کا نہیں۔ کبھی ہماری شرمندگی کا احساس اسے کچوکے لگاتا تو کبھی شوہر کے ماتھے کی تیوریاں ہولائے دیتی ہیں۔ بڑے گھر میں بیاہی جانے کے باوجود بچی دوہرے عذاب میں مبتلا ہے۔‘‘

عزیز الحق متوسط طبقے کے ادھیڑ عمر شہری ہیں۔ ان کی کریانے کی چھوٹی سی دکان ہے۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹی کو میٹرک کے بعد انہوں نے بیاہ دیا۔ بیٹے بہت لائق اور ہونہار ہیں۔ بڑا یونیورسٹی میں، منجھلا بی ایس سی اور چھوٹا ایف ایس سی کر رہا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے انہیں تعلیم دلوا رہے ہیں کہ وہ انہیں مستقبل میں خود سے بہتر دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے ایک عزیز ماشاء اللہ بہت مال دار، خوش حال

اور قریب ہی رہائش پذیر ہیں، لیکن انہیں ہماری یاد صرف اس وقت آتی ہے جب ان کے گھر میں کوئی فنکشن ہو اور کام کرنے کے لیے نوجوانوں کی ضرورت ہو۔ اس وقت ان کے لہجے کی مٹھاس دیکھنے لائق ہوتی ہے۔ ان کی بیگم میرے بیٹوں کی طرف اشارہ کر کے فرماتی ہیں ’’بھئی ہمیں کیا فکر، ماشاء اللہ جوان بیٹے ہیں سب سنبھال لیں گے‘‘ اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔

ان کے دو بیٹوں اور بیٹی کی شادی پر سارے انتظامات اور سارے کام میرے بیٹے بھاگ بھاگ کر کرتے رہے، لیکن جونہی کبھی ہمیں ان کی ضرورت پڑی، تو یوں لگتا ہے جیسے ہمیں جانتے ہی نہیں۔ ایک دن محلے میں ہونے والے لڑائی جھگڑے میں پولیس میرے چھوٹے بیٹے کو بھی پکڑ کر تھانے لے گئی، حالانکہ وہ بے چارہ صرف دوسرے لڑکوں کے قریب کھڑا تھا۔ میں بڑے مان سے اپنے ان عزیزوں کے گھر گیا ’’ان کے اپنے بیٹے ہیں۔‘‘ اور ان کی پہنچ بھی ہے، فوراً کچھ نہ کچھ کر کے بچے کو چھڑا کر لے آئیں گے لیکن بات شروع کرتے ہی ان کی بیگم صاحبہ کے تیور ہی بدل گئے۔ فرمانے لگیں ’’ارے بھائی صاحب! اپنے بچے سبھی کو بے قصور نظر آتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کیا ہو گا نا؟ یونہی تو نہیں پکڑ کر لے گئے؟ اب ہم تو اس پھڈے میں نہیں پڑ سکتے۔ ’’جو کیا ہے بھگتے‘‘ اور یہ کہہ کر وہ کمرے سے یوں غائب ہوئیں کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر میں خود ہی شرمندہ ہو کر واپس آ گیا۔

مسز مریم ساٹھ سالہ ریٹائرڈ اسکول ٹیچر اور پانچ بیٹیوں کی ماں ہیں۔ ان کی بیٹیاں دس سے دو سال کی تھیں، جب مسز مریم بیوہ ہو گئیں۔ انہوں نے شکایت بھرے لہجے میں بتایا کہ ان کے عزیز رشتے دار اچھے خاصے کھاتے پیتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ میری بیٹیوں کا رشتہ لے کر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگائیں، لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ جو ہزاروں روپے کی زکوٰۃ دکھا دکھا کر دوسرے لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں، وہ چپکے سے میری جھولی میں ڈال جائیں تاکہ میں اپنی بچیوں کے گھر آباد کر سکوں۔ یوں بھی میں رشتے دار ہوں، میرا حق فائق ہے، لیکن امیر رشتے دار زکوٰۃ خیرات بھی دیتے ہیں تو نمائش کر کے اور ایسا کرتے وقت قریبی حقیقی قرابت داروں اور ضرورت مندوں کو قطعی فراموش کر دیتے ہیں۔

اس کے برعکس ایک صاحب حیثیت اور بیرون ملک مقیم تاجر نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ میں ہر سال جب بھی وطن آتا ہوں، تو تمام غریب رشتے داروں کی طرف چکر ضرور لگاتا ہوں۔ جس کا بچہ پڑھ رہا ہو، اس کو وظیفہ انعام کہہ کر دیتا ہوں اور جس کی بچی بیاہنے والی ہو، اس کے لیے بھی خاموشی سے کچھ نہ کچھ ضرور مدد کرتا ہوں۔ جس نے تعلیم مکمل کر لی ہو، اس کی ملازمت یا کاروبار کا حتی الامکان بندوبست کرتا ہوں۔ بوڑھے اور غریب رشتے داروں کو سال بھر کا خرچ دے جاتا ہوں۔ یہ میں کسی پر احسان نہیں کرتا۔ میری دولت پر ان کا بھی حق ہے اور شاید مجھے اللہ انہی میں سے کسی کی قسمت کا دے رہا ہے۔ اس لیے میں اپنے غریب رشتے داروں کی مدد سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔ یقیناً یہی وجہ ہے کہ میرے مال میں برکت ہی برکت ہے۔ کبھی کمی یا تنگی نہیں ہوئی۔ میرا ایمان ہے کہ صلہ رحمی اور حقوق العباد کی ادائیگی سے مال اور عمر میں اللہ تعالیٰ برکت دیتا ہے۔

انہی صاحب کے ایک رشتے دار کا کہنا تھا کہ غرور یا تکبّر نام کی کوئی شے اس شخص کو چھو کر نہیں گزری۔ وہ ہمارے گھر آ کر کھانے کی خود فرمائش کرتے اور خاص طور پر دال کہہ کر پکواتے ہیں یا تو ان کو واقعی پسند ہے یا پھر وہ ہمارا بھرم اور عزت قائم رکھنے کی وجہ سے سادہ دال بھی بہت رغبت سے کھاتے اور کہتے ہیں کہ بھئی دنیا جہان کے ہوٹلوں کے کھانے ایک طرف اور گھر کی بگھاری دال ایک طرف۔ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں۔ شاید انہی کے دم قدم سے دنیا آباد اور انسانیت زندہ ہے۔

امیر اور غریب رشتے داروں کی دوری کے حوالے سے

بات کرتے ہوئے ایک بے تکلّف سہیلی نے بھی ہنستے ہوئے اس کی تائید کی اور اپنے بچپن کے حوالے سے بتایا کہ وہ ایک متوسط طبقے سے تعلّق رکھتی ہے۔ گھر کے پاس ہی ایک بہت قریبی لیکن امیر رشتے دار کا گھر تھا۔ ان کے تین بچے ہمارے ہم عمر تھے۔ ہم گرمیوں میں ہر روز شام کو نہا دھو کر کھیلنے کے لیے قریبی باغ میں نکلتے تو وہ بھی وہاں آجاتے۔ ہم سب گھل مل کر خوب کھیلتے اور اکٹھے کھاتے پیتے۔ کھیل کے وقت ان کے والدین ہمیں گھر بھی بلا لیتے۔ لیکن جونہی ان کے کھیل کا وقت ختم اور ٹیوٹر کے آنے کا وقت ہوتا، ماں باپ کے چہرے کے تاثرات ہی بدل جاتے اور وہ بڑے روکھے پن سے ہمیں کہتے، چلو بھئی! بچو اب بھاگو...... دوڑ جاؤ بس! ہم شرمندگی کے انتہائی شدید احساس سے دوچار منہ لٹکائے واپس آجاتے۔ اسی طرح اگر کھیل کے اوقات کے علاوہ ان کے گھر چلے جاتے، تو دروازے سے ہی لوٹا دیے جاتے کہ بچے سو رہے ہیں، پڑھ رہے یا کھانا کھا رہے ہیں۔ گویا اگر ہم اندر چلے جاتے تو ان کے منہ سے نوالے چھین لیتے۔ آج ہم لوگ معاشی طور پر ان کے برابر آچکے۔ وہ لوگ ملنے کی خواہش بھی کرتے ہیں لیکن اب میں ان سے کبھی ملنا نہیں چاہتی۔

اس قسم کے رویے کی شکایت کا اظہار جب ہم نے ایک بہت ناز و نعم میں پلی امیر خاتون سے کیا تو انھوں نے برا سا منہ بنا کر کہا کہ بھئی بات یہ ہے کہ مفلس رشتے داروں کو ہم نے تو غریب نہیں کیا نا؟ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ لیکن ہمارے بچے ان کے ساتھ زیادہ گھل مل جائیں تو بدتمیزیاں سیکھ اور سارے ''ایٹی کیٹس'' بھول جاتے ہیں۔ مستزاد یہ کہ وہ بچے مسلسل اردو، پنجابی بول بول کر ہمارے بچوں کی زبان بھی خراب کرتے ہیں۔ ہم کیا بیوقوف ہیں جو ان سے میل ملاپ رکھ کر اپنے بچوں کی تربیت خراب کر لیں؟ ہاں! جب انھیں کھیل میں کسی کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور کوئی اور ان کے ساتھ کھیلنے والا نہیں ہوتا تو میں ان کے بچوں کو بلا لیتی ہوں (گویا وہ اپنے بچوں کے لیے ''کمپنی'' کرایے پر لیتے ہیں۔)

ایک دوسری خوش حال فیملی کے مطابق ''اور تو سب ٹھیک ہے مگر غریب اور متوسط طبقے کے لوگ بطور مہمان اچھے ثابت نہیں ہوتے۔ اس لیے یہ دوری ان سے ضروری ہے۔ مثلاً اگر غریب مہمان آکر آپ کے گھر ٹھہر جائے تو اسے غسل خانہ کا استعمال کرنا نہیں آتا۔ وہاں موجود ذاتی چیزوں یعنی بالوں کے برش یا تولیہ وغیرہ کے بے دھڑک استعمال اور ٹوکنے پر بُرا مان جاتا ہے۔ کھانے کی میز پر کھانا اس کے لیے عذاب ہوتا ہے۔ دوسرے اُن کی توقع ہوتی ہے کہ گھر کے تمام افراد ان کے ارد گرد جمگھٹا لگا کر بیٹھے گپیں ہانکتے رہیں۔ ہماری مصروف زندگی میں ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر ہر ایک کے کمرے میں بلا اجازت گھس جانا اور اس کی چیزوں کو بے تکلفی سے الٹ پلٹ کرنا وہ اپنا حق سمجھتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ نوکروں کے ساتھ بے تکلف ہو کر ان کو پرانے قصے سناتے اور دوستیاں کر کے ان سے ہمارے بارے میں کریدتے ہیں''۔

متوسط طبقے کا یہ کہنا بھی کسی قدر بجا ہے کہ امیر رشتے دار شادی بیاہ پر اگر آ بھی جائیں تو اپنی حیثیت مدنظر رکھ کر تحائف دینے کے بجائے ہلکا اور فالتو سا تحفہ دے جاتے ہیں۔ شاید ہماری طرف سے بدلے میں انہیں ہم پلہ تحفہ ملنے کی امید جو نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ کچھ امیر حضرات قربانی پر بھی ران، چانپیں اور روکھا صاف ستھرا گوشت اپنے جیسے دوستوں رشتے داروں میں ادل بدل کرتے اور ہمارے گھر چربی، چھیچھڑوں اور ہڈیوں پر مشتمل گوشت بھیج دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں پورا سال انتظار رہتا ہے کہ کب عید قرباں آئے اور ہمیں گوشت نصیب ہو لیکن سخت مایوسی ہوتی ہے۔

بہرحال کیا کہیے! معاشرے میں جہاں کچھ خامیاں اور برائیاں موجود ہیں، وہیں نیک سیرت اور ایسے مخیّر دردمند دل لوگ بھی موجود ہیں جو اپنے پرائے کا فرق مٹا کر ہر ایک ضرورت مند کو سینے سے لگاتے اور مدد کرتے ہیں۔



ہولناک دھمک کے ساتھ اچانک زمین لرزنے لگی اور پہاڑوں پر برف کے بڑے بڑے تودے اپنی جگہ چھوڑ چھوڑ کر پھسلتے ہوئے گہری کھائیوں میں گرنے لگے۔ وسیع و عریض برف زار کے پس منظر میں ایک قوی الجثہ پیکر حرکت کرتا ہوا نظر آیا جس کا سارا وجود لمبے سفید بالوں سے ڈھکا تھا۔ پہلی نظر میں وہ برف ہی کا ایک بڑا سا تودہ محسوس ہوتا۔ جیسے ہی قریب آیا اور ہماری نظر اس کے بھیانک چہرے پر پڑی تو اس کا کھلا خوفناک جبڑا اور اس سے جھانکتے بڑے بڑے دانت دیکھ کر خوف کے مارے ہمارے جسم میں کپکپی طاری ہوگئی۔ ہم نے سینما کی سیٹ پر ساتھ بیٹھے اپنے بڑے بھائی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا جو ہماری ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر زیرلب مسکرا رہے تھے۔

جی ہاں، یہ واقعہ ہمارے بچپن کا ہے جب ہم ضد کر کے اپنے شہر کے سینما گھر میں لگنے والی فلم ''The mighty Hamalyan man'' دیکھنے گئے تھے۔ وہ ہمالیہ کے پہاڑوں میں بسنے والی ایک پراسرار خیالی مخلوق کے بارے میں تھی جسے عرف عام میں 'یٹی' (Yeti) کہا جاتا ہے۔ اس پراسرار مخلوق کو سینما سکوپ اسکرین پر دیکھ کر ہمارا وہ حال ہوا جو اوپر بیان کیا گیا۔ فلم کے مناظر اتنے حقیقی تھے کہ آج تک ہمارے حافظے کی لوح پر محفوظ ہیں۔

'یٹی ایک خیالی مخلوق ہے یا اس کا وجود ایک حقیقت ہے؟ اس بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو 'یٹی' کو دیکھنے کے دعویدار ہیں۔ جبکہ بے شمار لوگ اس کو محض افسانہ سمجھتے ہیں۔ شاید آپ کو بھی 'یٹی' کے وجود پر

یقین نہ ہو۔

’یٹی‘ کو بڑی حد تک ایک دیو مالائی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ یہ حیوان نما عفریت لوک کہانیوں اور ناقابل یقین داستانوں کا ایک ثقافتی حصہ بن چکا۔ ہم میں سے بہت سوں کے لیے یہ وہ کردار ہے جس کے دلچسپ قصے سردیوں کی طویل راتوں میں کیمپ فائر کے دوران وقت گزاری کا بہترین ذریعہ ہیں۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کہانیوں کی آخر کوئی نہ کوئی بنیاد ہوتی ہے۔ ’یٹی‘ کا کردار بھی اُس بنیادی تعلق کی نمائندگی کرتا ہے کہ انسان پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ’یٹی‘ کو بنی نوع انسان کی گمشدہ کڑی کے طور پر بھی لیا جاتا ہے۔ اگر دو پیروں پر چلنے والی ایک گوریلا نما ذہین مخلوق حقیقت میں وجود رکھتی ہے تو کیا اس کا تعلق انسانی ارتقاء کے ابتدائی دور سے ہے؟ کیا ڈارون کا نظریہ درست ہے؟ کیا ہم انسان بھی دوسرے جانوروں کی طرح کے حیوان ہیں جو خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں؟

اگر ’یٹی‘ ایک حقیقت ہے تو......

امید ہے کہ مشہور امریکی مہم جو ’’جوش گیٹس‘‘ اس سوال کا جواب دریافت کر سکے۔ وہ ٹی وی کی ’’ٹریول چینل سیریز‘‘ کے سلسلے میں ’یٹی‘ کے اسرار کی کھوج لگانے کے بارے میں ایک مہم پر نکلنے والا ہے۔ "Expedition Unknown: Hunt for the Yeti" نامی اس ٹی وی سیریز کے ذریعے اس سارے معاملے کو معتبر طریقوں سے کھنگالا جائے گا۔ اب تک ’یٹی‘ کے وجود سے متعلق دریافت ہونے والے بہت سے شواہد ضائع ہو چکے لیکن ایسے بے شمار مادی شواہد موجود ہیں جن سے ’’یٹی‘‘ کی حقیقت ثابت کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ یہ شواہد وہ ہیں کہ جن کو کسی بھی طرح من گھڑت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ’یٹی‘ کی آمد و رفت سے بننے والے راستے، ان کے لمبے بال اور غیظ و غضب کا نشانہ بننے والے ٹوٹے پھوٹے درخت اور ایسے ہی دیگر بہت سے شواہد کو احتیاط کے ساتھ محفوظ کر لیا گیا ہے۔

’یٹی‘ کہاں سے آئے؟

اس جنگلی پہاڑی عفریت کی کہانیاں دنیا کے ہر کونے میں سننے کو ملتی ہیں مگر اس کے متعلق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ داستانیں نیپال میں سنی گئیں۔ ’یٹی‘ کا لفظ بھی نیپالی زبان سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے: ’’پہاڑی انسان‘‘۔ بہت سے لوگوں کا ماننا ہے کہ ’یٹی‘ کا دیو مالائی کردار قبل از بدھا کے دور سے تعلق رکھنے والے ہمالیائی گروہوں کے روحانی صحیفوں میں مذکور ہے۔

یہ گروہ ایک ایسے خدا کا بہت احترام کرتے تھے جسے انہوں نے ’’شکار کا خدا‘‘ کا نام دیا کیونکہ اُن کی زندگیوں کا دارومدار شکار پر تھا۔ اس خدا کے لیے وہ بعض اوقات ’’گلیشئر کا باسی‘‘ کا حوالہ جاتی نام بھی استعمال کرتے رہے۔ ان کے نزدیک یہ وجود آدھا انسانی اور آدھا ریچھ کی شکل کا تھا جو برفانی بیابانوں میں آوارہ گھومتا رہتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ اُسے انسان دوست تصور کرتے تھے۔

یہی وہ کہانیاں تھیں جن سے متاثر ہو کر امریکی تاریخ دان ڈینیل سی ٹیلر اور رابرٹ ایل فلیمنگ جونیئر نے ۱۹۸۳ء میں ’یٹی‘ تلاش کرنے کی مہم شروع کی۔ نیپال کے ’’بارن‘‘ نامی گاؤں میں کھوج لگانے کے دوران اُن کی ٹولی نے بڑے بڑے انسان نما پیروں کے نشان، درختوں کے درمیان بنی مچانوں اور بارن کے باشندوں سے ریچھ نما بہت بڑی مخلوق کے بارے میں رنگ برنگی کہانیاں دریافت کیں۔ گو اس مہم کا آخری نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ وہ مخلوق ایک بپھرا ہوا جنگلی ریچھ تھا۔ مگر بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ اس مہم نے ’یٹی‘ کی موجودگی کی نشان دہی کرنے والے بہت سے نمایاں ثبوت بے نقاب کر دیے۔ اسی لیے اگر کوئی ’یٹی‘ کے پیچھے جانا چاہتا ہے تو بہتر ہے

اسے چاہیے، وہ نیپال کا رخ کرے۔

’یٹی‘ کہاں رہتا ہے؟

یہ واضح ہے کہ نیپال کے درختوں میں جو مچان نما گھر ٹیلر اور فلیمنگ نے دریافت کیے، وہ کسی ریچھ نے نہیں بنائے تھے۔ اگر یہ حقیقت میں ’یٹی‘ نے ہی بنائے تھے تو پھر یہ امر عیاں کرتا ہے کہ ’یٹی‘ درختوں کی بلندیوں پر گھر بنانے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ شمالی امریکا کے محققوں کی تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ ’یٹی‘ غاروں میں رہتے ہیں۔ شاید وہ جب ضرورت محسوس کریں تو درختوں پر بھی رہ لیتے ہوں۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ’یٹی‘ انسانوں ہی کی طرح حیوانات کی ایک اعلیٰ نسل ہیں، اس لیے ان کے ہاتھ پاؤں قدرتی طور پر درختوں پر چڑھنے کی مہارت رکھتے ہوں گے۔ ٹیلر اور فلیمنگ کی مہم میں درختوں پر بنے گھر ملے تھے۔ اگر وہ ’یٹی‘ ہی کے استعمال میں تھے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آرام کرنے کے لیے وہ گھر غاروں کی بانسبت زیادہ محفوظ ہو سکتے ہیں۔

کیا وہ ذہانت بھی رکھتے ہیں؟

اگر ہم ان کی ذہانت کا معیار جانچنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ یٹی انسان اور بن مانس کے درمیان کہیں کھڑے ہیں۔ ایک طرف تو وہ اتنے ہوشیار ہیں کہ ابھی تک اپنے آپ کو چھپائے رکھنے میں کامیاب ہیں۔ دوسری طرف اتنے گنوار کہ لباس پہننے کی تمیز نہیں رکھتے لیکن اس سے قطع نظر سوال یہ ہے کہ کیا وہ بات چیت کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں؟ کیا وہ زندگی کا ساتھی بھی بناتے ہیں؟ کیا وہ اپنے مردے دفناتے ہیں؟

۲۰۰۰ء میں ’یٹی‘ (جسے ’’بگ فٹ‘‘ بھی کہا جاتا ہے) کے بارے میں تحقیق کرنے والی ایک تنظیم ’’بگ فٹ فیلڈ ریسرچرز آرگنائزیشن‘‘ (BFRO) کے محققوں کو واشنگٹن ریاست کے علاقے ’’سکوکم میڈوز‘‘ سے زمین میں دبے ہوئے عظیم الجثہ جسم کی باقیات (فوسل) ملیں۔ یہ باقیات آپس میں کچھ اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ لگتا تھا جیسے کسی دھات کو پگھلا کر سانچے میں ڈھال دیا گیا ہو۔ اسی وجہ سے یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا کہ یہ باقیات کس جاندار کی تھیں۔

خیال ہے کہ یہ ’یٹی‘ کی باقیات تھیں کیونکہ اندازہ لگایا گیا کہ وہ جاندار حجم میں عام چھ فٹ انسان سے تقریباً چالیس فیصد بڑا تھا۔ یہ باقیات اس بات کا ممکنہ ثبوت تھیں کہ ’یٹی‘ (یا اس جیسی مخلوق) اپنے مردوں کو باقاعدہ دفن کرتے ہیں۔ یہ دریافت نمایاں اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اگر ’یٹی‘ واقعی اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوا کہ وہ جزوی طور پر ہی سہی اپنے متعلق کم از کم کچھ شعور بہر حال رکھتے اور موت و حیات کے فلسفے سے آگاہ ہیں۔ حیوانات کی دنیا میں شاذ و نادر ہی معیاری ذہانت نظر آتی ہے۔ اسی لیے یہ وضاحت قابل توجہ ہے کہ ’یٹی‘ کو پکڑنا کیوں اتنا مشکل ہے۔ ’یٹی‘ جانداروں کی ذہین اقسام میں سے ایک ہے۔

’یٹی‘ کو اب تک کیوں نہیں پکڑا جا سکا؟

کیا آپ نے کبھی کسی ریچھ کو پکڑنے کی کوشش کی ہے؟ یقیناً نہیں۔ یہ سوچنا بھی مضحکہ خیز ہے کیونکہ یہ ایک ہولناک کام ہے۔ اب آپ ایک ایسے ریچھ کا تصور کریں جو سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے، جس کی ذہانت کا یہ معیار ہو کہ وہ منصوبہ بندی بھی کر سکتا ہو اور جو خوفناک پنجے رکھتا ہو تو اس کو پکڑنا نہایت کٹھن کام ہے۔ یہی ’یٹی‘ کے اب تک نہ پکڑے جانے کی اہم وجہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی جانداروں کی طرح ’یٹی‘ میں بھی اپنے آپ کو ماحول سے ہم آہنگ کر کے چھپنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

مزید برآں جب ایک بار ہم یہ مان لیں کہ ’یٹی‘ ایک انتہائی ذہین مخلوق ہے تو پھر یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اپنے دیکھ نہ لیے جانے کے معاملے میں بہت چوکس ہوگا۔ گویا ہم اس لیے ’یٹی‘ نہیں پکڑ سکے کیونکہ وہ خود بھی یہ نہیں چاہتا کہ پکڑا

جائے۔ یہاں تک کہ اگر ہمارے پاس 'یٹی' کی موجودگی کا واضح ثبوت بھی ہوتا تو بھی ہمیں صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا کہ اسے کیسے قابو کرکے زندہ پکڑا جائے۔

'یٹی' کا کوئی تصویری ثبوت کیوں نہیں؟

'یٹی' کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی تصاویر ہمیشہ دھندلی ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے کئی لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ 'یٹی' محض دھوکا اور فریب نظر ہے۔ اس لیے یہ لوگ الزام لگاتے ہیں کہ ان تصاویر کو جان بوجھ کر دھندلا رکھا جاتا ہے تا کہ سچ کو چھپایا جاسکے۔ اس شبے کو راجر پیٹرسن کی کھینچی گئیں 'یٹی' کی دھندلی تصاویر اور ویڈیو سے بھی تقویت ملتی ہے۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر آپ جنگل میں ہوں اور اچانک آپ کے سامنے 'یٹی' آجائے تو آپ کیا کریں گے؟ اگر آپ بہت ہوشیار بھی ہوئے اور آپ کو اپنا موبائل فون یا ڈیجیٹل کیمرہ نکال کے تصویر اتارنے کا موقع بھی مل جائے تو بھی کیا وہ تصویر صاف اور واضح ہوگی؟ شاید نہیں۔

کیا 'یٹی' خطرناک ہوتے ہیں؟

میڈیا میں جب بھی 'یٹی' کے بارے میں کچھ بتایا یا دکھایا جائے تو اُس کو ایک عفریت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ روایت ۱۹۷۷ء میں 'یٹی' پر بننے والی فلم کے بعد شروع ہوئی۔ اس میں ایک انسان نما طویل القامت جناتی بلا کو چھوٹے سے شہر میں باسیوں کو دہشت زدہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ 'یٹی' جیسے منفرد موضوع پر بننے والی یہ فلم اس بات کا ثبوت بھی تھی کہ 'یٹی' کی موجودگی کے بارے میں ہمارا ابتدائی ردعمل صرف خوف پر مبنی ہے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ایسا کوئی ثبوت نہیں جس سے ثابت ہوسکے کہ 'یٹی' انسانوں کے لیے نقصان دہ ہے یا وہ ان کا شکار کرتا ہے، یا پھر انسانوں کے ساتھ تصادم کو پسند کرتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ 'یٹی' ایک صلح جو، شرمیلی اور کم گو مخلوق ہوسکتی ہے جیسا کہ گوریلے ہوتے ہیں۔ وہ نہ دوسرے جانداروں کا شکار کرتے ہیں اور نہ ہی انھیں کھاتے ہیں۔ البتہ تمام جانداروں کی یہ جبلت ہے کہ وہ جب اپنے آپ کو، بچوں یا اپنے گھر کو خطرے میں دیکھیں تو پھر مجبوراً اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس ردعمل کی شدت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کتنا خطرہ محسوس کررہے ہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ اپنی تصویر کھینچے جانے کے عمل کو بھی 'یٹی' کوئی خطرہ سمجھ بیٹھیں۔ سو مشورہ یہ ہے کہ اگر جنگل میں آپ کو کوئی 'یٹی' مل جائے اور بے شک آپ اس کی ایک دھندلی سی ہی تصویر بنانے میں کامیاب ہوجائیں تو پھر اس کے بعد جتنا تیز آپ وہاں سے بھاگ سکیں، بھاگ کھڑے ہوں۔

کیا واقعی 'یٹی' فریب نظر ہے؟

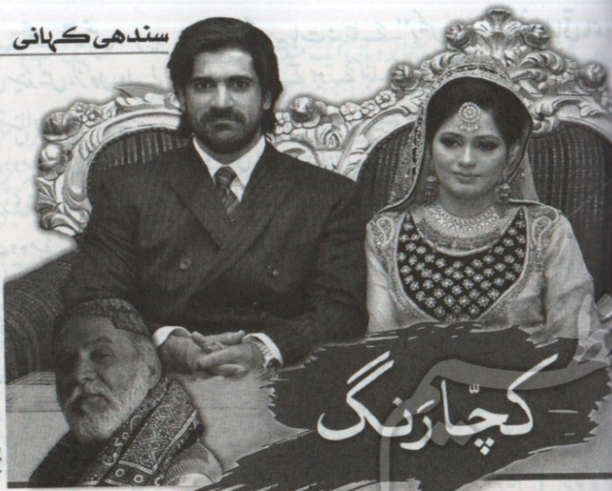
ہمیں 'یٹی' کے بارے میں پائے جانے والے شکوک شبہات پر مشکوک نہیں ہونا چاہیے۔ اکثر و بیشتر لوگ 'یٹی' کی موجودگی کے شواہد کو جعلی سمجھتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی دو رائے نہیں کہ بہت سی تصاویر، ویڈیوز اور دیگر شواہد جعلسازی سے بنائے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا تمام ثبوت من گھڑت ہیں؟ اس پہاڑ کی بنیاد میں کوئی رائی کا دانہ تک نہیں؟ ہم انتظار کرتے ہیں اور آپ بھی کریں۔ شاید وقت ہی پردہ چاک کرکے اس حقیقت کو آشکار کردے۔

حیرت

مریض نے ڈاکٹر سے کہا ''آپ نے مجھے طاقت کی جو گولیاں دی تھیں، وہ سب کی سب میں باقاعدگی سے کھا رہا ہوں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ اب میں خود کو کمزور محسوس کررہا ہوں۔''

''تم آج کل کیا کھا رہے ہو؟'' ڈاکٹر نے دریافت کیا۔

''اچھا! تو کیا ان گولیوں کے علاوہ مجھے کھانا بھی کھانا تھا؟'' مریض نے حیرت سے پوچھا۔



کچا رنگ

نسیم کھرل

ایک باغی کا قصہ عبرت، وڈیرا اُسے اپنی جائیداد سے عاق کرنے کے درپے تھا

اس شام رئیس شاہنواز اپنی کوٹھی کے کشادہ آنگن میں چارپائی پر لیٹا منقش حقے میں گڑ اور تمباکو کو ٹھنڈی پھونکیں مار مار کر پیتے ہوئے کامدار اور دوسرے کسانوں سے دن بھر کی کارگزاریوں کی روداد سن رہا تھا۔ تبھی منشی احمد جو کچھ دیر پہلے اپنی کمر سے ایک بڑی رقم باندھ کر ذوالفقار کی جانب گیا تھا، ہانپتا کانپتا واپس لوٹا۔ اس نے حسبِ روایت رئیس کے پیر چھو کر جب رئیس کے کان میں کھسر پھسر کی تو جیسے بھنبھور کو آگ لگا دی ہو۔ رئیس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ گھنی بھنویں اوپر نیچے ہونے لگیں۔ حقے کی نال ہونٹوں تک پہنچنے کی بجائے انگلیوں میں گردش کرتی رہی۔

کہیں بہت دیر بعد رئیس نے بے دلی سے ایک پھونک ماری اور گردن ٹیڑھی کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔ جوتے بجائے اچھی طرح پہننے کے وہ جوتے گھسیٹتا ہوا حویلی کی طرف دوڑا اور اپنی بیوی کو دیکھتے ہی رئیس دور سے چلایا:

''ہے.....سن ذرا.....''

''کیوں خیر تو ہے.....؟'' وڈیرانی نے جو ابھی ابھی نیند سے اٹھی تھی۔ زور دیتے ہوئے پوچھا۔ ایسی باتیں وہ روز ہی سنتی تھی۔ کسی لڑکی کا بھاگنا، کوئی خون، کوئی ڈاکا، رئیس کے پاس بتلانے کو اس کے سوا تھا بھی کیا؟ اس کی باتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔

''وری خیر کیسی' لڑکے نے منہ کالا کر چھوڑا ہے۔''

وڈیرانی بیٹے کا ذکر سن کر سمجھ گئی کہ آج رئیس کا آنا خیریت سے نہیں ہے بلکہ کوئی اہم بات ہے۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر رئیس سے پوچھا:

''کیوں کیا کیا ہے.....؟''

''کراچی میں میڈم سے نکاح پڑھا لیا ہے۔''

''ہائے تو غرق ہو۔'' وڈیرانی نے دوہتڑ رانوں پر مارتے ہوئے کہا۔ یوں تو وڈیرانی کے لیے بیٹے کی شادی کی خبر خوش کن ہوتی، کیونکہ وہ برسوں سے اسی انتظار میں تھی کہ اس کا بیٹا بھی اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوجائے لیکن یہاں معاملہ ہی الٹا تھا۔ ایک طرف تو بھتیجی بیٹے کی منگیتر تھی اور دوسری بات یہ کہ یہ شہری میڈمیں اسے بھاتی نہیں تھیں۔ کتنی ہی مرتبہ جب رئیس نے صاحب لوگوں اور میڈموں کو شکار کی دعوتیں دی تھیں تو وہ حویلی کے زینوں پر چڑھ کر دروازے کی جھریوں سے میڈموں کو اوطاق میں ناز نخرے سے گھومتے دیکھ کر تعجب کا شکار ہوگئی تھی۔

ان کی اونچی اونچی چھوٹی قمیصیں، تنگ پتلونیں، سر پر رنگ برنگ ٹوپیاں اور اونچی ایڑی والی سینڈلیں، لڑکوں والے بال اور مردوں کے ساتھ گھومنا پھرنا، ہنسنا اور بات کرنا یہ سب اُسے پسند نہ آیا تھا۔ ایک دفعہ تو رئیس دو میڈموں کو اندر حویلی میں لے آیا۔ اس نے اللہ اللہ کر کے بڑی مشکل سے انہیں اپنا منہ دکھایا۔ اس کو ایسی شرم آئی تھی جیسے وہ میڈ میں عورتیں نہیں بلکہ مخالف جنس میں سے ہوں۔ اب ایسی بہو کا خیال آتے ہی اسے آگ لگ گئی تھی لیکن اس نے صرف اتنا ہی کہا:۔

''نہیں نہیں، یہ بات جھوٹ ہو گی۔''

''جھوٹ بھلا کیسے...... منشی خود دیکھ کر آیا ہے۔ گیا تھا نا اس کو پیسے دینے''۔ رئیس نے بڑی سختی سے اس کی بات رد کر دی۔

وڈیرانی کے دل کو یہ بات سولہ آنے لگی کیونکہ واقعی منشی پیسے لے کر گیا تھا لیکن پھر بھی نکاح والی بات پر اعتبار کرنے میں تامل تھا۔ اس کے خاندان میں آخر کس نے یہ بندھن آرام سے بندھوایا تھا؟ میاں شاہنواز خاں، سر قیصر خاں اور اس کے والد سنجر خاں کی باتیں کس سے پوشیدہ تھیں؟ بیویاں تو بے شک ان کی خالہ زاد ماموں زاد اور چچازاد ہی تھیں لیکن شادی سے پہلے اور بعد انہوں نے کیا کیا نہ کیا تھا۔ پھر ذوالفقار علی بھی انہی کی اولاد تھا اور اسے یہ چیز ورثے میں ملی تھی۔ چھٹیوں میں گوٹھ میں آتا تھا تو حویلی میں کام کاج کرنے والی جوان نوکرانیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا۔ بھلے منشی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا لیکن آنکھ دیکھی بات پر بھی غور کرنا ضروری تھا۔ اس لیے وڈیرانی نے اپنا پلو سر پر جماتے ہوئے آنکھیں نیچی کر کے کہا:۔

''نکاح نہیں کیا ہو گا، ایسے ہی......!'' عورت ذات اور کیا کہہ سکتی تھی۔

رئیس نے وڈیرانی کی ''ایسے ہی'' کو سمجھ کر کہا۔ ''ایسے ہی نہیں ہے۔ خود میرا منشی مجھ سے ایسی خوفناک قتل جیسی بات چھپائے گا کیا؟ اس نے تو ساری بات مان کر منشی سے منت کی ہے کہ مجھے یہ بات نہ بتائے۔'' رئیس نے وڈیرانی کا باقی ماندہ شک دور کرتے ہوئے کہا۔ پھر یوں اس کی جانب دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو: ''ایسے ویسے ہی ہوتا تو فکر کی بات تھی کیا؟ وڈیرانی بات پر یقین کر کے سن ہو گئی۔ بے چاری کو بھائی بھابی کے طعنے یاد آنے لگے۔ وہ پریشان ہو گئی اور شوہر سے پوچھا ''پھر......؟''

''پھر کیا؟ بس یہ سمجھ لے کہ ذوالفقار پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔''

باہر نوکر چاکر منشی احمد علی کے پیچھے پڑے تھے۔ ہر کوئی راز کھوجنے کی فکر میں بے چین تھا جس کی وجہ سے رئیس محفل چھوڑ کر گھر بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن منشی احمد علی نے کسی کا بھی داؤ نہ چلنے دیا۔ اور ہر کسی کو یہی جواب دیا ''رئیس آئے تو پوچھ لینا اسی سے۔ بتانے کی بات نہیں ہے۔''

کامدار بیگ محمد جس سے رئیس ذرہ برابر بات بھی نہ چھپاتا تھا، اس کو منشی کی ہٹ دھرمی پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے منشی کو طعنہ دیتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے تو نہ بتا منشی لیکن رئیس آتے ہی بات کرے گا۔''

وہ سب انہی باتوں میں مشغول تھے کہ رئیس واپس لوٹ آیا۔ مگر باہر آنگن میں بیٹھنے کے بجائے کوٹھی میں جا کر بیٹھا۔ کامدار بیگ محمد اور منشی بھی رئیس کے ساتھ ساتھ لگے رہے۔ چارپائی پر بیٹھتے ہی رئیس نے کامدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اچھا ہوا کامدار جو تو یہاں ہے، منشی کا احوال سنا۔''

''ناں سائیں۔'' کامدار نے منشی کی طرف احساسِ بڑائی سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''دیکھا خواہ مخواہ میرا اعتبار گنوایا۔''

''اچھا منشی تو سارا حال بتا''۔ رئیس نے منشی کو حکم دیا۔ منشی نے گاؤں کے دستور کے مطابق تفصیلاً شروع سے حال بیان کرنا شروع کیا کہ کس طرح اس نے ساری رات گاڑی میں آنکھ بھی نہ جھپکی کہ کہیں کوئی جیب کترا اس کی کمر سے بندھے ہوئے روپے نہ اڑا لے جائے، کس طرح وہ صبح کو

چھوٹے رئیس کے بنگلے پر پہنچا تو وہاں ایک میڈم کو بھی اس کے ساتھ دیکھا۔ اس کے ہاتھوں سے ابھی مہندی کا رنگ بھی نہ چھوٹا تھا اور کس طرح اس کے پوچھنے پر چھوٹے رئیس کا منہ اتر گیا اور اس نے منتیں کر کے کہا تھا کہ یہ بات کسی کو بھی نہ بتائے، اتنی بات کر کے منشی احمد علی نے کامدار کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بھائی کامدار دیکھو نا، یہ بات چھوٹی موٹی تو نہیں تھی جو میں اس پر پردہ ڈال دیتا اور وہ چھپ جاتی۔ وہاں تو بم پھٹا ہوا تھا۔ میں بھلا کیسے چھپاتا؟''

کامدار بیگ محمد نے چھوٹے رئیس کو اپنے کندھوں پر کھلایا اور گھمایا تھا اور اسے چھوٹے رئیس سے پیار بھی بہت تھا۔ اس کو منشی کی جلد بازی پر بہت غصہ آیا۔ اس کو اگر یہ بات معلوم ہوتی تو شاید وہ اس پر پردہ ڈالے رکھتا لیکن رئیس کے سامنے وہ منشی کو کیا کہہ سکتا تھا۔ اس نے فقط اتنا ہی کہا ''ہاں بھائی...... بابا سے کیسے جھوٹ بولتا؟''

رئیس نے جس کو یہ گہری گہری باتیں پسند نہیں آئی تھیں، منشی سے پوچھا ''تو نے ذوالفقار سے یہ نہیں کہا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں آئے گی؟''

''سائیں میں کیا کہتا، وہ خود بھی تو سمجھتا ہو گا۔'' منشی نے جواب دیا۔

رئیس خاموش ہو کر سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کامدار بیگ محمد نے منشی سے کہا، حقیقت میں یہ بات وہ رئیس کو سنانا چاہتا تھا۔ ''بھائی منشی، چھوٹا رئیس بھی سمجھ دار ہے۔ اگر اس نے ہاتھ مارا ہو گا تو دیکھ بھال کر کسی خاندانی گھرانے میں ہی مارا ہو گا۔'' یہ کہہ کر اس نے رئیس کی جانب دیکھا جسے یہ گفتگو پسند نہیں آئی تھی۔

اس نے گردن اکڑاتے ہوئے جھنجلا کر کہا ''کامدار بڑے شہروں والے کہاں کے خاندانی ہیں، تو خواہ مخواہ ذوالفقار کی طرف داری کرتا ہے۔ اب تیری خیر خواہی یہ ہے کہ ایسے مشورے دینے کی بجائے اس معاملے میں چپ ہی رہ۔''

''سائیں اب ہاتھوں سے نکلی بات ہے۔ بھلا کیا کر سکتے ہیں ہم؟''

''ارے تو تیری مرضی یہ ہے کہ اس لڑکی کو گھر میں لے آؤں؟ جس کے سر پر چادر تو کیا کپڑے کی دھجی بھی نہیں ہے۔'' رئیس کی آنکھیں الاؤ کی طرح دہکنے لگیں۔ کامدار ڈانٹ ڈپٹ پر چپ ہو گیا۔ لیکن یہ سمجھ میں آ گیا کہ اگر چھوٹے رئیس کی طرف داری کی تو پھر اس کی عزت کی بھی خیر نہیں۔ ویسے بھی یہ معاملہ بات ہی بات میں خاصا بڑھ چکا تھا۔ اس نے رئیس کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ وہ ایک ایسی لڑکی کو لے آئے جس کا چہرہ بے پردہ تھا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد رئیس کچھ ٹھنڈا ہوا تو اس نے خود ہی دوبارہ گفتگو شروع کی:

''کامدار اب صلاح مشورہ کر کہ کیا کریں۔ رستم خان نے جو گالی دینی ہے، اس کا کیا ہو گا؟''

کامدار رئیس کے سوال سے سمجھ گیا کہ رئیس کو گالی کی فکر تھی لیکن زیادہ پریشانی اس جائیداد کی تھی جس کی وارث رستم کی بیٹی تھی۔ اسی کی وجہ سے اس نے اپنے بیٹے کی منگنی گھر میں بھتیجی کے ہوتے ہوئے بھی رستم خاں کی بیٹی سے کر دی تھی۔ کامدار نے رئیس کی فکر کو سمجھتے ہوئے کہا:

''سائیں اس بات کی فکر نہ کریں۔ وہ یہ والی منگ تھوڑی ہی چھوڑے گا۔''

لیکن رئیس کو اس کی جاہلانہ عقل پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے سخت غصے بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ''ارے کیسے کر سکے گا دوسری شادی۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ دستخط کیسے دے گی اسے؟ سب کو جیل میں بند کروائے گی۔''

کامدار یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ رئیس کی بات درست تھی کیونکہ گورنمنٹ نے دوسری شادی پر بندش لگائی ہوئی تھی۔ کامدار بے چارے نے تو جاہلانہ عقل کے مطابق ایک مشورہ نکال پھینکا تھا جو صحیح نشانے پر نہیں بیٹھا۔ زمینوں کی

دیکھ بھال، فصلوں کی کٹائی یا دشمنوں کے فیصلے کرنے ہوتے تو وہ ایسا مشورہ دیتا جیسے انگشتری میں نگینہ، لیکن یہاں معاملہ اس سے آگے بڑھا ہوا تھا۔ وہ عقل لڑا لڑا کر تھک گیا تھا۔ لہٰذا چپ ہو کر یوں رئیس کی طرف تکنے لگا جیسے کہتا ہو "سائیں ہم کیا اور ہمارے جاہلانہ مشورے کیسے، تو خود ہی اپنے بڑے دماغ سے کام لے کر کوئی صحیح مشورہ نکال......"

سائیں جو ایک لمبی سوچ میں گم تھا! منشی اور کامدار کو چپ دیکھ کر اندازہ لگانے لگا کہ وہ اس کے فیصلے کے منتظر ہیں۔ اس نے دیر کیے بغیر کہا۔ "کامدار تو ذوالفقار کی طرف جا اور اس کو کہہ کہ "شرع" کے تین پتھر دے کر فوراً یہاں چلا آئے دوسری صورت میں ہم سمجھیں گے کہ وہ ہمارے لیے مر گیا۔""

☆☆☆

دو تین دن بعد کامدار محمد بیگ واپس لوٹا تو حال احوال سنانے سے پہلے ہی اس کی صورت سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کو کیا جواب ملا ہے۔ اس شریف آدمی نے بھی ادھر ادھر کی بات چھوڑ کر مختصر الفاظ میں بات کھول کر بیان کی۔ "سائیں چھوٹے رئیس نے جواب نہیں دیا' جوتے مارے ہیں، وہ اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں۔ باقی اس نے خط میں لکھا ہے۔" یہ کہہ کر کامدار نے صدری کی اندرونی جیب سے لفافہ نکال کر رئیس کو دیا۔ اس میں تحریر تھا۔

"قدم چومنے کے بعد عرض ہے کہ کامدار نے آپ کا پیغام پہنچایا۔ اگر آپ حکم دیتے تو خود کو مار ڈالنا میرے لیے دکھ کی بات نہ ہوتی۔ پارس میری زندگی ہے۔ اس کے بغیر زندہ رہنا میرے بس سے باہر ہے زیادہ حدِ ادب۔

آپ کے قدموں کی دھول

ذوالفقار

رئیس خط پڑھ کر غصے سے پاگل ہو گیا۔ خط کو پرزے پرزے کر کے اچھال دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر حویلی میں آیا تو گھر والی سے کہا "سنا ذوالفقار کا جواب؟"

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے پارس کو نہیں چھوڑوں گا جب تک سانس باقی ہے۔"

"پارس کیا......؟ وڈیرانی کو سمجھ نہ آیا۔

"پارس ہے، بہو کا نام......" رئیس نے غصہ سے کہا۔

وڈیرانی بہو کا نام سن کر تعجّب میں پڑ گئی۔ اس کے خاندان میں پہلے سندھی نام رکھے جاتے تھے جیسے ہدایت خاتون، فاطمہ، ہاجراں اور جنت وغیرہ۔ یہ مرنے والی بڑی بوڑھیوں، نانیوں اور خالاؤں کے بعد پیدا ہونے والی لڑکیوں کے رکھے جاتے تھے۔ اس کے بعد زمانہ بدلا، ترقی ہوئی تو فارسی کی کتابوں سے نام رکھے جانے لگے مثلاً زبیدہ یا زیب النساء وغیرہ لیکن ایسا نام نہ کبھی سنا اور نہ رکھا تھا۔ وڈیرانی کو یقین ہو گیا کہ بیٹے نے کسی بنیانی سے نکاح کر لیا ہے۔ گھبرا کر رئیس سے پوچھا:

"مر جاؤں کیا کسی بنیانی سے شادی کر لی ہے......"

رئیس کو تو پارس کا مطلب آتا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ پارس پتھر پرانے طویل پہاڑی سلسلوں میں سے کسی قسمت والے کو ملتا ہے۔ جس کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ لوہے پر رگڑا جائے تو لوہا بھی سونا بن جاتا ہے۔ رئیس کو پارس نام سن کر کوئی تعجّب نہ ہوا۔ کیونکہ وڈیرے نے اس سے بھی "اوور" نام سنے تھے لیکن اُسے ذوالفقار پر چونکہ بہت غصہ تھا لہٰذا اس نے وڈیرانی کو ورغلانے کے لیے صرف اتنا ہی جواب دیا:

"نہیں تو کیا پنج وقتہ نمازن سے شادی کی ہے؟"

وڈیرانی یہ سن کر سوچ میں پڑ گئی۔ منٹ بھر بعد اس نے پوچھا "اب کیا ہو گا؟"

"ہو گا...... وری کیا...... میں صبح ہی جا کر ساری ملکیت انور علی کے نام کر دیتا ہوں۔ باقی رہا رستم خاں تو اس کے پاس تو اور میں دونوں گردن سے کفن باندھ کر جائیں گے اور معافی مانگیں گے۔" رئیس نے جز بز ہو کر جواب دیا۔

وڈیرانی کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ انور علی بھی اس کا بیٹ جایا تھا لیکن پھر بھی پہلے بیٹے کی حیثیت سے ذوالفقار کی جگہ کس طرح لے سکتا تھا؟ دونوں اس کی آنکھوں کا نور تھے۔ اگر ذوالفقار دائیں آنکھ تو انور علی بائیں اور اگر انور علی دائیں تو ذوالفقار بائیں آنکھ۔ لیکن ایک آنکھ کا حسن دوسری سے ہی قائم ہے۔ وڈیرانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ "اللہ اللہ کرو، ایسا کیسے کرو گے۔"

رئیس جس کا غصہ عروج پر تھا گھر والی کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ "اللہ تعالیٰ کی قسم اگر یہاں ہوتا تو اسے گولی مار دیتا۔ میں یہ کس طرح برداشت کروں کہ کل کو اپنے باپ دادا کی جمع کی ہوئی دولت میں سے میڈم کا بیٹا حصہ دار ہو جائے۔ وہ بھی نہ جانے کس کا۔" ذوالفقار سارا دن بیوی پر پہرہ دے گا کیا؟"

وڈیرانی نے اس وقت تو بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا لیکن جب رئیس سو گیا تو کسی کو کہا کہ جا کر کامدار بیگ سے کہے کہ اگر ساری عمر کھائے ہوئے نمک کا حق حلال کرنا ہے تو کسی بھی طرح رئیس کو اس اندھیر سے باز رکھے۔ دوسرے دن جب رئیس اپنے کاغذات کا پلندہ اٹھائے تعلّقہ کی جانب روانہ ہونے کے لیے باہر نکلا تو کامدار بیگ محمد نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے اسے ہاتھ جوڑ کر ادب سے کہا:

"سائیں گھوڑے اور بیٹے دونوں قابو سے باہر ہونے لگتے ہیں مگر گھوڑوں کی مستی پر قابو پانا گھڑسواروں کا کام اور بیٹے کو گلے لگا کر ٹھنڈے دل سے سمجھانا باپ کا کام ہے۔"

رئیس نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولا: "تو کیا کہنا چاہتا ہے' کھل کر بتا!"

"قربان جاؤں میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ خود اسے ٹھنڈے دل سے سمجھائیں۔ اگر نہ سمجھے تو پھر نہ تو وہ گھوڑا بھاگا جاتا ہے نہ ہی سرکاری کھاتا' وہ تو بعد میں بھی بدلا جا سکتا ہے۔

رئیس ابھی سوچ ہی میں تھا کہ کیا جواب دے۔ اس وقت کامدار چھلانگ لگا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور چلا کر منشی سے کہا "منشی یہ کاغذات کا پلندا اٹھا کر اندر بھیج دے۔ رئیس اور میں چھوٹے رئیس کی طرف جاتے ہیں۔"

"کامدار بے چارے نے تو جاہلانہ عقل کے مطابق ایک مشورہ نکال پھینکا تھا جو صحیح نشانے پر نہیں بیٹھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال، فصلوں کی کٹائی یا دشمنوں کے فیصلے کرنے ہوتے تو وہ ایسا مشورہ دیتا جیسے انگشتری میں نگینہ، لیکن یہاں معاملہ اس سے آگے بڑھا ہوا تھا۔ وہ عقل لڑا لڑا کر تھک گیا تھا"

رئیس شاہنواز نے "پارس ہاؤس" کے کمپاؤنڈ میں قدم رکھا تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ حالانکہ اپنے بڑھاپے کے لیے یہ جگہ خود اس نے خریدی تھی لیکن اب اندر لگے نئے نئے آراستہ گل بوٹے، بڑے لان، کوٹھی کے نئے رنگ و روغن اور اس کے اوپر کالے حروف سے لکھے نام "پارس" نے سارا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ کامدار نے جو یہ سارا کچھ پہلے ہی دیکھ کر جا چکا تھا' رئیس کو خوش کرنے کے لیے کہا:

"سائیں جگہ ہمیشہ محنت مانگتی ہے۔ دیکھیں تو کیسی ہری بھری ہو گئی ہے۔"

رئیس کو خود بھی دل میں یہ ہریالی بہت بھائی لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے بیل دبائی اور جس نے دروازہ کھولا وہ ذوالفقار ہی تھا۔ والد کے رعب دار چہرے اور انگاروں جیسی آنکھوں کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ پھر سنبھل کر والد کے پیروں کو چھوا اور تعظیم سے اندر ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھایا۔ رئیس نے دیواروں پر آویزاں بڑی بڑی

تصویروں اور فرش پر بچھے ہوئے غالیچوں پر نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا ’’ذوالفقار میں تیرے ٹھاٹھ باٹھ دیکھنے نہیں آیا بلکہ تجھ سے آخری مرتبہ بات کرنی ہے۔‘‘

ذوالفقار باپ کے رعب دار چہرے کی طرف دیکھ کر گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر کچھ کہنا چاہا مگر اس سے ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔ دوبارہ بھی رئیس ہی بولا۔ ’’بیوی کو سمجھا دے میرے سامنے نہ آئے۔ نہیں تو...... بلکہ اچھا ہو گا تو اسے کہہ دے کہ تین گھنٹوں کے لیے اپنے والدین کے گھر چلی جائے، کہیں میں کوئی کڑوی بات نہ کر بیٹھوں۔‘‘

ذوالفقار نے حوصلہ جمع کر کے جواب دیا ’’بابا! بے شک آپ کھل کر بات کریں، وہ صبح سے والدین کے گھر گئی ہوئی ہے۔‘‘

بہو کی غیر حاضری کا سن کر پہلے تو رئیس کے دل میں آیا کہ بیٹے سے پوچھے ’’والدین کی طرف گئی ہے یا کہیں اور لیکن پھر اس نے سوچا، بچے تو سبھی کو پیارے ہوتے ہیں، یہاں تو اس کے سامنے ذوالفقار تھا۔ اس لیے فقط اتنا کہنے پر اکتفا کیا۔ ’’اچھا ہوا میری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔‘‘

تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ رئیس سوچنے لگا کہ مطلب کی بات کیسے شروع کی جائے لیکن دوسرے لمحے جب خیال آیا کہ سامنے خود اس کا بیٹا ہی تو تھا جس کے لیے کسی تمہید کی ضرورت قطعی نہیں تو یہ سوچتے ہی وہ جلال میں آ گیا۔ بولا:

ارے کون سا فیصلہ کیا ہے؟‘‘

’’میں کون سا فیصلہ کر سکتا ہوں بابا!!‘‘

’’پھر بھی کچھ تو بک۔‘‘

’’میں پارس کو نہیں چھوڑ سکتا۔‘‘

’’اس کے نتیجے کا پتا ہے......‘‘ رئیس نے غصے میں پوچھا۔

’’ہاں کامدار نے بتایا تھا۔‘‘

’’نہیں تجھے شاید پوری خبر نہیں...... میں تجھے اپنی ملکیت میں سے چھدام بھی نہیں دوں گا۔ یہ بنگلہ بھی میرا ہے۔ یہ بھی خالی کرنا پڑے گا۔‘‘ رئیس نے کھل کر کہا۔

’’جو حکم کریں گے، ویسا ہی کروں گا۔‘‘

رئیس ابھی کہنے ہی لگا تھا کہ اتنے میں بیرے نے آ کر ذوالفقار کو بتلایا کہ کلکٹر صاحب فون پر بلا رہے ہیں۔ کلکٹر کا نام سنتے ہی رئیس جو ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا، فوراً کھڑا ہو گیا۔ رئیس حالانکہ زمیندار اور اونچی حیثیت کا تھا۔ ضلع کے مختیار کاروں اور ڈپٹیوں سے اس کی دوستی ہوتی تھی لیکن کلکٹر کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا، وہ ہمیشہ الگ ہوتے تھے۔ گھنٹوں انتظار کے بعد پھر باریابی کا حکم دیتے تھے اور پھر دو منٹ میں فارغ بھی کر دیتے۔

پگڑی بندھوائی کے بعد سے رئیس کا واسطہ بہت سے کلکٹروں سے پڑا تھا۔ کئی کے نام یاد تھے۔ ایک ٹانٹن تھا۔ دوسرا اسیلڈن تھا، تیسرے کا نام ہیلی فاکس تھا۔ ایک کا نام بوتھ تھا جسے سب بھوت کہتے تھے۔ بعد میں تین چار دیسی بھی آئے لیکن سب یکساں طبیعتوں کے ایک جیسے، ایک قالب میں ڈھلے ہوئے۔ سب میں وہی بڑائی، روکھا پن تھا۔

ان کی رکھائی اور بڑائی کا سبب بھی تھا۔ وہ کسی زمیندار کو منٹوں میں اور بڑا زمیندار یا پھر فقیر بھی بنا سکتے تھے۔ حکومت ان کا ہی لکھا ہوا مانتی تھی۔ اس لیے ہر ایک ان سے ڈرتا تھا۔ ترچھا کاٹیں یا سیدھا، ان کا ذبح کیا ہوا حلال تھا۔ ان کی تو چھری مانی جاتی تھی۔ بڑا رئیس اپنے بیٹے کو کلکٹر سے فون پر بات کے لیے جاتے دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ ایک کلکٹر نے اسے روبرو بلانے کے بجائے فون پر بات چیت کر لی تھی۔ رئیس کو اندازہ ہو گیا کہ چونکہ اس کا بیٹا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، اس لیے یہ پھل اسے ملا۔ اگر وہ بھی جاہل، ناخواندہ ہوتا تو وہ بھی کلکٹر صاحب سے دو منٹ ملاقات کے لیے گھنٹوں گھنٹوں انتظار کرتا تب اسے باریابی کا حکم ملتا۔ ذوالفقار جب کلکٹر سے فون پر بات کر کے واپس لوٹا تو رئیس نے اس سے پوچھا:

’’کون سے کلکٹر کا فون تھا؟‘‘ رئیس نے اس لیے پوچھا تا کہ نام معلوم کر کے گوٹھ جائے اور شیخی سے چلائے کہ فلاں

کلکٹر سے اس کے بیٹے کی دوستی ہے تا کہ آس پاس کے زمینداروں پر رعب پڑے۔

’’پارس کے والد کا‘‘ ذوالفقار جواب دے کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

مگر رئیس کی زبان تالو سے چپک گئی۔ آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس نے غور سے ذوالفقار کو دیکھا جس کا سسر کلکٹر تھا۔ مگر جو اس کے سامنے سر جھکائے ادب سے کھڑا تھا۔ اتنے میں رئیس کو اپنے پیچھے زنانہ سینڈل کی ’’کھٹ کھٹ‘‘ سنائی دی۔ سر گھما کر دیکھا تو ایک بنا پردہ، بال کٹائے ہوئے خوب صورت لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی نظریں پھر ذوالفقار کی طرف اٹھیں جو یہ صورت حال دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ رئیس شاہنواز سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکی کوئی دوسری نہیں بلکہ اس کی بہو پارس ہے۔

وہ لپک کر کھڑا ہو گیا اور جیب سے پانچ پانچ سو کے دو بڑے نوٹ نکال کر پارس کے ہاتھ پر ایسے رکھے جیسے وہ اپنے ضلع کے افسروں کے بچوں کو خرچی دیتا تھا۔ پھر اس نے پارس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔ ’’بیٹا مجھے اس واقعہ کی خبر نہ تھی ورنہ یہاں اس طرح خالی ہاتھ نہ آتا۔‘‘

پارس نئی دلہن کی طرح شرما کر ناخنوں کو کترنے لگی تو رئیس نے مستقبل میں نظریں گاڑھتے ہوئے کہا۔ ’’بیٹا تو بے شک پارس ہے۔‘‘

پارس ناز و انداز سے اپنی ساڑھی کے پلو کو کبھی گراتی، کبھی سنبھالتی، لہراتی ہوئی سسر کے لیے چائے کا انتظام کرنے چلی گئی تو رئیس نے ذوالفقار کی طرف پیار و محبّت سے دیکھتے ہوئے کہا ’’بیٹا مجھے آج ہی کلکٹر صاحب سے ملوانا۔‘‘

واپسی میں رئیس اور کامدار جب گوٹھ روانہ ہوئے تو کامدار بیگ محمد نے جس نے سارا وقت سرونٹ کوارٹر میں گزارہ تھا اور جو اس سارے قصے سے انجان ہی تھا، رئیس سے پوچھا ’’کیا ہوا سائیں؟؟‘‘

لیکن رئیس نے اس بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا کامدار سے پوچھا:

’’پتا ہے کامدار، میرا سمدھی کون ہے؟‘‘

’’نہیں سائیں، مجھے کیا پتا!‘‘

’’یہاں کا کلکٹر نیاز محمد، سی ایس پی!‘‘

جب تک کامدار بیگ محمد، سی ایس پی کا مطلب سمجھتا اور کوئی اگلی بات کرتا، رئیس نے پھر کہا:

’’اس کے تبادلے کا حکم نکلا ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو تین ماہ میں وہ اپنے ضلع کا چارج سنبھال لے گا۔‘‘

◆◆◆

سفارش

سفارش تلاش کرنے والوں کی ایک قسم اور بھی ہے۔ وہ انتہائی ناجائز کام آپ کے پاس لے کر آئیں گے جس کے کرنے والے کو موقع پر ہتھکڑی لگ جائے اور سفارشی عمر بھر ضمیر کی خلش محسوس کرتا رہے۔ آپ اسے کہیں گے کہ بھئی یہ کام ناجائز ہے یہ نہیں ہو سکتا۔ اس پر عمومی جواب یہ ہوتا ہے کہ جناب اگر جائز کام ہوتا تو مجھے آپ ہی کے پاس آنا تھا؟ اس سے اور کچھ ہو نہ ہو آپ کو یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ شہر میں آپ کی حیثیت کیا ہے؟ ایک گاؤں سے میرے ایک جاننے والے کی وساطت سے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور کہا:

’’ایک چھوٹا سا کام ہے۔ اس کے لیے آپ کے پاس آتے ہوئے شرم آتی تھی لیکن چودھری صاحب نے کہا کہ وہ صرف آپ ہی کو جانتے ہیں۔‘‘

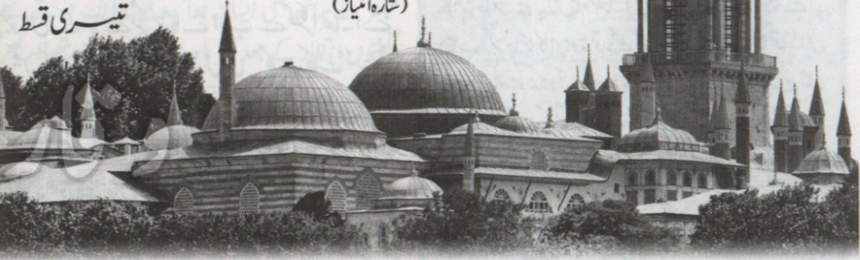
میں نے کہا ’’کوئی بات نہیں آپ کام بتائیں۔‘‘

بولے ’’یہ جو بندہ آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے، اس نے مخالفوں کے تین چار بندے لا دیے ہیں۔ (قتل کر دیے ہیں) اب پولیس اسے گرفتار کرنے کے لیے گھر پر چھاپے مار رہی ہے، گھر میں پردہ دار بیبیاں ہیں۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ آئی جی صاحب کو فون کر کے ذرا ان کی پیٹیاں تو اُتروائیں۔‘‘

جامع سلطان احمد کی شان

ڈاکٹر
آصف محمود جاہ
(ستارہ امتیاز)

تیسری قسط



ترک دارالحکومت، استنبول کے تاریخی و یادگار آثار کی دلچسپ سیر و سیاحت

سلطان احمد کی نیلی مسجد (Blue Masjid) دور ہی سے دکھائی دینے لگی۔ مسجد کے سامنے آتے اس کا رعب اور سحر طاری ہو گیا۔ پرشکوہ عمارت، بلند و بالا مینار اور شان و شوکت دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ مسجد کے سامنے بازنطینی سلطنت کے بلند و لمبے مینار استادہ اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ یہاں کبھی عیسائیوں کی حکومت تھی۔ مسجد کے بارے میں بتایا گیا کہ اس کو معمار سنان نے تعمیر کیا۔

تعمیر کے دوران ایک عیسائی حکمران نے زبردست قسم کا شیشہ بھیجا کہ اس کو محراب میں نصب کر دیں لیکن معمار سنان نے کہا، میں تو اسے توڑ دوں گا۔ سب لوگ پریشان ہو گئے کہ معمار سنان یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اتنی قیمتی اور نایاب چیز کو توڑنے کا کہہ رہا ہے۔ اس کو سب نے روکا۔ بات سلطان احمد تک پہنچی تو اس نے بھی یہ سن کر ناراضی کا اظہار کیا۔ معمار سنان نے کہا، میں اسے اپنے سامنے توڑتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک اس میں کوئی سازش پوشیدہ ہے۔

اللہ نے معمار سنان کو اتنی بصیرت دی ہوئی تھی کہ اس نے بھانپ لیا، عیسائی حکمران نے جو شیشہ بھیجا، اس میں کچھ نہ کچھ سازش ہے۔ سنان نے سلطان سے کہا کہ اگر اس میں کچھ نہ نکلا تو میری گردن حاضر ہے۔ ساتھ ہی توڑا تو اس میں سے صلیب کا نشان نکل آیا۔ سلطان نے معمار سنان کی بصیرت کی داد دی اور صلیب والے نشان کو مسجد کی گزرگاہ پہ لگا دیا تاکہ جو بھی آئے، اس پہ پاؤں رکھ کر مسجد میں داخل ہو۔ یہ نشان آج بھی موجود ہے۔

خوبصورت لمبے میناروں اور ایک جیسے گنبدوں والی خوبصورت اور پرشکوہ مسجد نے ایسا سحر طاری کیا کہ بس اسے دیکھتے جائیں۔ جامع سلطان احمد ۱۶۱۶ء میں مکمل ہوئی۔ اس مسجد کی خاص بات خوبصورت گنبد اور چھ مینار ہیں جبکہ دیگر مساجد کے چار مینار ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بادشاہی مسجد، حال ہی میں بننے والی بحریہ ٹاؤن مسجد لاہور، اسلام آباد کی

الفیصل مسجد بھی اپنی مثال آپ ہیں مگر سلطان احمد کی مسجد کی شان اور عظمت نرالی ہے۔ یہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا نشان ہے۔ ان شاء اللہ ترکی وہ واحد اسلامی ملک ہے جہاں سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہونا ہے۔

سلطنت عثمانیہ پورے یورپ کے اکثر ممالک تک پھیلی ہوئی تھی۔ آج بھی مسلمان اکٹھے ہو جائیں اور انھیں کوئی باصلاحیت لیڈر مل جائے تو دنیا میں وہ اپنا لوہا منوا سکتے ہیں۔

اس مسجد کو پتا نہیں ''نیلی مسجد'' کیوں کہتے ہیں۔ حالانکہ کسی جگہ بھی کوئی مینار، گنبد یا عمارت کا کوئی حصہ ''نیلا'' نظر نہیں آتا۔ مسجد میں دنیا بھر کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے سیاحوں کی کثیر تعداد موجود تھی جن میں مرد عورتیں، نوجوان لڑکے لڑکیاں شامل ہیں۔ غیر مسلموں کو ایک حد تک اندر جانے کی اجازت ہے۔ اس کے لیے آپ کا لباس بھی حیادار ہونا چاہیے۔ بعض غیر ملکی خواتین اور لڑکیاں چادر یا دوپٹہ اوڑھے اندر آ کر ایک ایک منظر کی فوٹو کھینچ رہی تھیں۔

سلطان احمد کی خوبصورت، وسیع و عریض، شاندار، صاف ستھری، شیشے کی طرح چمکتی دمکتی، مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا نشان مسجد ترک فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ معمار سنان نے اس مسجد کو بنا کر اپنی صناعی اور کاریگری کی انتہا کر دی۔ آپ مسجد کے اندر جونہی داخل ہوں، ایک تازہ ہوا کا جھونکا آپ کا استقبال کرتا ہے۔ صدر دروازے سے حدِ نگاہ یعنی مسجد کے منبر و محراب تک آپ کی نظر پڑتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسا سحر طاری ہوتا ہے کہ بندہ مبہوت ہو جاتا ہے۔ بس مسجد کو تکتا رہتا ہے۔ اپنے حواس میں آتا ہے تو اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ تب ہر طرف حیرت کا سماں ہوتا ہے۔

استنبول کی چھوٹی بڑی مساجد کے اندر نقش و نگار، قرآنی آیات، اللہ اور محمد ﷺ کے ناموں کی کندہ کاری ملتی ہے۔ میناروں اور گنبدوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام مسجدوں کا طرزِ تعمیر ایک جیسا ہے۔

مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں مسجد حرم، مسجد نبوی اور دو بڑی مساجد خلافت عثمانیہ کے دور میں تعمیر ہوئیں۔ اس وجہ سے طرزِ تعمیر اور انداز ایک جیسا ہے۔ کبھی کبھی مسجد ابوایوب انصاریؓ میں بیٹھے ہوئے مسجد نبوی کا گمان ہوتا ہے۔ سلطان احمد کی مسجد کے سامنے آیا صوفیہ کی خوبصورت اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی عمارت موجود تھی۔ مسجد کے باہر سوونیئرز کی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ باہر ٹیولپس کے خوبصورت پھولوں کی کیاریاں ترتیب سے لگی ہوئی ہیں جن کی تازہ خوشبو سے فضا معطر تھی۔ وقار نے ایک خوبصورت فوارہ بھی دکھایا جسے جرمن حکومت نے ۱۸۰۰ء میں مسجد کے لیے عطیہ دیا تھا۔ وقار نے بتایا کہ آیا صوفیہ دیکھنے کے لیے پورا دن چاہیے۔

شام کے متاثرین کی خدمت:

عصر کی نماز مسجد سلطان احمد میں ادا کی۔ نماز کے بعد بلدیہ ٹاؤن کے ایک علاقے میں گئے جہاں شام کے متاثرین جمع تھے۔ شام کی عفت مآب بیبیاں، خوبصورت بچے، بچیاں اور مرد ہمارے انتظار میں تھے۔ بلدیہ کے ناظم نے سب کے ناموں کی فہرست بنائی ہوئی تھی۔ الحمدللہ غذاؤں کے پیکٹ کل ہی بن چکے تھے۔ اس علاقے میں رہنے والے زیادہ مہاجرین کا تعلق حلب سے ہے۔ کسی کا بھائی شہید ہو گیا کسی کا خاوند۔ کسی کا بیٹا اور کسی کے ماں باپ۔ عباؤں اور سکارف میں ملبوس خواتین اور بچے آتے گئے اور بڑی محبت سے لڑکیوں اور خواتین کو اسماء اور مردوں کو وقار، عثمان اور راقم راشن کے پیکٹ دیتے رہے۔ خواتین اور مرد پیکٹ لے کر جزاک اللہ کہتے مسکراتے چہروں کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔

ھدیۃ من الباکستان (پاکستان کے تحائف) سن کر خوش ہوتے۔ ان کے اداس چہروں پہ مسکراہٹ دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اتنی دور دراز آ کر ان لوگوں کی خدمت کی توفیق دی۔ ماؤں کے ساتھ گول مٹول سرخ چہرے والے بچے بچیاں بھی تھے جن کو دیکھ کر اسماء نے ان میں نقد رقم بھی تقسیم

کی۔ شامی متاثرین کو بتایا کہ انشاء اللہ بہت جلد ان کے لیے رمضان راشن پیکیج بھی بھجوایا جائے گا۔ ان شامی بہن بھائیوں کی مدد اور ان کے چہروں پہ خفیف سی مسکراہٹ دیکھ کر دلی اطمینان ہوا۔ اللہ ہمارے مخیر حضرات کو جزائے خیر دے جن کی وجہ سے ادھر آنا ممکن ہوا۔

ترک پٹھان وقار بادشاہ:

وقار بادشاہ ایک عجیب سرپھرا دیوانہ ہے۔ وہ ترکی کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ۲۶ سال کی عمر میں بابوں کے ساتھ پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ ترکی زبان ایسے فر فر بولتا ہے جیسے پشتو بول رہا ہو۔ قد کاٹھ اور خدوخال سے ترک باشندہ لگتا ہے۔ ترک اس سے ہمیشہ اپنی زبان میں بات کرتے ہیں۔ ناواقف ترک کو گمان ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی غیر ملکی سے بات کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو وقار بادشاہ ترک پٹھان ہے۔

شادی کا پوچھا تو وقار نے بتایا کہ اس نے رومانیہ کی ایک خاتون کو مسلمان کر کے نکاح کیا ہے۔ ترکی کا ہمارا یہ دورہ بھی وقار کا مرہون منت ہے کیونکہ ساری کوآرڈی نیشن اور رابطے اس کے ذمے ہیں۔ مسجد کا دورہ ختم کر کے شام کے وقت وقار کی یونیورسٹی (Istanbal Zaim University) کے کیمپس پہنچے جہاں یونیورسٹی کے ریکٹر پروفیسر ڈاکٹر محمد بلند سے ملاقات ہوئی۔

یونیورسٹی ریکٹر سے ملاقات:

وقار کی یونیورسٹی کے ریکٹر بہت عالم، فاضل، تاریخ دان اور محقق ہیں۔ معاشیات ان کا شعبہ ہے۔ بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ خلافت عثمانیہ کے مالی نظام ونسق اور اس کی کامیابی کے بارے میں انہوں نے کافی ریسرچ کی ہے اور اس پر کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔ پروفیسر صاحب بڑی محبت سے ملے۔ ترکی کے لوگوں کا یہ کمال ہے کہ بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملتے ہیں۔ گال سے گال لگاتے ہیں۔ ریکٹر صاحب کو اپنی انگریزی کتاب (Journey Towards Allah) پیش کی جو انہوں نے خوشی سے قبول کی۔

رات نو بجے وقار کے ایک دوست محمد بلال تشریف لائے جو تیس سال تک جرمنی میں رہ رہے ہیں۔ جرمن زبان روانی سے بولتے ہیں مگر انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے۔ ایسے موقعوں پر وقار ہمارا ترجمان ہوتا ہے۔ وقار ہر جگہ ترجمانی کے فرائض بخیر وخوبی انجام دیتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ دنیا میں جن جن قوموں نے ترقی کی ہے' انہوں نے اپنی زبان کو اپنا کر اس میں تعلیم حاصل کر کے ترقی پائی۔

مسجد ابوایوب انصاریؓ میں فجر کی نماز:

صبح چار بجے آنکھ کھل گئی۔ وضو وغیرہ کر کے ایک دفعہ پھر مسجد حضرت ابوایوب انصاریؓ کا رخ کیا۔ سامنے شاخ زریں کے اوپر رنگ برنگے برقی قمقموں سے روشن استنبول شہر چمکتا دمکتا نظر آ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ رنگ ونور کا سیلاب آیا ہو۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی ہے۔ آج تھوڑی بہت سردی محسوس ہوئی ورنہ دن بھر دھوپ کی وجہ سے موسم گرم ہو جاتا ہے۔ شہر خموشاں سے گذرتے ہوئے تاریخی قبروں کو دیکھتے ہوئے ذہن میں خیالات آئے کہ انسان جو بھی کر لے' جتنی حیثیت حاصل کر لے' جتنے سال جی لے' حکمرانی کر لے آخر اس نے خاک آسودہ ہونا ہے۔ بڑے بڑے ناموں کے نشان مٹ جاتے ہیں۔ سب ٹاٹھ رہ جاتا ہے جب لاد چلے بنجارہ......

اس علاقے میں رہتے ہوئے پتا چلتا ہے کہ استنبول اور ترکی کے لوگ صحابی رسول اور میزبان رسول اللہﷺ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے کتنی عقیدت رکھتے ہیں۔ شہر کے اردگرد سڑکوں، دکانوں، قبرستان، سٹورز اور مختلف مارکیٹوں کے نام آپؓ کے نام سے منسوب ہیں۔ شہر کا نام بھی ایوب سلطان ٹاؤن ہے۔

مسجد کے اندر و باہر ہزاروں لوگ موجود ہیں۔ اگرچہ ابھی صبح کاذب ہے۔ سب نمازیوں کے چہرے دمک رہے ہیں۔ وہ یہاں آ کر سکون اور عافیت محسوس کر رہے ہیں۔ ایسے

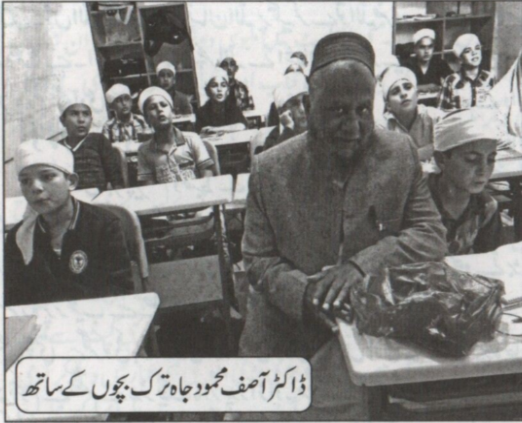
لگ رہا ہے کہ وہ ساری رات انتظار کرتے رہے کہ صبح سویرے یہاں حاضری ہوگی اور اب وہ یہاں اللہ کے حضور حاضر ہو کر خوش ہیں۔ نماز فجر میں امام صاحب رقت آمیز انداز سے تلاوت کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ ان کی قرأت اتنی اچھی ہے کہ کبھی کبھی گمان ہونے لگتا ہے کہ مسجد حرام یا مسجد نبوی میں نماز ادا کر رہے ہیں۔ کل جمعہ کے دن بھی مسجد میں بھرپور ہجوم تھا۔ نماز کے بعد سارے لوگ احترام وعقیدت کے ساتھ بیٹھے رہتے ہیں۔ قرآنی دعائیں، سورہ فاتحہ، سورہ اخلاص پڑھی جاتی ہیں۔ امام صاحب باآواز بلند دعائیں پڑھتے ہیں۔ سب خشوع وخضوع سے دعا مانگتے اور باآواز بلند آمین کہتے ہیں۔

دعا سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو یہ دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی کہ نمازیوں کی کثیر تعداد نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ بچوں سے لے کر پچیس تیس سال کے لڑکے اور لڑکیاں نماز کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ترکی کے لوگ اسلام سے بہت محبت کرتے ہیں۔ لڑکیاں حجاب اور سکارف پہنے مسجد میں آئی ہوئی تھیں۔

اگرچہ یہاں مغرب زدہ خواتین لڑکے اور لڑکیاں بھی نظر آتی ہیں جن کے لباس دیکھ کر شرم آتی ہے۔ مگر سڑکوں، بازاروں میں کسی قسم کی کوئی بے حیائی نہیں۔ خواتین اور لڑکیوں کی ایک کثیر تعداد عباؤں اور سکارف میں ملبوس نظر آتی ہے۔ صدر طیب اردگان کی اہلیہ محترمہ کے سکارف اوڑھنے کی وجہ سے لڑکیوں اور عورتوں میں ان کا اسٹائل مقبول ہے۔

شامی مہاجرین کے لیے مخیر حضرات کا تعاون:

شامی مہاجرین کی مدد کے لیے کئی مخیر حضرات نے تعاون کیا۔ اچھی خاصی رقم جمع ہوگئی۔ سب سے پہلے اعجاز سکا صاحب نے پہل کی۔ بلکہ اس سفر کے لیے تیار کرنے والے



ڈاکٹر آصف محمود جاہ ترک بچوں کے ساتھ

بھی وہی ہیں۔ خرم سکا صاحب بڑی رقم دے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اس کا زیادہ حصہ فیصل آباد کے شاہد سکا نے دیا ہے۔ کراچی سے شیخ غلام احمد بمبل، سعودی عرب سے ڈاکٹر سونیا سکندر، راولپنڈی سے راجہ طارق، نئی امید کی اشرف النساء، روبینہ اختر، ارم ناصر اور عظمیٰ عاقب، محبوب شاہ اور کئی دوسرے لوگوں نے عطیات بھجوائے۔ ترکی میں جب پیسے ختم ہو گئے تو اسلامک سنٹر کی آپا رضیہ مدنی' لاہور کے افتخار بشیر اور ہمارے دیرینہ ساتھی اور خیر کے کاموں میں ہمیشہ تعاون کرنے والے سید محبوب علی نے عطیات بھجوائے جو اشفاق نے فوراً وقار بادشاہ کے اکاؤنٹ میں منتقل کیے۔ مدینہ سے آتے ہوئے میاں ثناء اللہ نے ۵۰۰۰ ریال تھما دیے۔

آصف سعید نے لاکھوں روپے کا سامان لے کر دیا۔ نئی امید والوں نے بھی خوبصورت گفٹ بھجوائے۔ ساری رقم کل آتے ہی حیرہ فاؤنڈیشن والوں کے حوالے کر دی تا کہ کم از کم دو ہزار خاندانوں کے لیے مہینے بھر کے راشن پیکٹ بنوا لیں۔ اسماء نے دیکھ بھال کے راشن کی ساری چیزیں لکھوا دی تھیں۔ ان شاء اللہ کل عرفہ متاثرین کے کیمپوں میں جانا ہے۔ جتنے پیسے تھے' سب خرچ ہو گئے۔ اب گزارے کے لیے کچھ بھی

نہیں۔ بس اللہ پر تکیہ ہے۔ انسان اللہ پر تکیہ کرے تو اللہ ضرور مدد کرتا ہے۔ اللہ پہ تکیہ کیا تو پھر اللہ نے اشفاق کے ذریعے مزید رقم بھجوا دی۔

ڈسپلن اور فیملی سسٹم:

ترکی میں ہر چیز نظم و ضبط کے ساتھ چلتی ہے۔ شہروں میں ترتیب اور نظم و ضبط نظر آتا ہے۔ گاڑیاں، کاریں، بسیں، ٹرین، ہوائی اور بحری جہاز ایک خاص نظام کے ساتھ وقت مقررہ پر ترتیب سے چلتے ہیں۔ میٹرو بھی چل رہی ہے۔ ٹرام بھی چلتی ہے مگر کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا۔ کسی کو کوئی تنگی نہیں ہوتی۔ نہ ہجوم بے ہنگم ہے نہ ٹریفک مادر پدر آزاد۔ سڑکیں اتنی زیادہ کھلی نہیں ہیں پھر بھی ٹریفک جام کم ہی ہوتا ہے۔ ترکی میں خاندانی نظام ابھی تک خاصا مضبوط ہے۔ جدیدیت اور مغربیت کے باوجود خاندان اکٹھے رہتے ہیں۔ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو پسند کر لیں پھر بھی شادی دونوں خاندان کی مرضی سے ہوتی ہے۔ طلاق کی شرح بہت کم ہے۔ پاکستان کی طرح بچوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں، کہیں ایک بچہ ہے کہیں تین چار اور کہیں پانچ چھ اور کہیں آٹھ نو۔

شادی کرنا آسان ہے لیکن طلاق لینا بہت مشکل۔ فیملی جج کی کوشش ہوتی ہے کہ آپس میں صلح و صفائی ہو جائے اس لیے معاملے کو لٹکا دیا جاتا ہے۔ مرد اور عورت کو بار بار موقع دیا جاتا ہے کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔ گھر چلانے کے لیے عورت اور مرد دونوں کو کام کرنا پڑتا ہے۔ پراپرٹی کے ریٹس آسمان سے باتیں کرتے ہیں، اس لیے زیادہ تر لوگ کرایے کے فلیٹس میں رہتے ہیں۔ ترک عورتیں غیر ملکی مردوں سے بھی شادیاں کرتی ہیں مگر اس میں ماں باپ کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ ایسی شادیاں جو کسی غرض کے تحت ہوں، آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن جن جوڑوں میں محبت اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا جذبہ ہو وہ دیر تک چلتی ہیں۔

کئی پاکستانی حضرات نے ترک عورتوں سے شادیاں کی ہیں جو کامیابی سے چل رہی ہیں۔ ماشا اللہ بچے بھی ہیں اور پاکستان بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ترک خواتین سے شادیاں کرنے والے دوستوں نے بتایا کہ اگر شوہر مخلص ہو تو ترک عورت وفادار اور تابع دار رہتی ہے۔

آج آخری دفعہ ترک ریسٹورنٹ میں ناشتہ کیا۔ انواع و اقسام کے تازہ اور رس بھرے پھل، سلاد پنیر کی بارہ قسمیں، چھوٹے بڑے سبز، کالے، پیلے رس بھرے زیتون، پھیکے ترکی کھانے۔ ابلی ہوئی سبزیاں، مربہ جات اور جام، خشک پھل اور میوہ جات، ابلا انڈہ غرض سب کچھ تھا مگر پراٹھوں، سری پائے اور حلوہ پوری جیسی کوئی ڈش ڈھونڈنے سے نہ ملی۔ چاولوں اور سبزیوں کا سوپ پیا۔ ناشتے کا مزا آ گیا۔ دل لگا کر مزے سے ناشتا کیا۔ اسماء نے چیزوں کو سمیٹا کیونکہ صبح سویرے یہاں سے کوچ کرنا تھا۔

توپ کاپی محل عجائب گھر کا دورہ:

آج سب سے پہلے استنبول کے مشہور عجائب گھر، توپ کاپی محل (Topkapi Palace) جانے کا پروگرام تھا۔ صاف ستھری شفاف سڑکوں سے گزرتے ہوئے منزل کی طرف بڑھے۔ بڑے بڑے سلاطین کی آماجگاہ یہ عظیم الشان محل اب ان کی عظمت رفتہ کے آثار محفوظ کیے ہوئے ہے۔ انسان چاہے بادشاہ ہو یا گدا جو انسانوں کی فلاح کے لیے صدقہ جاریہ والے کام کر جائیں، صرف ان کا نام باقی رہتا ہے۔ میوزیم کے اندر جانے کے لیے طویل راستہ ہے جس کے ایک طرف ٹکٹ والی کھڑکیاں ہیں۔ تمام کھڑکیوں کے باہر لمبی لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ میرے ساتھی، شکیل نے بھی ایک قطار میں گھس کر ٹکٹ لیے۔

مشین سے ٹکٹ مس کر تلاشی دیتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اندر حیرت کا ایک سماں تھا۔ بڑی بڑی پرشکوہ عمارتیں باہیں کھولے ہماری منتظر تھیں۔ عجائب گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہم واقعی سلاطین کے دور

میں واپس آ گئے ہیں۔ بڑے بڑے وسیع و عریض ہالوں میں جہاں کسی دور میں کسی چڑیا کو بھی پر مارنے کی ہمت نہ تھی اور سلطانوں کے دربار میں حاضری کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا، وہاں اب شہر خموشاں کی سی خامشی ہے۔ صرف سیاحوں کے چلنے، سرگوشیاں کرنے کی آوازیں اور محافظ کی آنکھ سے بچ کر تصویریں اتارنے والے کیمروں کی ٹک ٹک سکوت توڑتی ہے۔

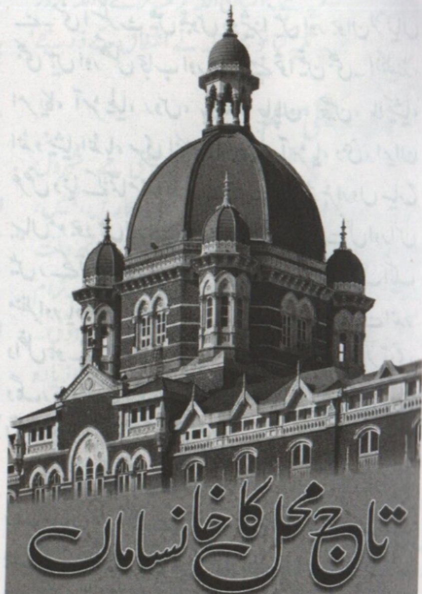
توپ کاپی محل میں خلافت عثمانیہ کے سلاطین کے زیر استعمال کمرے، بیڈ روم، باورچی خانے، کانفرنس روم، کھانا پکانے کے بڑے بڑے برتن آتش دان، چولہے، سونے چاندی کے برتن، سلاطین کے دیوان خاص اور بہت سی دوسری اشیاء موجود تھیں۔ ایک کمرے میں بڑے بڑے کڑاھے رکھے ہوئے تھے جہاں شاہی طبیب سلاطین کے لیے مختلف قسم کی جڑی بوٹیوں سے ادویات اور کشتہ جات بناتے تھے تاکہ وہ صحت مند اور توانا رہ کر بخیر و خوبی امور سلطنت انجام دیتے رہیں۔ اس سلسلے میں مختلف جڑی بوٹیوں میں افیم ملا کر خاص فرحت بخش شربت تیار کیا جاتا جسے سلاطین اور امرا ہر سال کو جشن نوروز کے دوران نوش فرماتے اور اس سے قوت اور توانائی حاصل کرتے۔

پوری دنیا سے آئے ہوئے سیاحوں کی ایک کثیر تعداد عجائب گھر میں موجود تھی۔ ایک ایک منظر کی تصویر کشی جاری ہے۔ اندر نوادرات اور دوسری چیزوں کی تصاویر اتارنے کی اجازت نہیں، ہر حصے میں محافظ کھڑے سیاحوں کو تصویر لینے سے منع کرتے ہیں۔ مگر سر پھرے دیوانے سیاح آنکھ بچا کر اپنے کیمروں اور موبائلوں کو اوپر نیچے کر کے اپنی پسند کی تصاویر بنا لیتے ہیں۔ محافظ ان کو جانچ لیتے ہیں لیکن کچھ نہیں کہتے کہ آخر مہمان ہیں اور جن کی عزت اور تکریم ترکوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔

میوزیم کے اندر یورپی اور اسلامی کلچر کا حسین امتزاج ہے۔ منی اسکرٹ میں ملبوس دوشیزائیں اور جوان لڑکیاں بھی ہیں اور مکمل حجاب اور عبایا پہنے خواتین بھی۔ انگلینڈ، امریکا، آسٹریلیا، روس، ہالینڈ، جاپان، چین، ملائیشیا، انڈونیشیا، انڈیا، سری لنکا، مالدیپ، آسٹریا، دبئی، ایران غرض دنیا کے تمام ممالک سے آئے ہوئے ہزاروں سیاح یہاں موجود ہیں اور اپنے اپنے انوکھے انداز سے محل اور اس میں رکھے نوادرات کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ ایک ایک منظر اور یادگار کی منظر کشی کر رہے ہیں۔ جونہی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہیں تو بڑی بڑی، اونچی لمبی عمارتیں دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ آج سے ۵۰۰، ۱۰۰۰ سال پہلے کس طرح اتنی بڑی بڑی عمارتیں بنائی گئیں۔

ان تمام عمارتوں کی تعمیر میں معمار سنان کی کاریگری کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ معمار سنان اپنی مثال آپ تھا۔ جب تک یہ عمارتیں باقی ہیں، معمار سنان کا نام باقی رہے گا۔ عجائب گھر کے ایک ایک حصے میں اتنے تاریخی نوادرات ہیں کہ ان کو دیکھتے دیکھتے پورا دن گزر جاتا ہے۔ شروع سے آخر تک سلاطین عثمانیہ کے مختلف آثار یوں محفوظ ہیں کہ انسان ان میں کھو کر اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ تب وہ سلاطین کے دور میں پہنچ جاتا ہے جب خلافت عثمانیہ کا سکہ پورے یورپ پہ چلتا تھا۔ سلاطین کے تخت، کانفرنس روم، لباس، کھانے پینے پکانے کے برتن اور ان کے زیر استعمال اشیاء سب یہاں موجود ہیں۔

توپ کاپی محل کا جب بھی تذکرہ سنا تو اسے دیکھنے کی تڑپ دل میں اس لیے مچلتی تھی کہ وہاں انبیاء کرامؑ، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے دور کے تبرکات موجود ہیں۔ نام سنتے ہی دل میں خواہش جنم لیتی کہ جب بھی ترکی جانے کا موقع ملا تو توپ کاپی ضرور جانا اور وہاں تمام بزرگ ہستیوں کے تبرکات دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو طراوت پہنچانی ہے۔



عرش سے فرش پہ آگرنے والے ایک تیموری شہزادے کی عبرت ناک سرگزشت

بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں مہاراجا بھاؤنگر ٹھہرے ہوئے تھے۔ برسات کا موسم تھا۔ سمندر میں صبح شام طوفان برپا رہتا تھا اور پانی کی آوازوں سے مسافروں کو قریب کی بات سننی بھی دشوار تھی۔

تاج محل ہوٹل میں ایک خانساماں سترّ اسّی برس کی عمر کا نوکر تھا جو اپنے کام میں بہت ہوشیار اور تجربہ کار مانا جاتا تھا۔ ہوٹل والے اپنے بڑھیا مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے اسی خانساماں کو مقرر کرتے تھے۔ اس خانساماں کا نام قسمت بیگ تھا۔ اس کی دیانت داری بھی شہرۂ آفاق تھی۔ جب سے ہوٹل میں نوکر ہوا تھا بار ہا ہوٹل کے منیجر کو اس کی امانت و دیانت کے تجربے ہوئے تھے اور وہ ہوٹل کے سب نوکروں سے زیادہ اسی خانساماں پر اعتماد کرتے تھے۔

ایک دن صبح کے وقت مہاراجا بھاؤنگر نے پلنگ پر لیٹے لیٹے قسمت بیگ سے کہا ”میں نے بمبئی کے چند مہمانوں کو ظہرانے (لنچ) کی دعوت دی ہے، منیجر سے کہہ دینا کہ دس مہمانوں کا انتظام کر دے“۔

سمندر کے پانی کا غل، برسات کا زمانہ، مہاراجا بھاؤنگر کی دھیمی آواز، اور بہرہ خانساماں، یہ حکم کیونکر اُس کے کانوں تک پہنچتا۔ مگر قسمت بیگ کی تمیز داری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے بہرہ پن کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ ہونٹوں کی حرکت سے مطلب سمجھ لیتا۔ بہرے آدمیوں کی طرح کان جھکا کر بات نہ سنتا تھا۔ آج ایسے اسباب جمع ہوئے کہ قسمت بیگ مہاراجا کے حکم کو نہ سمجھا اور اُس نے ذرا پلنگ کے قریب آکر نہایت تہذیب اور ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر سوال کیا ”جو ارشاد ہوا ہے اُس کی تعمیل کی جائے گی لیکن اگر تکلیف نہ ہو تو تھوڑی سی تفصیل اور فرما دی جائے“۔

مہاراجا بھاؤنگر بالکل نہیں سمجھے کہ خانساماں نے ان کی بات نہیں سنی تھی۔ انہوں نے خانساماں سے دوبارہ کہا ”جن دس آدمیوں کو بلایا ہے وہ اعلیٰ درجے کے لوگ ہیں۔ ظہرانے کا اہتمام اعلیٰ قسم کا ہونا چاہیے“۔ قسمت بیگ نے بات سمجھ لی اور ادب سے کہا ”جو حکم...... فرمان کی پوری طرح تعمیل کی جائے گی“ اور یہ کہہ کر بڑی تمیز داری کے ساتھ پچھلے قدم چل کر سامنے سے ہٹ گیا۔

مہاراجا بھاؤنگر دیر تک سوچتے رہے کہ مغربی ہوٹلوں میں سب خانساماں انگریزی ادب آداب استعمال کرتے ہیں۔ یہ بڈھا کون ہے جو پرانے زمانے کے مشرقی ادب آداب کو استعمال کرتا ہے۔ اس کا حال معلوم کرنا چاہیے۔ انہوں نے

فوراً بٹن دبایا اور کمرے کا خدمت گار حاضر ہو گیا۔ مہاراج نے حکم دیا ” آج جب ہم ظہرانے سے فارغ ہوں تو ملاقات کے کمرے میں قسمت بیگ خانساماں کو بلایا جائے۔ ہم اس سے کچھ نجی باتیں کرنا چاہتے ہیں“۔

خدمت گار نے کہا ”حضور وہ بہت بدمزاج آدمی ہے صاحب لوگوں سے ہمیشہ لڑتا رہتا ہے۔ آپ اس سے نجی بات کریں گے تو وہ آپ سے بھی گستاخی سے پیش آئے گا۔ وہ نوکری کے وقت تو بہت اچھا ہے اور صاحب لوگ اُس کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن نجی اوقات میں وہ بہت بدمزاج ہو جاتا ہے“۔ مہاراج نے پوچھا ”ایسا کیوں ہے؟“

خدمت گار نے جواب دیا ”حضور وہ کہتا ہے میں ہندوستان کا بادشاہ ہوں۔ صاحب لوگوں کا خیال ہے اس کے دماغ میں کچھ خرابی ہے“۔

یہ سُن کر مہاراجا کو بہت تعجّب ہوا اور وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے خدمت گار سے کہا ” کچھ پروا نہیں، قسمت بیگ سے کہہ دو کہ وہ ظہرانے کے بعد نجی باتوں کے لیے ہمارے پاس آئے“۔

خدمت گار نے انگریزی سلام کیا اور انگریزی طریقہ سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

مہاراجا بھاؤنگر، ٹائمز آف انڈیا، بمبئی کرانیکل اور سانجھور تمان کے ایڈیٹر اور چند ہندو و پارسی عمائدِ بمبئی دوپہر کا کھانا کھا کر باتوں کے کمرے میں آئے تو مہاراج نے قسمت بیگ کو بلایا۔ وہ نہایت ادب سے حاضر ہوا، اُس نے ہندوستانی طریقہ کے موافق مہاراج کو تین فرشی سلام کیے اور ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ مہاراج نے کہا ”قسمت بیگ! تم کون ہو؟“ قسمت بیگ دانستہ مہاراج کی کرسی کے قریب کھڑا ہوا تھا تا کہ اس کے بہرے پن کا عیب چھپا رہے اور وہ مہاراج کی بات سُن سکے۔

مہاراج کا سوال سُن کر قسمت بیگ نے کہا۔ ”حضور گستاخی معاف اس کا جواب تو آپ کو بھی معلوم نہیں کہ ہم سب کون ہیں اور کیوں اس دنیا میں پیدا کیے گئے۔ ہم کو بھُوک، پیاس، نیند، بچپن، جوانی، بڑھاپا، تندرستی بیماری کے انقلابات میں کس غرض سے مبتلا کیا گیا“۔

قسمت بیگ کی یہ عجیب تقریر سن کر سب حاضرین مبہوت ہو گئے اور حیرت سے دیکھنے لگے کہ ایک خانساماں یہ کیسی فلسفیانہ باتیں کر رہا ہے۔ مہاراج نے مسکرا کر کہا ”بے شک ہمیں اس سوال کا جواب معلوم نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم نے زندگی کی ان مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ تم نے ایک سانس میں سب بڑے بڑے انقلابات کا ذکر کر دیا۔ اس واسطے میرا خیال ہے کہ تم میرے سوال کا جواب دے سکتے ہو۔“

قسمت بیگ نے کہا: ”حضور میں ایک آدمی ہوں۔ نسل کے لحاظ سے تیموری مغل، پیشے کے لحاظ سے تاج محل ہوٹل کا خانساماں، عمر کے لحاظ سے بڈھا ہوں۔ طبیعت کے اعتبار سے کبھی بچہ ہوتا ہوں اور کبھی جوان۔ اخلاقی حیثیت میری ایک کامل انسان کی ہے۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا۔ ظلم اور بے رحمی سے بچتا ہوں۔ خدمتِ خلق کو اپنا مقصدِ زندگی مانتا ہوں۔ اگرچہ گدا ہوں لیکن دل کے تخت پر شہنشاہ ہوں۔ کچھ اور ارشاد ہو تو اس کا جواب بھی دوں“۔

قسمت بیگ کی موثر، مسلسل اور برجستہ تقریر کا ایک دوسرا اثر پیدا ہوا۔ مہاراج اپنے مہمانوں سمیت پُوری طرح اُس کی طرف متوجہ ہو گئے اور بے اختیار مہاراج کی زبان سے نکلا ”کیا تم تیموری شہزادے ہو؟“ قسمت بیگ کو جوش آ گیا اور اُس نے کہا ”شاہ زادہ نہیں آہ زادہ ہوں۔ دنیا کی مصیبتوں کی سب زدیں میں نے اٹھائی ہیں۔ تیموری خاندان تو اب مٹ چکا جس نے باوجود انسان ہونے کے دوسرے انسانوں کو غلام بنانے کی کوشش کی تھی اور غلام بنا لیا۔ آپ نہیں تو آپ کے باپ دادا بھی اس کے غلام تھے۔ یہ سوال فضول ہے اور آپ

کے لیے تکلیف دہ۔ میں اس سوال کی کشمکش میں پڑنا اپنے دل کے لیے ایک آری سمجھتا ہوں جو میرا دل چیر رہی ہے‘‘۔

یہ فقرہ سُن کر مہاراج نے سر جھکا لیا اور سب لوگ بھی خاموش ہو کر زمین کی طرف دیکھنے لگے۔

آخر کچھ دیر بعد خود قسمت بیگ نے کہا ’’انسان کو اپنی موجودہ حیثیت دیکھنی چاہیے۔ آج چونکہ میں ایک خانساماں ہوں اس لیے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ حضور میری زندگی کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں جو ماضی پر فخر کریں یا افسوس کریں۔ میں اُن لوگوں میں سے بھی نہیں، جو مستقبل کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں۔ حضور میں ماضی کا مالک ہوں، حال کا مالک اور مستقبل کا بھی مالک ہوں۔ یہ آسمان بھی میرا، زمین بھی میری اور یہ سمندر بھی میرا ہے۔ آپ سب لوگ جو کرسیوں پر میرے سامنے بیٹھے ہیں، آپ بھی میرے ہیں اور میں خود جو آپ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں محسوس کرتا ہوں کہ یہ وجود بھی میرا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بھی میرے سوا اور کسی کی نہیں۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دوسرا کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ میں ہی ہوں، میں ہی تھا، میں ہی آخر تک رہوں گا۔ یہ سمندر ابل رہا ہے، بل کھا رہا ہے، جوش میں آ رہا ہے۔ برسات ختم ہو گی، سردی آئے گی، ٹھنڈ ہو جائے گی۔ تالاب بن جائے گا۔ اس کے اندر طوفان بھی میں ہی ہوں اور اس کی ٹھنڈک بھی میں ہی ہوں‘‘۔

قسمت بیگ کی مجذوبانہ تقریر سنتے سنتے مہاراج کو ہنسی آ گئی۔ انہوں نے ہنسی کو ضبط کیا اور کہا ’’شاہزادہ صاحب کیا آپ میرا حکم مانیں گے اور سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کی تکلیف گوارا کریں گے‘‘۔

قسمت بیگ نے کہا ’’ہرگز نہیں۔ کالج میں استاد کھڑا رہتا ہے اور شاگرد بیٹھے رہتے ہیں۔ تم سب شاگرد ہو اور میں استاد۔ تم سب انجان ہو اور میں دانا۔ تم سب بے خبر اور میں خبردار۔ تم سب غافل ہو اور میں ہوشیار۔ تم سب ادنیٰ ہو اور میں اعلیٰ۔ تم سب بڑے ہو اور میں چھوٹا۔ تم سب امیر ہو اور میں غریب۔ تم سب فانی ہو اور میں باقی۔ تم سب پانی ہو اور میں بلبلا۔ تم سب خاک ہو اور میں ہوا۔ تم سب ایندھن ہو اور میں آگ۔ تم سب تاریکی ہو اور میں روشنی۔

یہ کہتے کہتے قسمت بیگ نے اپنی دونوں مونچھوں کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے پکڑا اور ان کو مروڑنا شروع کیا۔ وہ اچھلتا جاتا اور کہتا جاتا، میں ہوں میں ہوں۔ تم نہیں ہو۔ جو کچھ ہے، جو کچھ ہو، کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں ہے۔ میں ہوں، میں ہوں میں۔ پھر سنو پھر کہوں، میں ہوں، میں ہوں میں‘‘۔

مہاراج اور حاضرین کے جسموں میں رعشہ پڑ گیا۔ ان سب پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ قسمت بیگ کی دیوانہ وار باتوں اور اچھل کود سے غیر معمولی اثر ہوا۔

کچھ دیر بعد قسمت بیگ مہاراج کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا اور اُس نے نہایت ناتواں آواز میں کہا ’’حضور سواری چلی گئی۔ میں ایک مرکب تھا اور سوار میرا اور تھا۔ میں ایک ہوٹل تھا اور مہمان کوئی اور تھا۔ میں ایک بوتل تھا اور شراب کوئی اور تھی۔ اب مجھ بیمار لاچار خانساماں کی کہانی سنیے۔

’’میں بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ میری ماں لونڈی تھی اور بادشاہ کی معتوب۔ جب غدر ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوا تو میری عمر دس سال تھی۔ بادشاہ نے گھبراہٹ کے وقت اپنے بیوی بچوں کا انتظام بہت ادھورا کیا تھا۔ اُس وقت میرا اور میری ماں کا شاید ان کو خیال بھی نہ آیا ہو گا کیونکہ میری ماں لال قلعہ کے باہر خاص بازار میں ایک مکان میں رہتی تھیں۔ مکان شاہی تھا، پہرہ دار اور نوکر بھی بادشاہ کی طرف سے تھے۔ خرچ بھی ملتا تھا مگر بادشاہ میری پیدائش سے پہلے میری ماں سے خفا ہو گئے تھے۔ انہوں نے کبھی میری صُورت نہیں دیکھی نہ میری ماں کو قلعہ میں بلایا۔

’’جب دہلی کے سب باشندے بھاگے اور انگریز کشمیری دروازے کے راستے شہر میں داخل ہوئے تو میری ماں نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور پیدل گھر سے روانہ ہوئیں۔ نوکر پہلے ہی سے بھاگ گئے تھے۔ سواری کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میری والدہ نے سو اشرفیاں اپنے ساتھ لیں اور کوئی سامان نہ لیا۔ دہلی سے نکل کر ہم دونوں قدم شریف کی درگاہ میں گئے جو دہلی کی فصیل سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔ مگر یہ راستہ بھی ہمیں کئی کوس کا معلوم ہوا کیونکہ نہ مجھے پیدل چلنے کی عادت تھی نہ میری ماں کو۔ مجھے یاد ہے دہلی کے باشندے ایسی گھبراہٹ میں جا رہے تھے گویا قیامت آ چکی اور سب نفسی نفسی کہتے ہوئے اللہ کے پاس جا رہے ہیں۔ عورتیں کپڑوں کی بقچیاں سروں پر رکھے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھ پکڑے چل رہی تھیں۔ بچے رو رہے تھے۔ وہ اُن کو کھینچتی تھیں اور بچے چل نہ سکتے تھے۔ مردوں کا بھی یہی حال تھا۔ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہ تھا سب اپنی مصیبت میں مبتلا تھے۔

’’قدم شریف پہنچ کر ہم ایک مکان میں بیٹھ گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ رات ہوئی تو مجھے بھُوک لگی مگر وہاں کچھ کھانے کو نہ تھا۔ میری ماں نے مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور تسلّی دلاسے کی باتیں کرنے لگیں۔ شہر سے بندوقوں کی آوازیں اور شہر والوں کا شور و غُل سُن کر میں گھبرایا جاتا تھا۔ والدہ بھی سہمی بیٹھی تھیں۔ یہاں تک کہ میں اسی بھوک کی حالت میں سو گیا۔

’’صبح انگریز فوج کے سپاہی قدم شریف آئے اور انہوں نے لوگوں کو پکڑنا شروع کیا۔ میری ماں کو بھی گرفتار کر لیا۔ ایک پوربیہ ہندو اُن کو اپنے ساتھ پہاڑی پر لے گیا جو قدم شریف سے کئی میل دور تھی۔ ہم دونوں جب پہاڑی پر پہنچے تو ہمارے پاؤں خونم خون ہو چکے تھے۔ شام کو ہمیں انگریز افسر کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے میری ماں سے کچھ سوالات کیے۔ مجھے یاد نہیں انگریز نے کیا کہا اور میری ماں نے کیا جواب دیا۔ اتنا یاد ہے کہ انگریز کو میری ماں نے بتا دیا کہ وہ بادشاہ کی لونڈی ہے اور بچہ بادشاہ کا بیٹا ہے۔ انگریز نے حکم دیا کہ ان دونوں کو آرام سے رکھا جائے۔ آرام یہ تھا کہ ہم کو ایک چھوٹا سا خیمہ دے دیا گیا جس میں ہم رات دن پڑے رہتے۔ دو وقت کھانا ہمیں مل جاتا تھا۔

’’جب دہلی میں انگریزی انتظام قائم ہو گیا تو ہم دونوں کو چاندنی محل میں جو جامع مسجد کے قریب ایک محلّہ تھا، بھجوا دیا گیا، جہاں ہمارے خاندان کے اور لوگ بھی آباد ہو گئے تھے۔ میری والدہ کے نام دس روپے ماہوار گزارے کے مقرر کر دیے گئے۔ میں نے اپنی والدہ کے ساتھ بچپن سے جوانی تک جیسی جیسی مصیبتیں اٹھائیں، بس میرا ہی دل جانتا ہے۔

’’چاندنی محل کے قریب ایک خانقاہ تھی۔ میں وہاں اکثر جایا کرتا تھا۔ خانقاہ میں ایک درویش رہتے تھے، اُن کی باتیں سنتا اور اُن کا مجھ پر بہت اثر ہوتا۔ انہی کی باتوں سے مجھے اپنی اور کائنات کی ہر چیز کی حقیقت کا علم ہوا۔ اور اس وقت جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں، یہ بھی انہی کی صحبت کا اثر ہے۔

’’والدہ نے خاندان ہی کے اندر میری شادی بھی کر دی۔ اولاد ہوئی مگر وہ زندہ نہیں رہی۔ میں نے دہلی ہی میں ایک خانساماں کی شاگردی اختیار کی اور یہ کام سیکھا جو اَب کر رہا ہوں۔ جب والدہ اور بیوی کا انتقال ہو گیا تو میں دہلی سے بمبئی چلا آیا۔ یہاں مختلف لوگوں کی نوکریاں کیں۔ ہوٹلوں میں بھی رہا اور اب مدت سے تاج محل ہوٹل میں ہوں۔

’’بچپن سے میرے ایک کان میں کچھ خرابی ہو گئی جو آج تک باقی ہے۔ مگر میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی میرے بہرے پن کو سمجھ نہ سکے کیونکہ مجھے اس عیب سے بہت شرم آتی ہے‘‘۔

یہ کیفیت سُن کر مہاراج نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہا ’’قسمت بیگ نام کس نے رکھا؟‘‘

خانساماں نے کہا ’’میری قسمت نے۔ ورنہ میری ماں نے تو میرا نام تیمور شاہ رکھا تھا۔ مگر میں جب دہلی سے بمبئی آیا تو ہر شخص کو میں نے اپنا نام قسمت بیگ بتایا۔

مہاراج نے کہا ’’چلو میں تم کو بھاؤنگر لے چلوں۔ جو تنخواہ یہاں ملتی ہے، اس سے دگنی تنخواہ دوں گا اور فقط تمہاری باتیں سنا کروں گا، کوئی کام نہیں لوں گا‘‘۔

یہ بات سن کر قسمت بیگ نے جھُک کر تین فرشی سلام مہاراج کو کیے پھر کہا ’’یہ عین بندہ نوازی ہے لیکن جس نے اس

دنیا کے انقلاب کو سمجھ لیا، وہ قناعت کے دروازے پر بیٹھ جاتا اور کہتا ہے کہ ایک دروازے کو پکڑو اور مضبوط پکڑو۔ دربدر بھٹکتا نہ پھر۔ اس ہوٹل میں میری عزت ہے اور مزاج داری بھی ہے۔ صاحب لوگ بھی میری بدمزاجیوں کو برداشت کر لیتے ہیں۔ ضرورت کے موافق ہر چیز موجود ہے۔ آپ ہی فرمائیے، میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کیوں کروں اور یہ جگہ چھوڑ کر جہاں کوئی تکلیف نہیں ہے آپ کے ہاں کیوں آؤں؟"

مہاراج نے آفرین کہی اور ایک ہزار روپے کا چیک لکھ کر دیا اور کہا کہ اس کو اپنے خرچ میں لانا۔ آئندہ بھی ہر سال ہوٹل کے منیجر کی معرفت ہزار روپے تم کو مل جایا کریں گے۔ قسمت بیگ نے پھر سلام کیا۔ چیک لے کر رونے لگا اور پچھلے قدم ہٹ کر باہر چلا گیا۔

معلوم نہیں اُسے رونا کیوں آیا اور اُسے کیا بات یاد آگئی۔

عرب کی قربانی

جب عربوں کا جھنڈا اُندلس کی سرزمین پر لہرا رہا تھا' ہسپانیہ کے ایک بہادر سے ایک عرب نوجوان کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ اتفاق کی بات ہسپانوی بہادر کا داؤ چل گیا اور عرب نوجوان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

اب ہسپانوی (اُندلسی) بہادر کو ہراس پیدا ہوا کہ انجام قتل کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایک عرب کا خون بالا بالا نہیں جاسکتا۔ یہ سوچ کر وہ بھاگ کھڑا ہوا' حالانکہ دہشت اور خوف کے مارے اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ پھر جدھر منہ اٹھا وہ افتاں و خیزاں چل نکلا۔ آخر بھاگتے بھاگتے وہ ایک باغ کے دروازے پر پہنچا اور بغیر کچھ سوچے سمجھے اندر داخل ہوگیا۔ دیکھتا کیا ہے' ایک بوڑھا عرب جس کے چہرے پر رُعب و جلال آشکارا تھا، بیٹھا ہوا ہے۔ ہسپانوی شخص جاتے ہی اس کے قدموں پر گر پڑا اور کہا: "میں نے ایک عرب نوجوان کا خون کیا ہے۔ میں آپ کے دامن میں پناہ لینے کے لیے آیا ہوں۔"

بوڑھے عرب سے اس کی سراسیمگی اور دہشت کا منظر دیکھا نہ گیا۔ اس نے کہا: "تم بالکل نہ ڈرو' میں تمھیں پناہ دیتا ہوں۔"

پھر بوڑھے عرب نے ہسپانوی نوجوان کو باغ کے ایک گوشے میں ایک کمرے کے اندر پہنچا کر کہا: "تم یہاں بالکل بےفکر ہو کر آرام کرو۔ یہاں تمھارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کوئی تم تک نہیں پہنچ سکتا۔"

وہ ہسپانوی مطمئن ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہسپانوی نے شوروغل کی آواز سنی۔ دیکھتا کیا ہے کچھ لوگ ایک نوجوان مقتول کی لاش لیے آ رہے تھے۔ بوڑھے عرب نے یہ لاش دیکھی اور چیخ پڑا: "ہائے میرے بیٹے۔"

لوگوں نے بتایا' اُسے ایک ہسپانوی نوجوان نے قتل کیا ہے' جو قتل کرتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی تلاش کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ کسی طرح سے دستیاب نہ ہوسکا۔ پھر چند لوگوں نے بوڑھے عرب سے کہا: "ہم قاتل کا سراغ لگا کر رہیں گے اور اس سے ضرور انتقام لیں گے۔" ہسپانوی یہ سُن کر بیدِ لرزاں کی طرح کانپنے لگا۔ اب بوڑھے کو اصل حقیقت معلوم ہوئی اور وہ سمجھ گیا، اس کے بیٹے کا قاتل یہی ہسپانوی نوجوان ہے۔ یہ سوچ کر اس کا خون کھولنے لگا لیکن اس نے اپنے دل کو سنبھالا۔ جب آدھی رات گزر گئی اور سب لوگ سو گئے تو وہ ہسپانوی نوجوان کے کمرے میں داخل ہوا جس کی مارے دہشت اور خوف کے جان پر بنی ہوئی تھی۔ موت اس کو سامنے نظر آ رہی تھی لیکن بوڑھے عرب نے اس کا خوف دور کیا اور اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا:

"تم میری پناہ میں ہو' میں نے تمھیں امن دیا ہے۔ اگرچہ تم میرے بیٹے کے قاتل ہو لیکن میں عہد نہیں توڑوں گا۔ موقع سے فائدہ اٹھاؤ' رات کی اس تاریکی اور خاموشی میں چپکے سے نکل جاؤ۔ میں تم سے انتقام لینا نہیں چاہتا۔ اپنا معاملہ اللہ کو سونپتا ہوں۔" یہ کہہ کر بوڑھے نے ہسپانوی نوجوان کو کچھ زادِ راہ بھی دیا اور کہا: "جاؤ چلے جاؤ۔"

یہ سُنتے ہی وہ نوجوان چلا گیا۔

شام

کے جنوبی حصوں کے حُسن، وہاں مختلف النوع تہذیبوں کے عروج زوال کی کہانیاں اور اُن کی گم شدہ باقیات کے حُسن و جمال اور انوکھے پن کے قصوں کے تذکرے ایک دو سے نہیں بہتوں سے سنے۔ احمد فاضل کا کہنا تھا کہ سیریا جنوب کے بغیر ادھورا ہے۔ حتیٰ کہ مونا عمیدی نے بھی کہا:

"شام کے جنوب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق کو دیکھے بغیر نہ جانا۔"

"بہت اچھی طرح سے لے کر جاؤں گا۔ تھوڑے وقت میں زیادہ کچھ دکھاؤں گا اور بتاؤں گا بھی بہت کچھ۔ آپ کو تو میرا اچھا بھلا اندازہ ہو ہی گیا ہے۔ مگر میرا خیال رکھنا ہے۔"

ہم چاروں ہنس پڑے۔

"تو پہلے نہیں رکھتے کیا؟" فاطمہ تنک کر یوں بولی کہ کسی اور کے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔



پس تو پھر لازم ٹھہرا کہ علی سے بات کی جائے اور اس کا تو وہ حال کہ جسے کہیں "چور نالوں پنڈ کالی"۔ اب زینبیہ کے ٹیکسی والوں سے بھی خاصا یارانہ ہوگیا تھا۔ پر ابوالعباس بڑا بیبا اور محبّت والا ہونے کے ساتھ ساتھ دل کا بھی بڑا اچھا تھا۔ ڈنڈی مارنے کی قطعی کوشش نہ کرتا۔ دانت نکالتے اور ہنسی آنکھوں میں بھرتے آیا اور جنوب جانے کا سن کر بولا:

پہلی بات یہ بڑی اہم ہے کہ بُصریٰ (Bosra) رومن صوبے کا دارالخلافہ ہی نہ تھا بلکہ مکہ جانے اور آنے والے تجارتی قافلوں کا بھی یہ پڑاؤ تھا۔ مکے کے نام میں جو روحانی کشش ہے وہی شوق کو مہمیز کرنے کو کافی تھی۔ مگر معلوم ہوا تھا کہ اِس بُصریٰ کے ساتھ تو اور بھی بہت سی دل کو چھونے والی کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی جب عباس نے یونانی،

رومن اور نباتین (Nabatean) زمانوں کے گرجا گھروں، محلوں، گاؤں، قصبوں اور شہروں کا تذکرہ شروع کیا تو سکینہ دفعتاً بول اُٹھی:

"ارے ہاں ہاں مجھے یاد آیا ہے، میں نے اِن کی بابت اپنے اسکول کے زمانے میں تاریخ کی کتاب میں پڑھا تھا۔ یاد آرہا ہے۔"

میں نے حیرت سے فاطمہ کو دیکھا۔ ہم نے اپنے اسکول کی کسی تاریخ جغرافیہ کی کتاب میں یہ حال احوال نہیں پڑھا تھا۔ یہ کس اسکول کی پڑھی ہوئی ہے؟ فاطمہ کو میری آنکھوں میں جو نظر آیا تھا، اس نے اُسے فوراً وضاحتی بیان جاری کرنے کے لیے کہا تھا۔ یوں ماننا پڑا کہ فاطمہ سرگودھا کونونٹ کی سینئر کیمرج پاس تھی۔ اس نے یقیناً پڑھا ہوگا۔ ہم ٹٹ پونجیئے ٹاٹ اسکولوں کے بچوں کو اُن کے محدود اور رَٹے والے نصاب اتنا علم کیسے دیں، سوچنے کی بات تو تھی۔

تاہم سوچنے کا تو وقت ہی نہیں تھا کہ گاڑی خان دانون (Khan Dannoun) نامی ایک مستطیل صورت کی دو منزلہ عمارت کے سامنے رُک گئی۔ پرانے وقتوں کی سرائے اپنے کشادہ صحن، خوبصورت برآمدوں، کیاریوں میں اُگے پھول پیڑوں اور اپنے قدیمی تاریخی حُسن کے ساتھ سامنے


باسل الاسد مسجد، الیپو

تھی۔ کیسی ظرف والی عمارت تھی کہ یہاں پورے کے پورے کاروان مع ان کے مال واسباب، گھوڑوں، گدھوں اور خچروں سمیت اس میں سما جاتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ کا زمانہ، سراؤں کا کلچر اپنے عین عروج پر۔ تاجروں کے قافلے اور اُن میں قیام کی حسین شامیں اور راتوں کے پہلے اور دوسرے پہروں کا حسن اور بانکپن۔

تصور کی آنکھیں دیکھتی تھیں وہ منظر جب اِن کشادہ آنگنوں میں آلاؤ جلتے۔ سازندوں کی ٹولیاں سازوں سے کھیلتیں اور مغنی کی آواز کہ جیسے شعلہ سا لپک جائے ہے۔ آواز تو دیکھو جیسے محاورے کی عکاس لگتی تھی۔ رقاصاؤں کے پہناوے، ادائیں اور رقص کے انداز برق بن کر مسافروں کے دلوں پر یوں گرتے کہ دل می رود زدستم صاحب دلاں خدارا کسی منچلے کی پکار اس ماحول میں گونج جاتی تھی۔ مرغن کھانے اور جام کے دور، بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ پڑھا ہوا کیا کیا نہ یاد آیا۔

صنمین (Sanamayn) سٹی پر رُک کر عباس نے وہ رومن مندر دکھایا جو ملحدوں کا ضرور تھا لیکن یونانیوں کی قسمت کی دیوی ٹیکا (Tekke) کے نام مخصوص تھا۔ خوبصورت طرز کا تھا۔ طاق دور کی ساخت کمال کی تھی۔ یہاں ہم نے چائے پی۔ بسکٹ کھائے۔ تھوڑا گھومے پھرے۔

تھوڑا آگے بازنطینی دور کی چند اور یادگاریں شیخ مسکن (Miskin) اور ازرا (Izraa) دیکھنے کو ملے۔ جورجیس (Georgius) کا چرچ دیکھا۔ یہ یادگاریں اس وقت کی ہیں جب شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو اپنایا تھا۔ شام کا سب سے قدیم گرجا گھر، کہیں بڑے اور کہیں چھوٹے چھوٹے پتھروں کی دیواروں والا صلیب کے نشانوں سے سجے اُس کے طاق ودر کے ماتھے نامانوس سی تحریروں کی ماتھا پٹیوں سے سجے بہت اچھے لگے تھے۔

عباس نے لمبا چوڑا لیکچر دینا چاہا۔ میں نے روکا اور کہا "عباس تم نے اچھا کیا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واقع یہ یادگاریں ہمیں دکھا دیں۔ کچھ بتا بھی دیا۔ مگر اب آگے بڑھو۔ وقت کم اور چیزیں بہت ہیں۔"

تاریخ کا یہ ورثہ یہ خزانہ ایک دوسرے سے قریب قریب واقع ہیں۔ درمیان میں کہیں چھ، کہیں بارہ اور کہیں سولہ کلومیٹر حائل ہیں۔ گھنٹے آدھ گھنٹے بعد گاڑی سے اُترنا، گھومنا پھرنا ہمیں بھی لطف دے رہا تھا۔

درعا (Dara) سرسبز شاداب ہرے بھرے کھیتوں کے سلسلوں سے نہال، جا بجا انگوروں کی بیلوں سے لدا نظر آیا۔ پرانا نام تو حوران (Hawran) تھا۔ شدید موسمی شدتوں کا شکار علاقہ مگر قدرت نے بھی نوازنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کہ اناج کا گھر بنا پایا ہوا ہے۔ صدیوں پہلے بھی اور آج بھی۔ تب یہ روم کی روٹی کی ٹوکری تھا اور آج شام کا اناج گھر۔ جسے اللہ یہ سعادت بخشے۔

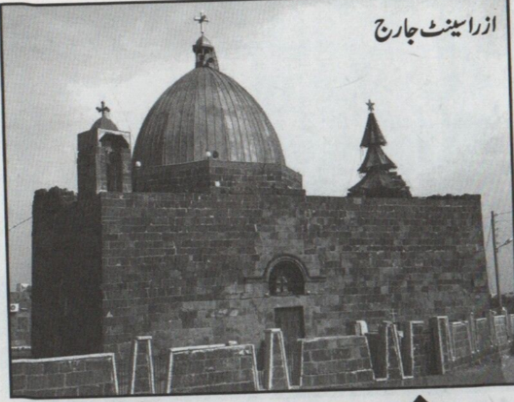
پتا چلا تھا کہ یادگاریں تو بے شمار تھیں۔ پر قدرت کے بے رحم عناصر کہیں زلزلے، کہیں مہیب آندھیاں، کہیں آگ، کہیں جنگیں سبھوں نے اس کی یادگاریں مٹانے میں اہم کردار ادا کیے۔ بہرحال مکہ کو جانے والی ایک تنگ سی پٹڑی دیکھ کر ضرور آنکھیں ٹھنڈی کیں کہ یہی الحجاز ریلوے تھا جس سے بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی میں حجاج کے قافلے سفر کرتے تھے۔ جس کا تیا پانچہ کرنے میں لارنس آف عریبیا نے مرکزی کردار ادا کیا۔ درعا بہت خوبصورت شہر ہے۔ ہم نے اس کے پرفضا ماحول میں واقع ریستوران پر گاڑی رُکوا کر چائے پی، سنیکس کھائے اور عباس سے جانا کہ ایسی خوبصورت سرسبز جگہوں کو عربی میں غوطے کہتے ہیں۔ درعا اُردن کا ہمسایہ ہے۔ چھلانگ مارو اور اُردن پہنچ جاؤ۔ جی تو چاہا مگر مسئلہ وہی کاغذ نہیں تھے پاس۔

یہ مارچ ۲۰۱۱ء کے دن تھے جب اخبار کی ایک چھوٹی سی خبر نے متوجہ کیا۔ شام کے جنوبی شہر درعا میں احتجاج..... احتجاجیوں پر فائرنگ۔ میں نے احمد فاضل کو میل بھیجی۔ میں نے لکھا تھا:

"احمد، یہ مارچ کے خوبصورت نشیلے سے دن ہیں۔ کھلے کھلے روشن روشن سے۔ گلاب کے پھولوں اور چنبیلی کی کلیوں میں مہکتے ہوئے، بچپن، جوانی اور اُدھیڑ عمری کے اِن دنوں کی جاذبیت اور حسن کی کیا مداح سرائی کروں کہ جب دلوں میں امنگیں اور ولولے انگڑائیاں لیتے تھے۔ میرا ملک امن وسکون کے ہنڈولے میں جھولے لیتا تھا۔ مگر اب بہار کی رعنائیاں خون کے پانیوں میں تیرتے ہوئے آتی ہیں۔ دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا رہتا ہے، کب کہیں سے کوئی تڑپا دینے والی خبر آجائے۔ چلو ہم تو اِس عذاب سے گزر رہے تھے مگر تمہارے ہاں کیا بات ہوئی؟

احمد مجھے لکھو اس خبر نے مجھے بے کل کر دیا ہے۔ میں تو اِن دنوں ذہنی طور پر سیریا میں رہتی ہوں۔ لکھ رہی ہوں نا اس پر۔ مجھے تمہاری میل کا شدت سے انتظار رہے گا۔"

اور درعا کے دلکش نظاروں کی آب وتاب پر اُس وقت خون کے چھینٹوں کا چھڑکاؤ ہو گیا جب احمد فاضل کی ای میل مجھے ملی۔ اس نے لکھا تھا: آپ وہاں گئی تھیں۔ درعا کتنی


ازرا سینٹ جارج

خوصورت جگہ تھی۔ اُن باغ بہار جگہوں جہاں چنبیلی کی خوشبوئیں ہر سو بکھری رہتی تھیں جہاں آبشاریں ماحول کا حُسن بڑھاتی تھیں۔ جہاں پہاڑ، میدان سبزہ، درخت لہلہاتی فصلیں اور توانا خوبصورت لوگ بھرپور زندگی کا احساس دلاتے تھے۔ وہاں آگ بھڑک اٹھی ہے۔ شعلوں نے قیامت برپا کردی ہے۔ بندوق کی گولیوں نے زندگی ارزاں کردی ہے۔ کیا تھا؟ اسکول کے نوخیز، جوشیلے بچوں کا احتجاج۔ ان کے باغیانہ اور حکومت سے نفرت و بیزاری کا اسکول کی دیواروں پر اظہار۔ اپنے اور اپنے والدین کے مسائل اور مشکلات کا ذکر۔

میں نے تفکّر سے یہ سب پڑھا تھا اور تب کیا پل کے لیے نہیں سوچا تھا کہ یہ آگ پورے ملک کو لپیٹ میں لے لے گی، یوں کہ تاریخ کی ہڈیوں جوڑوں میں اُترا ہوا ملک خوفناک اور لرزا دینے والے منظروں کی زد میں ہوگا۔

میں نے دھیرے سے آنسوؤں کو صاف کیا اور ماضی کے اُس خوبصورت دن کے ان خوبصورت لمحوں میں لوٹ گئی ہوں جب میں درعا میں تھی۔ لوگ میری بصارتوں میں چلے آئے تھے۔ ان کی آوازیں میری سماعتوں میں گونجنے لگی تھیں۔

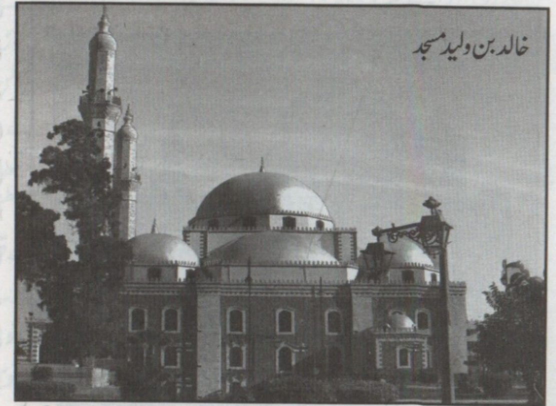
مزے کی بات یہ کہ جتنے لوگوں سے باتیں ہوئیں سب تعلیم یافتہ، بیدار مغز اور سیاسی شعور سے بہرور نظر آئے۔ یہ سب عباس کے جاننے والے تھے۔ مدھم لہجے میں ذرا دبے دبے انداز میں بات کرتے تھے۔ اکثریت بشار کے آمرانہ اقدام کو پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک اُدھیڑ عمر مرد نے قدرے تلخی سے کہا تھا:

''دراصل جمہوریت کسی بھی ملک کا حُسن ہے۔ یہاں پہلے باپ نے ہمیں غلام بنائے رکھا۔ اب بیٹا ہمارے سروں پر سوار ہوگیا ہے۔ ایسا کب تک چلے گا؟ وہی ان کے عزیز رشتہ دار چہیتے، ملک کے وسائل لوٹ رہے ہیں۔''

ایک نوجوان لڑکے کی بات کتنی خوبصورت تھی۔ ہم لوگ ان کے چہرے دیکھ دیکھ کر تنگ آگئے ہیں۔ کائنات کی ہر شے تبدیلی کی مظہر ہے۔ انسان اپنے روزمرہ معمولات میں یکسانیت کو پسند نہیں کرتا۔ ہم نئے لوگ، نئے چہرے، نئے خیالات اور نئی تبدیلیوں کے خواہاں ہیں۔ میں نے پیار بھری نظروں سے لڑکے کو دیکھا تھا۔ اور خود سے کہا تھا:

''سیریا کا مستقبل یہی تو ہیں۔''

احمد فاضل کی ای میلوں نے جو تصویریں کھینچی تھیں، وہ تڑپاتی تھیں۔ ہائے تب کاش کچھ جان لیتی۔ کاش چھ سال بعد کے آنے والے واقعات کی کوئی ایک چھوٹی سی جھلک ہی دیکھ لیتی۔ شاید پھر میں البنین ہائی اسکول کی عمارت کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ اُن بیرونی دیواروں کو دیکھتی جہاں بچوں کی چھوٹی سی شرارتیں اِس چھ سالہ جنگ کا پیش خیمہ بن گئیں۔ جس میں تین لاکھ افراد ہلاک ہوگئے اور دو کروڑ دس لاکھ آبادی والے ملک کا تقریباً چوتھائی حصہ دربدری کی بھینٹ چڑھ گیا۔


خالد بن ولید مسجد

☆☆☆☆☆

معاویہ صیاصنہ فروری کی خوشگوار خنکی لیے اُس صبح بیدار ہوا تھا تو اس کے اندر کہیں کوئی اضطراب یا کوئی بے چینی نہ تھی۔ آنے والے منحوس واقعات کے سائے کا کوئی ہلکا سا عکس بھی چہرے پر سایہ فگن نہ تھا۔ چودہ سالہ لڑکے نے سپرے کی نئی بوتل اپنی الماری سے نکال کر بیگ میں ڈالی۔ آج کلاس کے لڑکوں کا پروگرام یہ کھیل کھیلنے کا تھا۔

گزشتہ کچھ عرصے سے اسکول اسمبلی میں جب بھی اُن سے بعث حکومت کے حق میں نعرے لگوائے جاتے وہ چند دوست شرارتاً اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیتے۔ بشار اور اس کے باپ کے بڑے بڑے پوسٹر فریڈم سکوائر میں ٹنگے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ مگر چپکے چپکے اشاروں کنائیوں میں۔ اپنے بڑوں کی طرح انہیں بھی پتا تھا کہ خفیہ کے لوگ بہت متحرک ہیں اور کون ان کا بندہ ہے، کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ گزشتہ کچھ عرصے سے مصر اور تیونس میں ہونے والے ہنگامے ٹی وی پر دیکھتے تھے۔ دل میں اپنے ہاں بھی انقلاب کی آرزو پالتے اور امید کرتے تھے کہ کچھ ایسی ہی بیداری کی لہر شام میں بھی آئے گی۔

معاویہ پڑھنے میں تیز ذہین بچہ تھا۔ اسکول کی چھٹی ہونے کے بعد اُس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسکول کی دیواروں پر سیاہ رنگ سے یہ الفاظ سپرے کرتے ہوئے لکھے:

''اے ڈاکٹر (بشار) اب تمہارے جانے کی باری ہے۔'' اپنے ایک انٹرویو میں اُس نے کہا:

''اس وقت جب ہم قہقہے لگاتے اور ہنستے تھے۔ ہم نے کیا ایک لمحے کے لیے یہ سوچا تھا کہ ہم کتنی بڑی جنگ کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ کاش ہمیں اس کا تھوڑا سا بھی ادراک ہو جاتا تو یقیناً ہم کبھی ایسی حرکت نہ کرتے۔''

رات کو گھر کے دروازے بجے تھے۔ معاویہ کے والد آرکیٹکچرل انجینئر تھے۔ انہوں نے پولیس کے لوگوں کو معذرت خواہانہ انداز میں بتایا کہ انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تین دن بعد خفیہ ایجنسی کے لوگ اُسے سوتے ہوئے کو اٹھا کر لے گئے۔ دمشق میں بدنام زمانہ دہشت ناک سیل میں اُسے رکھا گیا جہاں تاروں سے مارا جاتا۔ یخ پانی میں بٹھایا جاتا۔ بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے، کلائیوں سے سیل کی چھت سے لٹکایا جاتا۔ حتیٰ کہ معصوم چودہ سالہ بچے نے اپنے ساتھیوں کے نام اُگل دیے۔

ان بچوں کو بھی اسی طرح اٹھا کر ایسی ہی سختیوں سے گزارا گیا۔ درعا کے لوگوں کے احتجاج اور مظاہروں نے شدت اختیار کی۔ فوج آئی اور مظاہرین پر گولی چلائے بغیر واپس چلی گئی۔ فوج کے آنے اور مظاہرین پر گولی چلانے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ کرنل عفیف برنجی جیپ سے اُترا۔ شہر سے باہر کھلے میدان میں لوگوں کا ایک جم غفیر جمع نعرے لگاتا اور للکارتا تھا۔

اُس نے پل بھر کے لیے سوچا، انہیں دیکھا اور خود سے کہا۔ ''وردیوں میں جو لوگ گاڑیوں سے اُترے ہیں وہ کون ہیں؟ سب شامی، اسی دھرتی اور اسی مٹی کے بیٹے اور اس کے رکھوالے۔ اور جن پر گولیاں چلانے کے لیے آئے ہیں اُن کا جرم کیا ہے؟ اور وہ کون ہیں؟'' اندر نے جواب دیا تھا:

''وہ تو بچے تھے جنہوں نے اسکول کی دیواروں پر سپرے کا کھیل کھیلتے کھیلتے بشار کو جانے، ہمیں جمہوریت چاہیے، ملک کو انقلاب کی ضرورت ہے جیسے نعرے لکھ دیے تھے۔ وہی تو


خوبصورت شہر اجڑنے سے پہلے اور بعد میں

اِس گلستان کے پھول ہیں ۔ اس ملک کا سرمایہ ہیں۔ اثاثہ ہیں۔اس کے نونہال ہیں۔ یہ اُن کے بچوں جیسے ہی تو ہیں۔''

کرنل برنجی بخوبی جانتے تھے کہ ان کے ساتھ ٹارچر سیلوں میں کیا کچھ ہوا تھا۔ اِس خیال نے سوچوں پر غلبہ پالیا تھا کہ اگران کے بچوں کے ساتھ ایسا ہوتا؟ تب کرنل برزنجی کی یادداشتوں کی سطح آب پر روس میں اپنے ایک فوجی پیشہ ورانہ تربیتی کورس کے دوران اپنے روسی دوست سے سنا ہوا ایک واقعہ ابھر کر سامنے آیا۔ ستر کی دہائی کے آغاز کا واقعہ جب سوویت کے جنوبی حصّے کے شہر نووچر کاسک کے ایک بہت بڑے کارخانے میں بڑی دھما کا خیز بغاوت ہوئی تھی۔ وجوہ غریب آدمی کی زندگی کو تنگ کرنے کے حربے تھے۔ گھروں کی فراہمی کا تقاضا تھا۔ گوشت، مکّھن کی قیمتوں میں بہت اضافہ کر دیا گیا تھا۔

کام چھوڑ کر چودہ ہزار مزدور باہر نکلے تو شہر کا چوتھائی حصہّ بھی اُن کی حمایت میں ساتھ ہولیا۔ مقامی پولیس کے سپاہی آئے تو اُلٹا انہیں منتشر کرنے اور پکڑ دھکڑ کرنے کے بجائے انہیں ہلاّ شیری دینے، اُن کا حوصلہ بڑھانے اور اُن کی پیٹھ ٹھونکنے میں جُت گئے۔ شہر کی انتظامیہ نے فوج بلا لی۔ اب ایک نیا اور انوکھا تماشا دیکھنے کو ملا۔ ٹرکوں اور جیپوں سے فوجی جوان اور جونیئر افسر چھلانگیں مار کر اُترے اور سیدھے جا کر ہڑتالیوں کے گلے لگے۔ اُن کے منہ ماتھے چومے اور بولے، ڈٹے رہنا۔ اِن حرامزادوں کو مزہ چکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ زاروں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ انہوں نے بندوقیں اٹھائیں۔ فضا میں لہرائیں۔ خالی فائر گئے اور بلند آہنگ نعروں کے ساتھ یکجہتی کا اعلان کرتے ہوئے کہا:

''ارے یہ تو غریبوں کو مار دینا چاہتے ہیں۔''

اب کریملن میں تو بھونچال آگیا۔ تھرتھلی مچ گئی۔ یہ کیا ہو؟ سر جوڑ کر بیٹھے۔ تجویز ہوا کہ پس ماندہ دیہی علاقوں کی فوج بلائی جائے۔ سو کا کیشیائی فوج آئی۔

یہاں کس قدر حیرت انگیز بات ہوئی کہ فوج کے سینئر افسر کو جب گولی چلانے کا حکم ملا تو وہ اپنی جیپ سے اُترا۔ اُس نے فوج کے سامنے اونچی آواز میں جیسے للکار کر کہا:

''میں اِن غریب نہتّے لوگوں پر گولی چلاؤں، کیسے ممکن ہے؟ یہ تو سچے کھرے لوگ ہیں۔ محلوں میں رہنے والے اُن سے ان کے نوالے چھین لینا چاہتے ہیں۔ حق سچ کا ساتھ دینا میرا پہلا فرض ہے۔ رہی یہ جان تو اِس جان کی اوقات ہی کیا ہے؟'' اُس کے ساتھ ہی اُس نے خود کو گولی مار لی۔

کرنل عفیف کے لیے یہ بڑا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گولی کن پر چلائیں گے؟ اپنے لوگوں پر اپنے بچوں پر؟ یہ درعا کے بچے نہیں ہمارے ہیں۔''

انہوں نے گولی چلانے اور انہیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا اور یہ انکار ہی عذاب بن گیا۔ کچھ ایسے ہی واقعات حما، لاطاکیہ اور بنی یاس وغیرہ کے قصبات میں پیش آئے۔

بس تو یہ فیصلہ اسی دن اور اسی وقت ہو گیا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا ہے؟ جیپوں کے رخ مڑے اور پورا دستہ فری سیرین آرمی میں شامل ہونے چلا گیا اور یہی فیصلہ معاویہ کا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اُس نے بھی بندوق ہاتھ میں تھام لی۔ وہ بتاتا ہے: ''ایف ایس اے میں ہی اسنائپر کی گولی میری ٹانگ میں لگی۔ جس سے ٹانگ میں لنگ پڑ گیا۔ سچی بات ہے اتنی تباہی کے باوجود اسد حکومت ابھی بھی قائم ہے۔''

اِس جنگ نے کتنے تحفے کتنی سوغاتیں بخشیں۔ شام کا خوبصورت چہرہ گہنا گیا۔ بستے رستے لوگ اُجڑ گئے۔ دربدری مقدر بن گئی۔ رشتے فنا ہو گئے۔ آنسو گالوں پر مسلسل بہنے اور آنکھیں گیلی رہنے لگیں۔ نئے مذہبی جنوبی گروہ کھمبیوں کی طرح اُگ آئے جنہوں نے دہشت کا بازار گرم کر دیا۔ کاش میں جانتا ہوتا کہ میری یہ چھوٹی سی شرارت کتنی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہو گی تو کیا میں ایسا کرتا......؟



خونی شرط

خوفناک لت کا نشانہ بنے ایک شاطر بوڑھے کی داستانِ عجب

سمرسٹ ماہم

شام کے چھ بج رہے تھے۔ میں شام کی سنہری دھوپ سینکتے ہوئے لطف لینا چاہتا تھا۔ چناں چہ میں نے ہوٹل کی لابی سے کافی کا پیالہ لیا اور تیراکی کے تالاب کی جانب بڑھ گیا۔

سوئمنگ پول کے چاروں طرف بہت سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے، غسل والے ملبوسات پہنے نوجوان مرد و زن، جا بجا بیٹھے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تالاب میں بھی تقریباً تین چار عدد لڑکیاں اور کوئی درجن بھر لڑکے غُسل میں مصروف تھے۔ پانی میں گیند کے کھیل کے دوران، اُن کے حلق سے نکلنے والی آوازوں اور قہقہوں کا مِلا جُلا شور تمام فضا میں رچا بسا تھا۔ لڑکیاں غالباً انگریز اور سب کی سب ہوٹل ہی میں قیام پذیر تھیں۔ البتہ لڑکے مجھے اجنبی سے لگ رہے تھے۔ میرے خیال میں وہ امریکی ہی تھے۔ آج ہی صبح بندرگاہ پر امریکی بحریہ کا ایک جہاز لنگر انداز ہوا تھا۔ ممکن تھا یہ لڑکے اُسی جہاز کے عملے سے متعلّق ہوں۔

میں نے ایک پیلی چھتری تلے پڑی ہوئی چار خالی کرسیوں میں سے ایک سنبھال لی اور وہیں بیٹھ کر کافی پینے لگا۔

مجھے بیٹھے چند ہی لمحے ہوں گے کہ میری نظریں اُس پر جا پڑیں۔ وہ ایک ناٹے قد کا بوڑھا تھا۔ جسم پر سفید رنگ کا ایک بہترین سوٹ تھا اور چال... اُس کی چال نہایت عجیب تھی۔ وہ نہایت تیز رفتاری سے، پول کے کناروں پر چلتا ہوا میری ہی سمت میں چلا آرہا تھا۔ اپنے پنجوں پر تقریباً اُچھلتا ہوا۔ اُس کی نظریں سامنے پڑی ہوئی کرسیوں اور بیٹھے ہوئے لوگوں پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ میرے نزدیک آکر رُک گیا۔ پھر مُسکرانے لگا۔ جواب میں، میں بھی مُسکرا پڑا۔

”معاف کیجئے گا... اگر آپ کہیں تو میں یہاں بیٹھ جاؤں“؟اس نے پوچھا۔

”ضرور بیٹھے“۔میں نے کہا۔

اُس نے جھک کر کرسی پر ایک نظر ڈالی پھر مطمئن سا ہو کر بیٹھ گیا۔ بیٹھ کر اُس نے اطمینان سے اپنی ٹانگیں سامنے پھیلا دیں۔اُس کے جوتوں کے اُوپری حصّے میں بہت سے باریک باریک سُوراخ تھے جنہیں غالباً ہوا کی آمدورفت کے لیے بنایا گیا تھا۔

”کیا خوبصورت شام ہے!!“ اُس نے کہا۔”جمیکا کی تمام شامیں خوبصورت ہوتی ہیں“۔

اُس کے لہجے سے مجھے اندازہ نہ ہوسکا کہ وہ اطالوی ہے یا اسپینی، ویسے وہ مجھے جنوبی امریکا ہی کا باشندہ لگ رہا تھا۔ قریب سے دیکھنے پر وہ اور بھی زیادہ بوڑھا معلوم ہوا۔اُس کی عمر ۶۷ یا ۷۰ سال سے کسی بھی طرح کم نہ رہی ہوگی۔

”بے شک،شام خوبصورت ہے“۔میں نے تائید کی۔

”اور... اور کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ یہ پول میں جو لڑکے نہا رہے ہیں،کون ہیں۔میرا خیال ہے یہ ہوٹل کے نہیں ہیں؟“

”یہ لڑکے... غالباً امریکی ملاح ہیں۔“میں نے اُسے بتایا... ”نیوی کے کیڈٹ“۔

”بیشک یہ امریکی ہوسکتے ہیں۔ان کے علاوہ اِس قدر شوروغل اور کر بھی کون سکتا ہے۔ویسے تم تو امریکی نہیں ہو... کیوں؟“

”نہیں“ میں نے مسکرا کر کہا... میں امریکی نہیں ہوں“۔

اچانک ہی وہ دونوں میرے نزدیک آ کھڑے ہوئے۔ دونوں ہی غالباً تالاب سے فوراً ہی برآمد ہوئے تھے۔مرد کا سارا جسم پانی سے بھیگا ہوا تھا۔لڑکی اُس کے بالکل ہی نزدیک کھڑی تھی۔

”کوئی بیٹھا تو نہیں ہے اِس پر؟“ نوجوانوں نے خالی کرسیوں کی جانب اُنگلی اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں“میں نے جواب دیا۔

”ہم بیٹھ جائیں!“

”ضرور“۔

”شکریہ“ وہ بولا۔وہ اپنے ہاتھوں میں ایک تولیہ دبائے ہوئے تھے۔ بیٹھ کر لڑکے نے تولیہ کھولا۔ اُس میں سے ایک سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔اُس نے سگریٹ لڑکی کی سمت بڑھا دیے۔لڑکی نے انکار میں سر ہلا دیا۔پھر اُس نے ڈبہ میری جانب بڑھایا۔ میں نے ایک سگریٹ نکال کر منہ سے لگایا۔اُس کی پیشکش پر بوڑھے نے کہا:”شکریہ... میں سگار پیتا ہوں“۔اُس نے جیب سے ایک گھڑیال کی شکل کا سگار کیس نکالا۔ پھر سگار کے سرے کو جیب سے نکالی ہوئی قینچی سے کاٹنے لگا۔

”لائیے میں جلا دوں۔“ نوجوان امریکی نے اپنا لائٹر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔یہ اِس ہوا میں کام نہیں کرے گا“۔

”کیوں نہیں... یہ بہت عمدہ جلتا ہے“۔

بوڑھے نے اپنا بغیر جلا سگار منہ سے نکال لیا۔گردن ایک سمت گھماتے ہوئے اُس نے نوجوان کی جانب غور سے دیکھا۔

”تمہیں پورا یقین ہے؟“ آہستہ سے اُس نے پوچھا۔

”بے شک... آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اِسے جلایا ہو اور یہ نہ جلا ہو“۔

بوڑھے کا سر اب بھی ایک جانب جھکا ہوا تھا اور اُس کی نظریں نوجوان کے چہرے سے ایک لمحہ کے لیے نہیں ہٹی تھیں۔”تمہارا مطلب ہے کہ تم اِس لائٹر کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہو۔کیوں یہی مطلب ہے نا تمہارا؟

”بالکل“ نوجوان نے کہا۔اُس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ چہرہ لانبا تھا اور ناک کسی حد تک مڑی ہوئی تھی۔ لائٹر اُس کے داہنے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور انگوٹھا چرخی کو حرکت دینے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

”یہ کبھی دھوکا نہیں دیتا“۔اُس نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

”صرف ایک منٹ“۔سگار کو ہاتھوں میں دبائے دبائے بوڑھے نے اشارا کرتے ہوئے کہا۔”صرف ایک منٹ“ اِس کی آواز نرم لیکن جھنکار سے عاری تھی۔اُس کی نگاہیں اب بھی نوجوان کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

”کوئی چھوٹی موٹی شرط لگانا پسند کرو گے“؟ مُسکراتے ہوئے اُس نے نوجوان سے پوچھا... ”لائٹر کے جلنے نہ جلنے سے متعلق شرط!!“۔

”ہاں میں تیار ہوں“۔

”تم تیار ہو؟“۔

”بالکل... میں شرط کے معاملے میں کبھی پیچھے نہیں ہٹتا“۔

بوڑھے نے ٹھہر کر اپنے سِگار کو گھما کر دیکھا۔اُس کا انداز کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر لڑکے کو اُلجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ساتھ ہی ساتھ غالباً وہ ابھی بہت کچھ اپنے دِل میں چھپائے ہوئے تھا۔

اُس نے سر اُٹھاتے ہوئے،لڑکے کو دیکھ کر آہستہ سے کہا۔”میں خود بھی شرط لگانے میں پیچھے نہیں ہٹا کرتا۔کیوں نہ کوئی بڑی بازی ہو جائے!“۔

”نہیں“لڑکے نے اُسے روکتے ہوئے کہا... ”میں لمبی بازی کا قائل نہیں۔البتہ ایک ڈالر کے بارے میں کیا خیال ہے... یا جو کچھ میرے پاس ہو،غالباً کچھ شلنگ اور!!“

ہاتھ ہلاتے ہوئے بوڑھے نے کہا: ”میں اسے ایک دلچسپ بازی بنانا چاہتا ہوں۔شرط بدلو پھر ہم لوگ وہاں چلیں گے...“ اُس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا... ”میں تمہیں اپنے کمرے میں لے چلوں گا۔ وہاں ہوا نہیں ہوگی۔لیکن مجھے یقین ہے تمہارا لائٹر دس بار جلائے جانے پر ایک نہ ایک بار تمہیں دھوکا ضرور دے جائے گا“۔

”ہرگز نہیں... “لڑکے نے اعتماد سے کہا... ”یہ لائٹر برابر جلے گا“۔

> ”تمہارا مطلب ہے میں تمہارے ساتھ کمرے میں چلوں،دس بار لائٹر جلا کر دکھاؤں۔کامیابی کی صورت میں کار میری اور ناکامی کی صورت میں میری ایک انگلی تمہاری ہوگی۔کیوں یہی شرط ہے نا تمہاری؟“

”اچھی بات ہے... لگا لو شرط۔

”میں تیار ہوں... یہ رہا ڈالر“

”نہیں... ڈالر کی نہیں ہوگی... میں ایک امیر شخص ہوں... اور کھیلوں کا شائق بھی۔اس ہوٹل کے باہر میری کار موجود ہے... کیڈیلاک“۔

”نہیں جی... “لڑکے نے کرسی سے پشت لگا کر ہنستے ہوئے کہا... ”میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے“۔

”پروامت کرو“ بڈھے نے کہا... ”تم دس بار لائٹر جلا دینا... کار تمہاری ہو جائے گی۔تم یقیناً کار حاصل کرنا پسند کرو گے... کیوں؟“

”کیوں نہیں“۔ہنستے ہوئے لڑکے نے کہا۔

”تو پھر ٹھیک۔میری جانب سے کار کو بازی پر لگی سمجھو“۔

”اور میں کیا لگاؤں؟“مسکرا کر لڑکے نے پوچھا۔

بوڑھے نے محتاط انداز سے سگار کو ایک ہاتھ سے

دوسرے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا... ''میں تم سے ایسی کسی چیز کی خواہش نہیں کروں گا جو تمہارے پاس نہ ہو''۔

''پھر!؟''۔

''تم ایسی کسی چیز پر بازی لگانا یقیناً پسند کرو گے جو تمہارے پاس بھی ہو اور ناکامی کی صورت میں تمہیں اُسے کھونے پر زیادہ افسوس بھی نہ ہو۔ کیوں؟''

''بے شک۔ مثلاً......؟

''مثلاً... تمہارے بائیں ہاتھ کی چھنگلی۔

''کیا!!؟'' لڑکے کے ہونٹ ایک دم بھنچ گئے۔

''کیوں نہیں۔ جیت کی صورت میں کار تمہاری ہوگی... ہار کی صورت میں تمہارے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی میری۔''

''مگر تم انگلی... کس طرح لو گے؟''

''میں کاٹ لوں گا''۔

''بے حد عجیب... '' لڑکے نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ ''ڈالر والی بات ہی ٹھیک رہے گی''۔

بوڑھے نے کرسی سے پشت ٹکا کر کاندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا بات ہوئی۔ تم کہتے ہو تمہارا لائٹر تمہیں کبھی دھوکا نہیں دیتا... اور شرط لگانے سے اس قدر خوفزدہ ہو... خیر، چھوڑو بھی''۔

لڑکا چند لمحوں تک خاموش بیٹھا تالاب میں نہانے والوں کو دیکھتا رہا۔ پھر غالباً اُسے یاد آیا کہ اُس نے اپنا سگریٹ ابھی تک نہیں جلایا۔ اُس نے سگریٹ منہ میں دبایا اور لائٹر کے گرد ہاتھوں کا پیالا سا بناتے ہوئے چرخی دبا دی۔ شعلہ سا بھڑکا اور اندر کی بتی جلنے لگی۔

''مجھے بھی دینا''۔ میں نے اُسے اشارے سے کہا۔

''اوہ... '' وہ کرسی سے اُٹھ کر میرے پاس آگیا۔ میری سگریٹ سلگا کر وہ بھی کرسی پر جا بیٹھا۔

''یہاں۔ کیسا وقت گزر رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بے حد اچھا... ''

پھر خاموشی چھا گئی۔ لڑکا غالباً بوڑھے کی مہمل پیشکش پر اندر ہی اندر اُلجھ رہا تھا۔ وہ بہت چپ چپ سا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بوڑھے کے آخری الفاظ سے خاصا گرم ہو چکا۔ کچھ دیر بعد اُس نے اپنی کرسی پر حرکت کی، گردن کھجائی پھر دونوں پیروں پر ہاتھ رکھ کر رانوں پر انگلیوں سے تھاپ دینے لگا۔

''اچھی بات ہے'' آخر کار وہ بول ہی پڑا۔ وہ بوڑھے سے مخاطب تھا۔ ''تمہارا مطلب ہے میں تمہارے ساتھ کمرے میں چلوں، دس بار لائٹر جلا کر دکھاؤں۔ کامیابی کی صورت میں کار میری اور ناکامی کی صورت میں میری ایک انگلی تمہاری ہوگی۔ کیوں یہی شرط ہے نا تمہاری؟''

''بالکل۔ لیکن میرا خیال ہے تم خوفزدہ ہو''۔

''ناکامی کی صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟ کیا مجھے ہاتھ پھیلا کر انگلی کٹوانی ہوگی؟''

''نہیں نہیں۔ یہ تم سے نہ ہو سکے گا۔ میں تمہارے ہاتھ کو میز سے باندھ دوں گا۔ تم لائٹر دوسرے ہاتھ سے جلاؤ گے۔ میں چاقو لیے موجود رہوں گا۔ تمہارے لائٹر نہ جلنے پر میرا چاقو لمحہ بھر میں تمہاری اُنگلی علیحدہ کر دے گا''۔

''کیڈیلاک کون سے سال کی ہے؟''

''بالکل نئی... لیکن میرا خیال ہے تم شرط نہیں لگاؤ گے، امریکی اس معاملے میں ہمیشہ گھبراتے ہیں''۔

لڑکا ایک لمحہ خاموش رہا۔ اُس نے اپنی ساتھی انگریز لڑکی کی جانب دیکھا۔ پھر میری جانب نظریں اُٹھا دیں... ''اچھی بات ہے''۔ اُس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں شرط لگاتا ہوں''۔

''خوب'' بڈھے نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے آپ کو ''ریفری'' بننے سے انکار نہ ہوگا؟'' اس کی آنکھیں پیلی اور بے رنگ سی

تھیں اندر پتلیاں کسی بلی کے دیدوں کی مانند چمک رہی تھیں۔

''مگر... '' میں نے کھنکھارتے ہوئے کہا... ''یہ شرط بے حد عجیب ہے اور میں اسے پسند نہیں کروں گا''۔

''یہ شرط نہایت غلط ہے''۔ انگریز لڑکی نے بھی ناگواری سے کہا۔ اِس دوران وہ پہلی بار بولی تھی...... ''یہ شرط ہے کہ حماقت''۔

''اور... کیا واقعی تم انگلی کاٹ لو گے۔ اگر یہ نوجوان ناکام رہا۔'' میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

''بلاشبہ'' اُس نے کہا۔ ''میں قطعی سنجیدہ ہوں۔ میں ہارا تو اِسے کیڈیلاک بھی ضرور ملے گی۔''

پھر وہ اُٹھ پڑا... ''تم کپڑے پہننا چاہو تو پہن سکتے ہو''۔

''نہیں۔'' لڑکے نے جواباً کہا۔ ''میں اِسی طرح چلوں گا''۔

پھر وہ میری جانب مڑ کر بولا۔ ''مجھے اُمید ہے تمہیں ریفری بننے سے اِنکار نہ ہوگا''۔

''بہتر ہے''۔ میں نے کہا۔ ''میں چلتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بازی کچھ پسند نہیں آئی''۔

''تم بھی چلو'' اُس نے لڑکی سے کہا... ''تم تماشا دیکھنا''۔

بوڑھا ہماری راہنمائی کر رہا تھا۔ باغ کے راستے وہ ہوٹل کی سمت چلنے لگا۔ وہ خاصا پُر جوش سا لگ رہا تھا اور اسی لیے اُس کی چال بھی غالباً غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی۔

''میں اُوپر کے کمرے میں رہتا ہوں''۔ اُس نے کہا۔ ''تم کار دیکھنا چاہو تو دیکھ سکتے ہو''۔

پھر وہ ہمیں اُدھر لے گیا جدھر کاریں کھڑی تھیں۔ ایک سمت ایک پیلے رنگ والی کیڈیلاک کھڑی تھی۔ اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا:

''وہ رہی... کیڈی''۔

''اچھی ہے''۔ لڑکے نے کہا

''ٹھیک ہے۔ اب ہم اوپر چلیں گے۔ دیکھیں تم یہ کار جیت پاتے ہو یا نہیں''۔

ہم اُس کے پیچھے پیچھے کمرے تک جا پہنچے، کمرا سیڑھیاں طے کر کے اُوپر واقع تھا۔ اُس نے کمرے کا قفل کھولا۔ پھر سب یکے بعد دیگرے اندر گھس پڑے۔ یہ دو بستروں والا کمرا تھا۔ ایک بستر پر کسی عورت کا ڈریسنگ گاؤن بھی پڑا ہوا تھا۔

''پہلے'' اُس نے کہا۔ ''ہم پہلے تھوڑا سا مشروب پئیں گے''۔

الماری سے اُس نے کئی گلاس اور بوتل نکال کر سامنے میز پر رکھ دیے۔ پھر گھنٹی بجائی اور گلاسوں میں مشروب انڈیلنے لگا۔ کچھ لمحوں میں دروازے پر دستک ہوئی اور ایک سیاہ فام ملازمہ اندر آ گئی۔

جیب سے ایک نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے بوڑھے نے کہا:

''براہِ کرم میرے لیے ایک کام کرو۔ ہم لوگ یہاں ایک کھیل کھیلنے جا رہے ہیں۔ میں اِس دوران کسی قِسم کی مداخلت پسند نہیں کروں گا... اور... اور تمہیں ایک کام اور کرنا ہوگا۔ تمہیں چند کیلیں، ایک ہتھوڑی اور ایک... گنڈاسا لانا ہوگا۔ گنڈاسا سمجھتی ہو نا؟ وہی جس سے قیمہ کیا جاتا ہے''۔

''گنڈاسا''!! ملازمہ متحیّر ہو کر بولی... ''قیمہ کرنے والا

> ''اُس نے چھ چھ انچ کے فاصلے سے دو جگہوں پر دو کیلیں گاڑیں۔ کیلوں کا سرا اوپر ہی اُبھرا ہوا تھا۔ پھر اُس نے اُنہیں ہلا ہلا کر ان کی مضبوطی کا اندا ہ کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اِس قسم کا کام پہلے بھی کر چکا''

چاقو؟"

"ہاں۔ ہاں۔ وہی۔ ذرا جلدی سے لے آؤ۔ سمجھیں؟!"

"اچھی بات ہے"۔ پھر وہ باہر نکل گئی۔

بوڑھے نے گلاس ہمیں تھما دیے اور اپنے مشروب کی چسکیاں لینے لگا۔ بڈھا اِس معاملے میں خاصا سنجیدہ لگ رہا تھا۔ لیکن اگر نوجوان ہارے گا تو! یقیناً ہمیں اُسی کیڈی میں اُسے ہسپتال لے جانا ہو گا جس کی خاطر اُس نے اپنی انگلی کا خطرہ مول لیا تھا۔ لڑکی اِس دوران برابر نوجوان کے چہرے کی جانب گھور رہی تھی۔

"کیا تم بھی اس معاملے کو حماقت نہیں سمجھ رہے؟" میں نے نوجوان سے پوچھا۔

"کیوں؟ یہ نہایت عمدہ بازی ہو گی" لڑکے نے کہا۔

"مگر میں اِسے بیوقوفی سے کم نہیں سمجھتی"۔ لڑکی نے اُسے جھڑکا... "ذرا سوچو اگر تم ہار گئے تو کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہو گا... بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کٹ بھی گئی تو میرا کیا بگڑ جائے گا۔ آج تک تو میں اِس سے کوئی کام لے نہ سکا۔ اس کی ضرورت بھی کیا ہے... پھر اگر اس کے خطرے پر کیڈیلاک ملے تو کیا کہنے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ بازی بُری نہیں رہے گی"۔

بوڑھا ہولے سے مسکرایا۔ پھر اپنا گلاس دوبارہ بھرنے لگا۔

"کھیل سے پہلے" اُس نے کہا "میں ریفری کو کار کی کنجیاں دے دینا چاہتا ہوں"۔ اُس نے جیب سے کنجیاں نکال کر مجھے دے دیں ... "رہے کاغذات" وہ دوبارہ بولا... "تو وہ کار ہی کے اندر رکھے ہیں"۔

اُسی وقت سیاہ فام ملازمہ اندر آ گئی۔ اُس نے ایک ہاتھ میں وزنی چاقو... گنڈاسا دبایا ہوا تھا دوسرے میں ایک ہتھوڑی اور کچھ کیلیں تھیں۔

"خوب... شکریہ۔ اب تم جا سکتی ہو"۔ بوڑھے نے کہا پھر تمام سامان میز پر ڈال دیا۔ یہ ایک لکھنے والی میز تھی۔ تقریباً ۴ فٹ لانبی اور ۳ فٹ چوڑی۔ اُس پر لکھنے کا سامان موجود تھا جسے بڈھے نے اُٹھا کر الگ رکھ دیا۔

"اب..." اُس نے کہا... "ایک کرسی یہاں رکھ دو"۔ کرسی اُٹھا کر میز کے نزدیک رکھ دی گئی۔ اُس نے کیلیں اُٹھائیں اور ہتھوڑی سے اُنھیں میز کے ایک گوشے پر ٹھونکنے لگا۔ وہ اِس وقت بڑی پھرتی دکھا رہا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے بچے کسی پسندیدہ کھیل کے سلسلے میں دکھاتے ہیں۔

ہم... میں، وہ لڑکی اور نوجوان... اپنے ہاتھوں میں مشروب کے گلاس تھامے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اُس نے چھ چھ انچ کے فاصلے سے دو جگہوں پر دو کیلیں گاڑیں۔ کیلوں کا سرا اوپر ہی اُبھرا ہوا تھا۔ پھر اُس نے اُنھیں ہلا ہلا کر ان کی مضبوطی کا اندا ہ کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اِس قسم کا کام پہلے بھی کر چکا۔ اُس کا انداز بڑا منجھا ہوا لگ رہا تھا جیسے اُسے پوری طرح معلوم تھا کہ آئندہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔

"اور اب" اُس نے کہا... "مجھے تھوڑی سی رسّی درکار ہو گی"۔ جلد ہی اُسے رسّی بھی مل گئی۔ "اچھی بات ہے" اُس نے کہا... "آخر کار سب تیاری مکمّل ہو ہی گئی۔ مہربانی کر کے اِس کرسی پر بیٹھ جاؤ"۔ اُس نے لڑکے کو مخاطب کیا۔

لڑکے نے گلاس ایک جانب رکھ دیا پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب اپنا بایاں ہاتھ اِن کیلوں کے درمیان رکھ دو۔ کیلیں محض اِسی لیے ہیں کہ میں تمہارے ہاتھ کو رسیوں سے باندھ سکوں... ٹھیک... میں اب تمہارے ہاتھ باندھنے جا رہا ہوں"۔

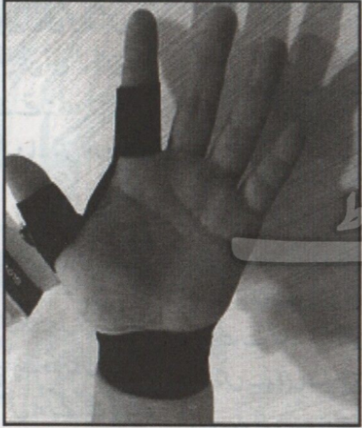
اُس نے رسی کو لڑکے کی کلائی کے گرد پھنسایا پھر اُسے کیلوں سے جکڑنے لگا۔ کام کے خاتمے پر میں نے دیکھا

لڑکے کا ہاتھ کچھ اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ اُسے وہاں سے ہٹانے میں قطعی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

"اب" اُس نے لڑکے کو ہدایت کرتے ہوئے کہا۔ "اپنی تمام انگلیاں بند کرو۔ صرف چھوٹی انگلی باہر نکلی رہنی چاہیے"۔

"بہت اچھے... اب ہم بالکل تیار ہیں"۔ اُس نے گنڈاسا اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے دائیں ہاتھ سے لائٹر کو روشن کرو گے... لیکن ایک منٹ!!"

پھر وہ میز کے اُس سرے پر جا کھڑا ہوا جہاں سے انگلی پر گنڈاسے سے بہ آسانی وار کیا جا سکتا تھا۔



"ہم بالکل تیار ہیں..." اُس نے کہا... "مسٹر ریفری براہِ کرم اجازت دیجیے"۔

لڑکی نوجوان کے قریب ہی کھڑی چپ چاپ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ لڑکا خاموش سا کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بایاں ہاتھ میز پر کرسی سے جکڑا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں گنڈاسے پر مرکوز تھیں۔ بوڑھا شخص اب میری جانب متوجہ تھا۔

"تم تیار ہو؟" میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"بالکل"۔

"اور تم" میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

"بالکل تیار" اُس نے کہا اور گنڈاسے کو نوجوان کی انگلی سے کوئی دو تین فٹ اوپر کی طرف اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکے نے سب کچھ دیکھا لیکن اُس کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں پڑی۔

"بہتر ہے، شروع ہو جاؤ"۔ میں نے کہا

لڑکا بولا۔ "مہربانی کر کے شمار کرتے جائیے۔ میں جتنی بار لائٹر روشن کروں آپ نمبر بولتے جائیں"۔

"بہتر ہے..." میں نے کہا۔

اُس نے لائٹر اوپر اُٹھاتے ہوئے چرخی پر اپنا انگوٹھا زور سے گھِسا۔ ہلکی سی آواز ہوئی اور لائٹر کا شعلہ بھڑک کر جل اُٹھا۔

"ایک..." میں نے کہا

پانچ سیکنڈ کا وقفہ دے کر اُس نے لائٹر بند کر دیا۔ چند ہی سیکنڈ میں اُس کا انگوٹھا پھر حرکت میں آیا۔ آواز سی ہوئی اور لائٹر جل اُٹھا۔

"دو"۔

کمرے میں موجود سبھی افراد خاموش رہے۔ لڑکے کی آنکھیں لائٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ منحنی بوڑھا گنڈاسا اُٹھائے اس بات کا منتظر تھا کہ لائٹر دھوکا دے اور وہ انگلی کاٹ گرائے۔ اُس کی آنکھیں بھی لائٹر پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"تین"

"چار"

"پانچ"

"چھ"

"سات"...

بظاہر یہ لائٹر چند بہترین لائٹروں میں سے ایک معلوم ہوتا تھا۔ سارا کھیل انگوٹھے کی حرکت کا تھا۔ میں نے "آٹھ" کہنے کے لیے سانس کھینچی۔ لڑکے کا انگوٹھا حرکت میں آیا شعلہ بھڑکا اور لائٹر کی لو روشن ہو گئی۔

"آٹھ" میں نے کہا۔ اُسی وقت دروازہ پُرشور آواز کے

ساتھ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہو گئی۔ وہ چھوٹے قد اور کالے بالوں والی ادھیڑ عمر خاتون تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے وہیں رک گئی پھر چیختی ہوئی لپکی۔ ''کارلس۔ کارلس''۔ اُس نے بوڑھے کی کلائی تھامتے ہوئے گنڈاسا چھین لیا پھر اُسے بستر پر پھینکتی ہوئی بوڑھے سے لپٹ گئی۔ چند ہی لمحوں میں اُس نے بوڑھے کو بُری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ ساتھ ہی اسپینی زبان میں کچھ چیختی بھی جا رہی تھی۔ جھٹکے سے اُس نے بوڑھے کو بستر پر تقریباً دے مارا۔ بوڑھا وہیں بری طرح منہ کھولے پڑا رہا۔ پھر وہ ہماری جانب مڑتے ہوئے انگریزی میں بولی:

''معاف کیجیے گا... یہ ساری غلطی میری ہی تھی۔ میں چند لمحوں کے لیے باہر کیا گئی اِس کم بخت کی بن آئی''۔ اُس کے چہرے پر پشیمانی کے آثار اُبھرے ہوئے تھے۔

لڑکے نے اپنا ہاتھ کھولنا شروع کر دیا۔ میں اور وہ لڑکی چپ چاپ کھڑے دیکھتے رہے۔

''یہ ایک مصیبت ہے جناب''۔ خاتون نے کہا۔ ''ایک مصیبت...... جس جگہ ہم رہتے تھے وہاں بھی یہ ایسی حرکت میں بتلا تھا۔ اُس جگہ اِس نے سینتالیس آدمیوں کی انگلیاں ضرور کاٹی ہوں گی۔ اِس دوران یہ تقریباً پندرہ کاروں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ بعد میں لوگ اس قدر مشتعل ہو گئے تھے کہ مجھے اِسے لے کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ تب سے میں یہاں ہوں''۔

''ہم نے بازی باندھی ہوئی تھی'' بوڑھے نے منمناتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے اِس نے اِس کار کو داؤ پر لگایا ہوگا، کیوں؟'' عورت نے پوچھا۔

''ہاں...'' لڑکے نے جواباً کہا... ''کیڈیلاک''۔

''لیکن اِس کے پاس کوئی کار نہیں... کیڈی میری

علم

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ چار آدمیوں سے علم حاصل نہیں کرنا چاہیے:

۱۔ بے وقوف جس کی بے وقوفی اعلانیہ ہو۔

۲۔ کذاب۔

۳۔ بدعتی جو اپنی بدعت کی طرف دعوت دیتا ہو۔

۴۔ نیک آدمی جسے حدیث کا کچھ بھی پتا نہ ہو۔

ہے''۔ وہ بولی۔ ''یہ نہایت بُری بات ہے۔ جو چیز اس کی نہیں ہے بھلا وہ کیسے اسے داؤ پر لگا سکتا ہے۔ میں بے حد شرمندہ ہوں''۔

مجھے وہ عورت نہایت شریف اور سمجھدار معلوم ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے'' میں نے کہا... ''یہ رہیں کار کی کنجیاں'' میں نے کنجیاں میز پر ڈال دیں۔

''ہم تو صرف ایک بازی میں مصروف تھے... ایک چھوٹی سی بازی......'' بوڑھا ایک بار پھر منمنایا۔

''اِس کے پاس بازی لگانے کے لیے کچھ بھی نہیں''۔ عورت نے کہا۔ ''یہ کنگال ہے...... بالکل کنگال۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اِس کے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ ایک ایک چیز میں نے اِس سے جیت لی۔ حالانکہ میں نے اِس سلسلے میں بہت کچھ کھویا بھی، لیکن آخر کار میں اِسے کنگال کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں''۔

عورت نے رُک رُک کر لڑکے کو دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی...... ایک غمزدہ سی مُسکراہٹ پھر وہ میز کی سمت کنجیاں اُٹھانے کے لیے بڑھی۔

میں اُس کے ہاتھوں کو اب دیکھ سکتا تھا... انگوٹھے اور اُس سے ملحق انگلی چھوڑ کر اُس کے ہاتھوں کی ساری انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔

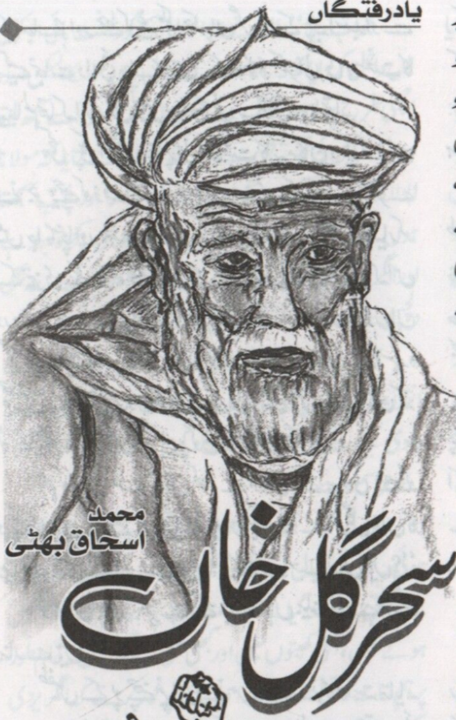
جنوری ۱۹۷۲ء کی بات ہے، میں پندرہ دن کی چھٹی پر اپنے گاؤں چک ۵۳ گ ب منصور پور گیا جو جڑانوالہ سے تین میل آگے فیصل آباد جانے والی سڑک سے دو فرلانگ پر بائیں جانب واقع ہے۔ اس دوران ایک دن میں بچپن کے دوست محمد طفیل فوجی جو اسی گاؤں میں مقیم ہیں، میرے پاس آئے اور کہا: ''چلو تمھیں آج ایک ایسے شخص سے ملائیں جو کسی زمانے میں انقلابیوں کے ساتھ رہا ہے۔ اس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ ہندوستان کی انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے نتیجے میں ملک کی مختلف جیلوں میں گزرا۔''

میں نے پوچھا: ''وہ کون صاحب ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟''

طفیل نے جواب دیا: ''ان کا نام سحر گل خاں ہے۔ جڑانوالہ سے دو میل کے فاصلے پر چک ۲۳۸ گ ب میں اقامت گزیں ہیں۔'' طفیل نے یہ بھی بتایا کہ وہ بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔ سحر گل خاں کا نام میں نے پہلی دفعہ سنا تھا۔ جیسے جیسے طفیل ان کے بارے میں سلسلہ واقعات بڑھاتا میرے دل میں ان سے ملنے کا جذبہ شوق تیز تر ہوتا گیا۔

دن کے دس بجے ہوں گے کہ ہم دونوں سائیکلوں پر سوار ہوئے اور جڑانوالہ جا کر اس شخص کی دکان پر پہنچے، جہاں سحر گل خاں کا آنا جانا تھا، لیکن وہ وہاں نہیں آئے تھے اب ہم ان کے گاؤں چک ۸۳۲ گ ب کو روانہ ہوئے جو جڑانوالہ سے جنوب مشرق میں دو میل کے فاصلے پر ہے۔ چند منٹ بعد ہم اس گاؤں کے چوک میں پہنچے تو طفیل نے مجھے ایک مکان کے سامنے جا کھڑا کیا اور کہا: ''یہ ہے سحر گل خاں کا مکان!''

میں نے باہر سے مکان کو غور سے دیکھا۔ کہیں پکی اینٹیں تھیں، کہیں کچی۔ مکان کے اندر جانے کا دروازہ پکی اینٹوں



سحر گل خاں

محمد اسحاق بھٹی



انگریزوں سے نبرد آزما ہونے والے بھگت سنگھ کے منکسر مزاج ساتھی کا دل آویز خاکہ

سے بنا تھا۔ ساتھ ہی دائیں جانب پکی اینٹوں کی بیٹھک تھی جس کا ایک دروازہ باہر کو کھلتا تھا۔

طفیل نے بتایا، یہ چھوٹی سی بیٹھک بھگت سنگھ اور اس کے بعض ساتھیوں کا مرکز رہی ہے۔ وہ اس بیٹھک میں یہ مشورے کرتے رہے ہیں کہ برصغیر میں کس طرح انقلاب برپا

کیا جائے اور خطے کو غیر ملکی حکمران گروہ کے پنجہ استبداد سے کیسے نجات دلائی جائے جس کے دائرۂ حکمرانی کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ اس میں کہیں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

کچی پکی اینٹوں کا پرانی ساخت کا یہ مکان دیکھ کر ذہن نے جو پیچھے کو زقند لگائی تو بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں جا پہنچا اور بہت سے ان دیکھے واقعات عملی شکل اختیار کر کے تیزی کے ساتھ چشم تصور میں گھومنے لگے۔ خیال آیا کہ اس دروازے سے آزادی خواہ طبقے کے بہت سے کارواں گزرے ہیں اور یہ خاموش دیواریں اور چپ چاپ بوسیدہ چھتیں بے شمار بھیدوں اور رازوں کی امین ہیں، ایسی امین کہ ٹوٹ پھوٹ جائیں مگر کسی پر کوئی راز ظاہر نہ کریں۔

ہم دو تین منٹ وہاں کھڑے مکان کے بیرونی حصے کو دیکھتے رہے۔ اتنے میں ایک نوجوان باہر نکلا۔ وہ سحر گل خاں کا بیٹا تھا۔ طفیل نے اس سے پوچھا: ''خاں صاحب کہاں ہیں؟''

نوجوان بولا: ''مربعے گئے ہیں، وہاں بیلنا لگایا ہے اور گڑ بنا رہے ہیں۔''

طفیل کے پوچھنے پر اس نے مربعے جانے کا راستہ بتایا۔

ہم وہاں پہنچے تو دیکھا، بیلوں کی جوڑی بیلنے میں جتی ہوئی ہے۔ چار پانچ آدمی گڑ تیار کر رہے ہیں۔ ایک صاحب موٹے بان کی چوکھڑا بنی ہوئی چارپائی پر بیٹھے کام کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان کی نظر ہم پر پڑی تو اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سلام کے لیے آگے بڑھے۔ ہم نے سائیکل ایک طرف کھڑے کیے اور میں نے نہایت ادب کے ساتھ اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دیے۔

طفیل نے ان سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا: ''یہ لاہور سے آئے ہیں۔ آپ سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

انھوں نے بغل گیر ہونے کے لیے بانہیں پھیلا دیں۔ پھر چارپائی قدرے کھلی جگہ میں کھینچتے ہوئے کہا: ''تشریف رکھیے، ہم دیہاتی لوگ ہیں، کھیتوں میں چارپائی صوفے اور کرسی کا کام دیتی ہے اور پلنگ کا بھی۔''

میں نے کہا: ''میں بھی دیہاتی ہوں اور گاؤں سے آیا ہوں۔''

وہ خود پائنتی میں بیٹھے اور ہمیں اصرار کر کے سرہانے کی طرف بٹھایا۔ پھر بولے: ''پہلے یہ بتائیے، میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ گنے کا تازہ رس پینے اور گرم گرم گڑ کھانے کو حاضر ہے۔ لسی بھی موجود ہے، مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ بھی پیش کر سکتا ہوں۔''

ہم نے ان کی اس پیش کش کا شکریہ کیا اور کہا کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ نہ مانے تو ہم نے گنے کے رس کا ایک ایک گلاس پیا اور تھوڑا سا گڑ کھایا۔ یعنی ان کا نمک کھانے سے بچے رہے۔ کسی کا نمک کھانے کے بعد ایک شریف آدمی بہت سی مجبوریوں میں جکڑا جاتا ہے۔

بولے: ''اب فرمائیے، کیا ارشاد ہے؟''

وہ صاف ستھرے لہجے میں خالص پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔ طرز کلام تعلّی اور تکبر سے پاک۔ ہر بات میں انکسار کا غلبہ اور مخاطب کا احترام ملحوظ خاطر۔ میں نے سر سے پاؤں تک انھیں بار بار دیکھا۔ گورا رنگ، خشخشی سفید ڈاڑھی، چڑھی ہوئی مونچھیں، سر پر خاکی سے رنگ کی قراقلی ٹوپی، سفید کھدر کی شلوار قمیص، ہلکے آسمانی رنگ کی گرم چادر، براؤن پشاوری چپل، موٹی موٹی چمک دار آنکھیں، جوان کی ذہانت کی عکاس تھیں۔ پورا قد، متناسب جسم، بات چیت کا اسلوب دھیما اور میٹھا۔ پینسٹھ سال کے لگ بھگ عمر، صحت بہت اچھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی بیمار نہیں ہوئے، ہمیشہ سے صحت مند اور توانا ہیں۔ بلا جھجک بات کرتے، حالانکہ اس سے پہلے کوئی تعارف نہ تھا۔

میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا: ''خاں صاحب! آپ کا آبائی تعلق ضلع لائل پور (حالیہ فیصل آباد) سے ہے یا کسی اور علاقے سے؟ یعنی آپ آبادکار ہیں یا آزادی کے بعد پناہ گزین کی حیثیت سے یہاں آئے؟''

جواب دینے کی بجائے انھوں نے مجھ سے سوال کیا: ''آپ کسی اخبار سے منسلک ہیں؟''

میرے خیال میں یہ سوال بڑا معقول اور برمحل تھا، اس لیے کہ اخبار نویس کے سوال کا جواب عام آدمی سے مختلف طور پر دیا جاتا ہے۔ پھر انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ میرے پاس بعض اخباروں والے آتے ہیں، مگر میں کسی سے بات نہیں کرتا۔

میں نے کہا: ''کچھ عرصہ پیشتر میں ایک ہفت روزہ اخبار سے منسلک تھا۔ پندرہ سال اس کا ایڈیٹر رہا۔ اب میرا کسی اخبار سے تو تعلق نہیں، تاہم کام لکھنے پڑھنے ہی کا کرتا ہوں۔ البتہ ایک ایسے ماہانہ رسالے کی ادارت میرے سپرد ہے جو خالص علمی اور تحقیقی نوعیت کا ہے...... سیاسی معاملات و مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔'' میں نے انھیں اپنے کام کی نوعیت بتائی اور کہا: ''آپ سے صرف اپنی ذاتی معلومات کے لیے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں، مجھے اس موضوع سے دلچسپی ہے۔ شاید یہ باتیں کبھی ضبط تحریر میں آ جائیں۔''

انھوں نے بتایا کہ وہ اصلاً صوبہ سرحد کے قبیلہ خٹک سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاقہ تیرہ کے موضع الگڑی بیٹھا خیل کے رہنے والے ہیں جو ضلع اور تحصیل کالا کڑ میں واقع ہے۔ والد کا نام احمد خاں اور دادا کا اسم گرامی نور محمد خاں تھا۔ نور محمد خاں، انگریزی فوج میں صوبیدار میجر تھے۔ فوجی کی حیثیت سے قابل قدر خدمات انجام دینے پر انھیں جڑانوالہ کے قریب چک ۲۳۸ گ ب میں جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں، حکومت کی طرف سے دو مربعے زمین دی گئی۔ انھوں نے بتایا کہ اب میں اس زمین میں کاشت کاری کرتا ہوں۔ پھر ایک باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ باغ بھی اسی زمین میں ہے اور باغبانی میرا محبوب مشغلہ۔

میں نے پوچھا: ''آپ نے تعلیم کہاں حاصل کی؟''

جواب دیا: ''والد نے جڑانوالہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل کروایا تھا۔ باقاعدہ صرف مڈل پاس کر سکا، لیکن اردو اچھی طرح پڑھ اور مشکل سے مشکل الفاظ آسانی سے سمجھ لیتا ہوں۔'' اس کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی اردو بھی روانی سے پڑھتا اور خوب سمجھتا ہوں۔ پشتو بھی جانتا ہوں، فارسی زبان سے بھی کچھ رابطہ ہے اور انگریزی بھی ٹٹول لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ تصوف سے بھی دلچسپی ہے اور سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت ہوں۔

میں نے سوال کیا: ''سنا ہے آپ کا تعلق ہندوستان کے انقلابیوں سے رہا ہے۔ کیا آپ یہ بتانا مناسب سمجھیں گے کہ وادی سیاست میں کب قدم رکھا، کیوں رکھا اور کن لوگوں سے مراسم رہے؟''

جواب ملا: ''میں اکیس سال کی عمر میں میری شادی ہوئی۔ کوئی دو سال بعد بھگت سنگھ اور اس دور کے انقلابیوں سے تعلق پیدا ہو گیا۔ مختلف مقامات پر ہماری خفیہ میٹنگیں ہونے لگیں، کبھی کھیتوں میں اور کبھی کسی کے گھر میں۔ عام طور پر ہم رات کو جمع ہوتے اور اس مسئلے پر غور کرتے کہ انگریزی حکومت کے خلاف کیا اقدام کیا جائے۔ بارہا یہ مشورے میرے گھر میں ہوئے۔ میری چھوٹی سی بیٹھک ہم چند آدمیوں کی جلسہ گاہ تھی۔ انگریز کے خلاف ہم نرمی کے حامی نہ تھے، قدرے گرم سیاست کو اپنانا ہمارا نقطہ نظر تھا۔ اسی لیے انگریزی حکومت ہمیں بدنام کرنے کے لیے دہشت پسند قرار دیتی جس کا دوسرا نام تخریب کار ہے، حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ نہ ہم دہشت پسند تھے، نہ تخریب کار۔ ہم محض انقلابی تھے اور ملک میں انقلاب لانا چاہتے تھے۔ انقلاب کی بات یا کوشش کرنا قانونی طور سے نہ اس وقت کوئی جرم تھا، نہ اب جرم ہے۔ ہماری یہ کوشش تھی کہ ملک کے عام لوگوں سے کسی نہ کسی طرح رابطہ پیدا کر کے انھیں انگریز کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔ جس طرح ممکن ہو، ان کو اپنا ہم نوا بنانے کی

سعی کی جائے۔"

خاں صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "علاقے کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے میرے ساتھیوں نے مجھے کسی مسجد کو مرکز بنانے اور اس میں امامت و خطابت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں نے قرآن مجید جو پہلے ہی پڑھا تھا، اب دوبارہ اچھی طرح پڑھا۔ چند چھوٹی بڑی سورتیں یاد کیں، کچھ ترجمہ پڑھا اور اردو کی بعض تفسیروں کا مطالعہ کیا اور ڈاڑھی بڑھا لی۔ میں اپنے ساتھیوں کے سامنے کسی نہ کسی اسلامی موضوع پر تقریر بھی کرتا۔ جب مجھے میرے ساتھیوں نے یہ سمجھا کہ میں کسی حد تک امامت وخطابت کے فرائض انجام دینے کے قابل ہو چکا تو مولویوں کا سا لباس پہن اور وہی وضع قطع بنا کر چپکے سے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

خاں صاحب نے بتایا کہ اس وقت میں ڈیڑھ سال کے بچے کا باپ تھا۔ لیکن کسی قسم کا پیار اور محبّت میری راہ میں حائل نہ ہوئے اور کسی چیز نے میرا راستہ نہ روکا۔ وطن کے کروڑوں لوگوں کے پیار نے گھر کے انفرادی پیار پر پوری طرح غلبہ پا لیا۔ اپنا ذاتی مفاد اجتماعی مفاد پر قربان کر دیا۔ میں نہایت ہنسی خوشی سے مستقبل کے پروگرام بناتا بڑھتا گیا۔ اپنے گاؤں سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر ایک زمیندار کی "ڈھاری" میں پہنچا۔ سخت بھوک لگ رہی تھی، زمیندار نے مجھے کھانا کھلایا اور پوچھا: "مولوی ہو"۔

جواب دیا: "جی ہاں، مولوی ہوں۔"

بولا: "کہاں سے آئے ہو اور کیا پتا ٹھکانا ہے؟"

عرض کیا: "کسی مصیبت زدہ آدمی کا کیا پتا ٹھکانا ہو سکتا ہے۔ بال بچوں والا اور بے روزگار ہوں۔ کسی چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش میں ہوں۔ آٹھ جماعتیں سرکاری اسکول میں پاس کی ہیں۔"

زمیندار نے مجھ پر ترس اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "بچوں کو قرآن شریف پڑھاؤ اور جمعہ و جماعت کروا سکو گے؟ ہم دو وقت کا کھانا اور ربیع اور خریف کی فصلوں کے موقع پر کچھ غلہ دے دیا کریں گے۔ اگر یہ منظور ہو تو ہمارے گاؤں کی مسجد میں کام شروع کر دو۔ قیام کے لیے مسجد کا حجرہ موجود ہے۔"

زمیندار نے مزید کہا: "صبح شام کی روٹی مسجد میں پہنچانے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتانا، میں گاؤں کا نمبردار ہوں۔"

خاں صاحب نے بتایا: "میں نے زمیندار کی یہ پیش کش شکریے کے ساتھ فوراً قبول کر لی، کیونکہ میں اسی مقصد کے لیے گھر سے نکلا تھا اور یہی میرا مشن تھا۔ یہ "جانگلیوں" کا گاؤں تھا، وہاں کے لوگ بہت با اخلاق تھے اور میری عزت کرتے۔ اس گاؤں میں مجھے "میاں جی" کہا جاتا۔ مسجد کے امام کے لیے دیہات میں یہی لفظ استعمال ہوتا تھا۔

سحر گل خاں گاؤں میں بچوں کو قرآن شریف پڑھانے لگے۔ وہ بڑی عمر کے لوگوں کو قرآن مجید کے ساتھ اردو بھی پڑھاتے۔ نماز فجر کے بعد درس قرآن کا آغاز بھی کر دیا اور جمعہ و جماعت میں خاصی حاضری ہونے لگی۔ اس علاقے میں یہ پہلا انداز تعلیم تھا، جس سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور بڑے چھوٹے پابندی سے مسجد میں آنے لگے، لیکن یہ سلسلہ دو مہینے سے زیادہ نہ چل سکا۔ وجہ یہ ہوئی کہ خاں صاحب جوش جوانی میں آ کر جلد ہی دل کی بات زبان پر لے آئے اور انگریزی حکومت کی مخالفت اور آزادیٔ وطن کی باتیں کرنے لگے۔ یہ باتیں وہاں کے لوگوں نے کبھی نہ سنی تھیں۔ ایک دن وہی شخص جس نے ان کو مسجد کا امام وخطیب مقرر کیا تھا، انھیں باہر اپنی "ڈھاری" میں لے گیا اور پیار کے لہجے میں ان سے کہا:

"میاں جی! آپ انگریزوں کی مخالفت کرتے اور کہتے ہیں کہ ان کو اس ملک سے نکال دینا چاہیے۔ یہ نہ

ہونے والی بات ہے۔ آپ ان کو کیسے نکالیں گے۔ ان کے پاس بارعب پولیس ہے، بہت بڑی فوج ہے، ہر تحصیل میں بڑے بڑے تھانے ہیں، ضلعوں میں انگریز ڈپٹی کمشنر ہیں، گورے پولیس کپتان ہیں، ہم ان کے ماتحت ہیں۔ یہ بہت بڑی طاقت کے مالک ہیں۔ جہاں جائیں، ان کے رعب اور دبدبے سے لوگوں کے ہوش گم ہو جاتے۔ انھوں نے ریلیں چلائیں، سڑکیں بنائیں، دریاؤں پر پل تعمیر کیے، نہریں جاری کیں، علاقوں کے علاقے آباد اور سیراب کیے، چک بندی کر کے لوگوں کو بسایا اور بڑے بڑے جیل خانے بنائے ہیں۔ اگر چاہیں تو سب کو پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیں، کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں، سیدھے سادے نماز روزے کے مسئلے بیان کیا کریں، جن کی لوگوں کو ضرورت ہے۔ اگر آپ کی باتوں کا پولیس والوں کو پتا چل گیا تو آپ کو پکڑ لیں گے اور ہمیں بھی تنگ کریں گے۔ آپ ماشاءاللہ خوب صورت جوان ہیں، اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالیں۔''

خان صاحب کے بقول زمیندار کا انداز کلام ہمدردانہ تھا اور رازدارانہ بھی۔ وہ کہتے ہیں ''زمیندار کی یہ باتیں سن کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں عجلت سے کام لیا ہے۔ ابھی ان کے کان اس قسم کی باتوں سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ ذہن انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے پھر وہاں رہنا مناسب نہیں سمجھا، کسی کو بتائے بغیر خاموشی سے گاؤں سے نکلے اور لاہور آ گئے۔ لاہور میں ان کے کئی مسلمان، ہندو اور سکھ ساتھی موجود تھے، جنھیں انقلابی کہا جاتا۔ اس زمانے میں ان کا اصل ٹھکانا ڈی اے وی کالج (یعنی دیانند اینگلو آریہ ویدک کالج) کا ہاسٹل تھا۔ یہ اب اسلامیہ کالج (سول لائن) کہلاتا ہے۔ کالج کے عقب میں اس کا ہاسٹل واقع ہے۔

ہاسٹل میں مقیم ان انقلابیوں پر پولیس چھاپے مارتی تو یہ ادھر ادھر ہو جاتے۔ بعض دفعہ کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کر لیا جاتا۔ پوچھ گچھ یا تھوڑی بہت سختی کے بعد وہ رہا یا جیل میں بند کر دیے جاتے۔ ان کے کھانے پینے کا کوئی خاص انتظام نہ تھا، کچھ لوگ ان کی مدد کرتے اور کھانا وغیرہ بھجواتے رہتے۔ انقلابیوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ بعض کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے اور دوسرے نسبتاً غریب اور تنگ دست۔ حصول آزادی کے پرخلوص جذبے نے سب کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا تھا۔ روکھی سوکھی جو مل جاتی، کھا لیتے۔ کبھی گوشت کھانے کو جی چاہتا تو چار پانچ آنے اکٹھے کر کے پولیس کی آنکھوں سے بچتے بچاتے علی ہجویری کے دربار پہنچتے اور وہاں بڑا گوشت کھا لیتے۔ ہندو اور سکھ کوئی پرہیز نہ کرتے تھے۔ سبھی ایک ہی جگہ رہتے، ایک جیسی چیزیں اور ایک ساتھ کھاتے۔

حالات نے ان کو شکی مزاج بنا دیا تھا۔ کسی کے پاس ایک دو روپے پائے جاتے تو ساتھیوں کے نزدیک اسے مشکوک سمجھا جاتا۔ پھر سختی سے پوچھا جاتا کہ اتنے پیسے کہاں سے آئے؟ کیا اس کا رابطہ پولیس یا سی آئی ڈی سے تو نہیں کہ انھوں نے یہ پیسے دیے ہوں؟ اس سے باقاعدہ جواب طلبی کی جاتی۔ اگر تسلی بخش جواب نہ دے پاتا تو اس کی شامت آجاتی۔

اس قسم کا خود اپنا ایک واقعہ سحر گل خاں نے سنایا۔ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ وہ والدہ سے ملاقات کرنے کی خاطر گھر کو روانہ ہوئے۔ اس کا سب کو علم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ مالی اعتبار سے ان کے گھریلو حالات اچھے ہیں۔ ضلع لائل پور میں انھیں گرفتاری کا خطرہ تھا۔ فقیروں کا سا بھیس بنایا، ہاتھ میں کشکول پکڑا۔ گلے میں کئی رنگوں کے بڑے بڑے منکوں والی مالا ڈالی اور رات کے دس بجے ہوں گے کہ اپنے گاؤں چک ۲۳۸ گ ب پہنچے۔ ان کا بڑا لڑکا اس وقت چار برس کا ہو چکا تھا۔

گرمیوں کا موسم تھا، دروازے پر کھڑے تھے کہ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی، آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا تو گھر کا پالتو کتا بھونکنے لگا۔ ماں کی ممتا نے سرگوشی کی کہ باہر اس کا بیٹا ہے۔ اس نے اندر سے آواز دیے بغیر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر فقیری لباس میں بیٹا کھڑا ہے۔ بوڑھی ماں بیٹے کو کھینچ کر اندر لے گئی اور جوش محبت میں اس سے لپٹ گئی۔

جوان و خوبرو بیٹے کا حلیہ دیکھا تو آنکھوں کے دریا سے آنسوؤں کی لہریں اچھل کر کناروں سے باہر آگئیں۔ ادھر سحر گل خاں کا معصوم بیٹا فقیر کو دیکھ کر سہم گیا۔ ان کا یہ سب سے بڑا بیٹا تھا جو عین عالم شباب میں وفات پا گیا تھا۔

ایک دن اور دو راتیں وہ گاؤں میں رہے، لیکن گھر سے باہر نہیں نکلے۔ دوسری رات نماز فجر سے پہلے اٹھے، وہی فقیری لباس پہنا اور واپس لاہور کو چل پڑے۔ آتے وقت ماں نے ریل کے کرایہ وغیرہ کے علاوہ پانچ روپے دیے جو اس زمانے میں اچھی خاصی رقم تھی۔ لاہور آ کر وہ اپنے بعض رفقا کے ساتھ بھاٹی دروازے گئے، ان کو مٹھائی اور گوشت کھلایا۔ اس پر ان کا ڈیڑھ روپیا خرچ ہوا۔ اب ساڑھے تین روپے ان کے پاس تھے۔ جن ساتھیوں نے مٹھائی اور گوشت کھایا اور پھر ساڑھے تین روپے بھی ان کے پاس دیکھے تو وہ سخت حیران ہوئے کہ اتنی بڑی رقم ان کے پاس کہاں سے آئی؟ ساتھیوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور شبہ کیا گیا کہ اس شخص نے پولیس سے تعلق پیدا کر لیا ہے۔ اسی نے اتنی بڑی رقم اس کو دی ہے، اب یہ ہمارے کام کا نہیں رہا۔ یہاں رہا تو پولیس کو ہماری ڈائری پہنچایا کرے گا اور ہمیں گرفتار کروائے گا۔

یہ مسئلہ سب کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بن گیا۔ سحر گل خاں اور ان کے ساتھیوں کے لیے بھی۔ آخر بڑی مشکل سے ان کو اطمینان دلایا گیا اور گواہ پیش کیے گئے کہ یہ اپنے گاؤں گئے تھے۔ گھر والے آسودہ حال ہیں اور یہ رقم ان کو والدہ نے دی تھی۔

سحر گل خاں نے انقلابیوں کے بارے میں بعض تعجب انگیز اور لرزہ خیز انکشافات کیے۔ انھوں نے بتایا کہ جو شخص ان سے منسلک ہو جاتا، وہ گھر بار، بیوی، بچوں اور رشتے داروں کو بالکل بھول جاتا۔ ان کی زندگی اور موت کی اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ بعض انقلابیوں نے خود ہی بیوی بچوں کو مار ڈالا تاکہ ان کی سرگرمیوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے اور وہ ہر طرف سے بے فکر ہو کر اپنی جدوجہد جاری رکھ سکیں۔

مثال دیتے ہوئے انھوں نے ضلع جالندھر کے ایک ہندو انقلابی کا انتہائی الم انگیز اور حیرت ناک واقعہ سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ جب وہ گھر سے لاہور آیا اور انقلابیوں سے ملا تو گھر میں تین افراد کو چھوڑ کر آیا تھا، بوڑھی ماں، جوان بیوی اور سات آٹھ سال کی بیٹی۔ اس نے اپنے گھر اور گاؤں میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ لاہور کے ایک علاقہ گوالمنڈی میں رہتا اور وہاں تھوڑا بہت کام کاج کرتا ہے۔

پانچ سال بعد وہ گاؤں گیا تو ماں سخت بیماری کی حالت میں بے ہوش پڑی تھی۔ بیٹے نے اسے بلانے اور پرنام کرنے کی کوشش کی تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ بیٹے کے سر پر کانپتا ہوا پیار سے ہاتھ پھیرا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے دن وہ مر گئی۔ بیٹے نے ادھر ادھر سے کچھ ادھار پیسے لیے اور ضروری مذہبی رسوم ادا کیں۔ تیسرے دن بیوی نے کہا، ساس جو ہماری نگہبان تھی، وفات پا گئی۔ بیٹی جوان ہو چکی۔ ہمارا ماں بیٹی کا تنہا رہنا مناسب نہیں۔ ہمیں اپنے ساتھ لاہور لے چلو، تھوڑا بہت جو کماؤ گے اس سے گزر اوقات ہوتی جائے گی۔ شوہر نے بیوی کی بات غور سے سنی اور کہا: ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ تین دن مزید انتظار کرو، پھر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

دو دن میں اس نے مکان بیچا اور گھر کا سامان فروخت کیا۔ ماں کی موت پر جن لوگوں سے ادھار روپے لیے تھے، کچھ ان کو دیے اور کچھ جیب میں ڈالے اور تیسرے دن

سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے بیوی اور بیٹی سے کہا: ”چلو تیار ہو جاؤ۔“

بیوی نے کہا: ”کل چلیں گے، اب شام ہو رہی ہے، رات کہاں رہیں گے۔“

بولا: دن کو یہاں سے نکلنا مناسب نہیں، ابھی چلنا چاہیے۔“

دونوں کو لیے دریائے بیاس کے کنارے آیا۔ اب رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ بیوی نے کہا: ”یہاں نہ کوئی سڑک ہے، نہ موٹر، نہ تانگہ، نہ راستہ، نہ گاؤں، نہ ریلوے اسٹیشن، کہاں لے آئے ہو؟

کہا: ”یہی جگہ ٹھیک رہے گی۔“

ان کو ایک پتھر پر بٹھایا، پانی پلایا اور چند منٹ بعد ”ڈب“ سے پستول نکالا۔ ایک گولی بیوی اور دوسری بیٹی کے سینے میں پیوست کر دی اور لاشیں دریا میں پھینک دیں۔ پستول بھی گہرے پانی میں پھینک دیا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ جب دیکھا کہ لاشیں دریا کی تیز لہروں سے ہم آغوش ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں تو منہ ہاتھ دھویا اور پانی پیا۔ پھر ایک قریبی گاؤں میں جا کر رات بسر کی۔

سحر گل خاں نے بتایا کہ دوسرے دن لاہور آ کر اس نے بچی رقم ساتھیوں کے سامنے ڈھیر کر دی اور یہ تمام واقعہ بیان کیا۔ ساتھیوں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا تو اس نے بتایا ”میں نے بیوی اور بیٹی کی لاشیں لہروں کے سپرد کرتے ہوئے رات کے سناٹے کی اندھیری فضا میں انگریزی حکومت کو مخاطب کر کے کہا تھا: ”لو اب میری یہ آخری پریشانی بھی ختم ہوئی، اب پورے اطمینان سے آزادی کی جنگ لڑوں اور ملک میں انقلاب لانے کی بھرپور کوشش کروں گا۔“

بھگت سنگھ سے سحر گل خاں کا گہرا رابطہ تھا۔ اس کا تعلق بھی ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ سے تھا۔ بھگت سنگھ کے والد کا نام کشن سنگھ اور دادا کا ارجن سنگھ تھا۔ اس خاندان کا تعلق دراصل ضلع جالندھر کی تحصیل نواں شہر کے ایک گاؤں کھٹکر کلاں سے تھا جو کسی زمانے میں آبادکار کی حیثیت سے تحصیل جڑانوالہ آ بسا تھا۔ جس گاؤں میں یہ لوگ آباد ہوئے، اس کا نام چک نمبر ۱۰۵ ۔گ ب بنگے ہے جو فیصل آباد روڈ پر جڑانوالہ سے تقریباً دس میل آگے ”سائیں دی کھوئی“ سے بائیں جانب کچھ فاصلے پر واقع ہے۔

سحر گل خاں نے بتایا کہ بھگت سنگھ جڑانوالہ کے اردگرد دیہات اور کھیتوں میں اکثر گھومتا رہتا تھا۔ جڑانوالہ کی مقامی پولیس اسے گرفتار نہ کرتی حالانکہ ضلعی انتظامیہ نے اس کے وارنٹ گرفتاری جاری کر رکھے تھے۔ مقامی پولیس کو عام طور پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کی کیا سرگرمیاں ہیں، لیکن اس کے باوجود پولیس کے دیسی اہل کار اسے گرفتار کرنے سے گریز کرتے۔ وہ اگر کہیں بیٹھا ہوتا اور کوئی مرد یا عورت یا بچے کھیتوں میں کام کرنے والوں کے لیے روٹی اور لسی پانی وغیرہ لے جاتے ہوئے اس کے قریب سے گزرتے تو وہ بے تکلفی سے روٹی پانی ان سے مانگ کر کھا پی لیتا۔ اس بات کی کوئی پروا نہ کرتا کہ جس سے وہ روٹی یا پانی مانگ رہا ہے، وہ مسلمان ہے یا سکھ ہے یا کسی اور مذہب کا فرد!

بھگت سنگھ کی گرفتاری کے سلسلے میں ایک حیران کن بات بھی سحر گل خاں نے بتائی۔ وہ یہ کہ جڑانوالہ کے قریب واقع چک نمبر ۱۱۹ گ ب کے ایک سکھ نمبردار (یا ذیلدار) نے لائلپور کے انگریز ڈپٹی کمشنر سے شکایت کی کہ بھگت سنگھ یہیں گھومتا پھرتا ہے۔ مقامی پولیس کو اس کا علم ہے، مگر وہ پکڑنے سے گریز کرتی ہے۔ اگر پولیس کو واقعۃً اس کا علم نہیں تو میں اسے گرفتار کروا سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے بھگت سنگھ کی مخبری کی اور ضلعے کی انتظامیہ سے مل کر اسے گرفتار کروا دیا۔ تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ اس سکھ مخبر کو کوڑھ کی موذی بیماری لاحق ہو گئی۔ کچھ دن بعد اس کا ایک لڑکا بھی کوڑھی ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ تمام گھرانا اس ہولناک مرض کی لپیٹ میں آ گیا۔

قیام پاکستان کے زمانے میں جب یہ لوگ بھارت گئے تو ان کا خاندان ”کوڑھیاں دا ٹبر“ (یعنی کوڑھیوں کا خاندان) مشہور تھا اور ان کی دوسری پشت کوڑھ میں مبتلا تھی...... اللہ جانے یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے، لیکن میں نے بعض دوسرے لوگوں سے بھی سنا۔

سحر گل خاں نے بتایا کہ بہ تاریخ ۲۳ اپریل ۱۹۳۱ء جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی، میں اس زمانے میں سنٹرل جیل لاہور میں قید تھا۔ بقول ان کے آزادی سے قبل یہ معمول رہا کہ بھگت سنگھ کی پھانسی کی تاریخ کو ہر سال بہت سے لوگ اس کے گاؤں چک نمبر ۱۰۵ گ ب بنگے جمع ہوتے اور اس کی برسی مناتے۔ مختلف حضرات اس موقع پر تقریریں بھی کرتے۔ انھوں نے بتایا کہ بھگت سنگھ کی آخری برسی ۲۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو منائی گئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

سحر گل خاں نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ میرے مکان پر بھگت سنگھ اور اس کے بعض ساتھی انگریز حکومت سے چھپ چھپا کر آتے تھے۔ میری چھوٹی سی بیٹھک میں ہماری مجلس جمتی اور کئی قسم کے مشورے ہوتے۔ بعض دفعہ کئی کئی دن یہ سلسلہ جاری رہتا۔ خاں صاحب نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کم و بیش پندرہ سال پنجاب کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ ان کی قید کا زیادہ عرصہ جو تقریباً دس سال پر محیط ہے، سنٹرل جیل لاہور میں گزرا۔ کہنے لگے کہ ہم نے جیل کو اپنا مستقل گھر قرار دے لیا تھا اور کئی قسم کی سبزیاں اپنی بارکوں کے اردگرد کاشت کر لی تھیں۔ باقاعدہ کیاریاں بنا کر انھیں سیراب کیا جاتا۔ پھر مختلف اقسام کے پھولوں کے بیج منگوا کر خوب صورت پھولوں کے پودے لگا لیے۔

سحر گل خاں سے میں نے دوران گفتگو پوچھا کہ دور انگریز میں پولیس والے آپ لوگوں کا بہت تعاقب کرتے ہوں گے۔ ایک ایک انقلابی کی ٹوہ لگانے میں کئی پولیس والے مقرر ہوں گے۔ کہیں خفیہ پولیس ہو گی، کہیں باوردی پولیس اور کہیں پولیس کے ٹاؤٹ......! اب ملک آزاد ہو چکا اور حکومت اپنی ہے۔ کیا پولیس والے آپ کا پیچھا کرتے ہیں؟ آپ نے آزادی کے لیے جو بے پناہ قربانیاں دی ہیں، ان کی وجہ سے پولیس والے اور دیگر اہل کار آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہوں گے؟

انھوں نے جواب دیا، یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں یا نہیں، یہ البتہ حقیقت ہے کہ خفیہ پولیس والے باقاعدہ میرا اپتا رکھتے ہیں کہ اس کی سرگرمیاں کیا ہیں، یہ کہاں جاتا ہے اور کون کون لوگ اس کے پاس آتے اور کیوں آتے ہیں۔ حالانکہ اب نہ میرا سیاست سے کوئی تعلق ہے اور نہ میں سیاسی لوگوں سے میل جول رکھتا ہوں۔ محض ایک کاشت کار کی زندگی بسر کرتا ہوں۔

میں نے ان سے کہا: ”خاں صاحب! آپ اپنے کماد سے گڑ بنا رہے ہیں، جب کہ جڑانوالہ میں شوگر مل قائم ہے۔ مل کے قرب و جوار کے چند میل کے علاقے میں جس میں آپ کا گاؤں بھی شامل ہے، گڑ بنانا ممنوع ہے۔ قانون کی رو سے آپ کو کماد شوگر مل میں بھیجنا چاہیے۔ کیا آپ کو بیلنا لگانے اور گڑ بنانے سے روکا نہیں گیا؟“

اس سوال پر وہ ہنسے اور جواب دیا: ”متعلقہ محکمے کے اہل کار کئی دفعہ میرے پاس آئے اور مجھے گڑ نہ بنانے اور کماد شوگر مل میں بھیجنے کے لیے کہا، مگر میں نہیں مانا۔ میں نے ہر دفعہ ان سے یہی کہا کہ زمین میری ہے، کماد میں نے لگایا، اس کا مالیہ، آبیانہ میں ادا کرتا ہوں، کماد میرا ہے، اس میں کھاد ڈالتا، پانی دیتا اور زمین میں کام کرنے والوں کو معاوضہ ادا کرتا ہوں۔ میں اس کو جس طرح جی چاہے استعمال میں لاؤں۔ کوئی شخص میرے کام میں دخل دینے کا مجاز نہیں۔ میں کسی مل کو کماد نہیں دوں گا، خود گڑ بناؤں گا۔ اگر میری یہ بات ناجائز اور ملکی قانون کے خلاف ہے تو مجھ پر مقدمہ قائم کر کے مجھے عدالت

میں لے جاؤ۔"

خاں صاحب نے کہا: "اب انھوں نے خاموشی اختیار کر لی ہے اور میں گڑ بنا رہا ہوں۔" پھر ہنستے ہوئے کہا: "آپ بھی اگر چاہیں تو تازہ گڑ لے جا سکتے ہیں، آپ کو مفت میں دیا جائے گا۔"

اس وقت غالباً ان کے دو بیٹے کھیتوں میں کام کر رہے تھے، میں نے پوچھا: "آپ نے اپنے بیٹوں کو کہاں تک تعلیم دلوائی ہے؟ ان میں سے کوئی سرکاری ملازم بھی ہے؟"

ایک بیٹے کی طرف اشارہ کر کے کہا! "یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ اس نے ایف اے پاس کیا تھا کہ میں نے اسے آگے پڑھنے سے روک دیا۔ میں اپنی زندگی میں اپنی اولاد میں سے کسی کو سرکاری ملازمت نہیں کرنے دوں گا۔ میں نے انھیں کھیتی باڑی پر لگا رکھا ہے۔ میرے نزدیک ہمارے لیے یہی اصلی کام ہے۔"

ہم تقریباً گیارہ بجے ان کے پاس پہنچے تھے اور دو گھنٹے وہاں رہے۔ ایک بجے یہ کہہ کر واپس آ گئے کہ کبھی پھر ملاقات ہو گی، لیکن میری ان سے یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ واپس آ کر میں نے جڑانوالہ میں بعض حضرات کو بتایا کہ میں سحر گل خاں سے مل کر آیا ہوں جو کسی زمانے میں برصغیر کے انقلابیوں کے ساتھ رہے اور جنھوں نے زندگی کا طویل عرصہ جیل میں گزارا ہے۔ بعض نے ان پر تنقید کرنا شروع کر دی اور ان کی سیاست کو بیچ میں لے آئے۔

برصغیر کے انقلابیوں کے متعلّق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان کا تعلّق کسی معروف سیاسی جماعت سے نہ تھا۔ ان کا سب سے الگ طرز عمل اور طریق کار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد پاکستان کا معاملہ تو خیر بالکل ہی دوسرا تھا، ہندوستان میں بھی انھیں پذیرائی حاصل نہ ہوئی اور ان کی بے پناہ قربانیوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ پھر خود ان کا نقطہ نظر بھی وہاں کے حکمرانوں سے ہم آہنگ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جو ذہنی کیفیت آزادی سے پہلے تھی، قریب قریب وہی بعد میں رہی۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا، بات ہو رہی تھی سحر گل خاں کی ......!

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ۱۹۷۲ء کی جنوری کے بعد میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ تو شاید مجھے بھول گئے ہوں گے، لیکن میرے دل میں وہ اور ان کی باتیں محفوظ رہیں۔ پانچ سال بعد ۱۹۷۷ء میں، میں نے جڑانوالہ کی غلہ منڈی میں کسی جگہ ایک چھوٹا سا اشتہار چسپاں دیکھا جس پر سحر گل خاں کی تصویر تھی اور لکھا تھا کہ یہ صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑ رہے ہیں اور عوام کے ووٹ کے حق دار ہیں۔ بائیسکل ان کا انتخابی نشان تھا۔

۱۹۷۹ء میں انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ایک سال بعد ۲۰ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ۷۶ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وفات کی خبر معلوم نہیں کسی اخبار میں چھپی یا نہیں۔ سحر گل خاں اپنے چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھے گم نامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مرنے کے بعد بھی گم نام رہے۔ ان کے بارے میں یہ چند سطور پہلی مرتبہ معرض اشاعت میں آ رہی ہیں اور وہ بھی ایک غیر سیاسی اور گوشہ گیر شخص کے قلم سے......!

اپنے دور کے انقلابیوں کے کارواں کا یہ آخری مسافر تھا جس نے اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی اور آسودۂ لحد ہوا......! سحر گل خاں! تم نے ملک کی آزادی کے لیے مصیبتیں جھیلیں اور قیدیں کاٹیں۔ تیرا اس میں کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا۔ تو ملک کے کروڑوں انسانوں کو غیروں کی غلامی سے نجات دلانے کا خواہاں تھا اور اس میں کامیاب ہوا۔ بارگاہ الٰہی میں ہماری عاجزانہ دعا ہے کہ

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

"یہ کمرا ۱۰×۷ کا ہونا چاہیے" تپائی پر کھلے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسز ملک نے پھر کہا۔ یہ تجویز انہوں نے تیسری بار دی تھی لیکن پتا نہیں کیوں ان کے شوہر اور نہ ہی آرکیٹیکٹ نے بات پر کوئی دھیان دیا۔

مسز ملک اپنا مکان بنوا رہی تھیں۔ دہلی میں سب سے زیادہ فیشن ایبل علاقے میں ان کا پلاٹ واقع تھا۔ حال ہی میں جب ان کا تبادلہ دہلی میں ہوا، تو انہوں نے فیصلہ کیا، چار چھ ماہ لگا کر یہ کام بھی نپٹا دیں۔

مسز ملک نے شوہر سے کہا "میں تو اب دہلی رہوں گی۔ آپ کی تبدیلی ہر چوتھے دن ہو جاتی ہے۔ میں اب بچوں کی پڑھائی مزید خراب نہیں کرنا چاہتی۔ میں اور ماں جی (ساس) بچوں کے ساتھ دہلی رہیں گے۔ کوئی بات بھی ہو، ہر دوسرے روز تام جھام اٹھا کر دوسرے شہر چلو......"

بچے جوان ہو رہے تھے۔ دہلی میں تنہا رہنے سے کیا ڈر؟ اور پھر ماں جی ان کے پاس ہوں گی۔ مسٹر ملک کو بھی اپنی بیوی کی رائے مناسب معلوم ہوئی۔

"یہ کمرا ۱۰×۷ کا ہونا چاہیے۔" مسز ملک نے پھر کہا۔

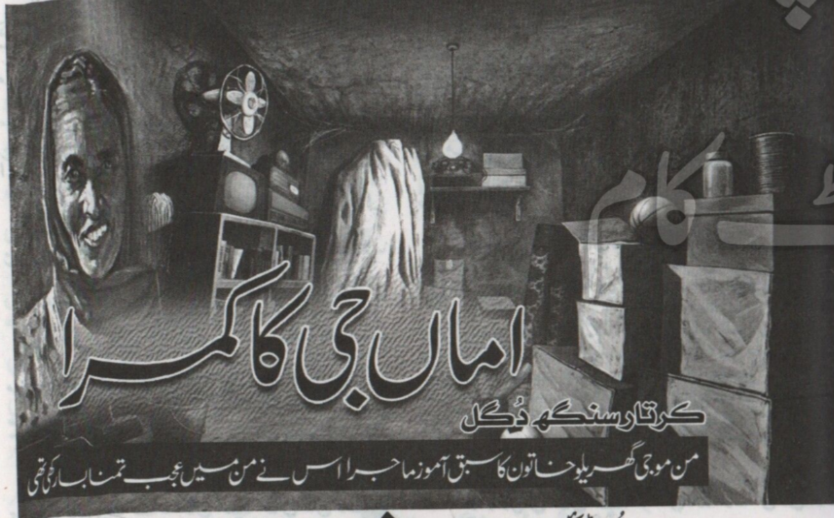
"لیکن یہ تو سٹور ہے۔" آرکیٹیکٹ نے مسز ملک کو سمجھایا۔

"ٹھیک ہے۔ میرا مطلب ہے یہ کمرا اماں جی کا ہو جائے گا۔ پھر سٹور بنا لیں گے۔"

آرکیٹیکٹ کو جیسے یہ بات سمجھ نہ آئی۔ وہ مسز ملک کو حیرت سے تکنے لگا۔

"میرا مطلب ہے، ماں جی اس کمرے میں اٹھ بیٹھ لیا کریں گی۔ پھر ان کے بعد...... انہیں کون سا اب زیادہ دیر......"

اتنے میں مسٹر ملک ٹیلیفون سن کر آ گئے۔ ٹیلیفون پر باتیں کرتے ہوئے انہوں نے بھی یہی سوچا تھا کہ سٹور روم ذرا بڑا ہونا چاہیے۔ آدمی کھلا ڈلا اس کے اندر سامان رکھ سکے اور پھر



کھلے سٹور کی صفائی بھی آسانی سے ہو سکتی ہے۔

فیصلہ ہوا، بچوں کے بیڈروم اور غسل خانے کے ساتھ لگتا کمرا ۱۰×۷ کا بنایا جائے۔ آنگن تھوڑا سا سکڑ جائے گا لیکن اس میں کوئی حرج نہیں۔

نقشہ پاس کرانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ مسز ملک نے بڑے چاؤ سے اپنا گھر بنوایا۔ گرمی کے دنوں میں بھی ساری دوپہر چھتری لے کر کاریگروں کے سر پر کھڑی رہتیں۔ کئی بار جب کوئی مزدور عورت نہ پہنچتی تو وہ خود مزدوروں کا ہاتھ بٹانے لگتیں۔ صبح سب سے پہلے موقع پر پہنچتیں، شام کے وقت سب کو بھیج کر واپس آتیں۔ مسز ملک مٹی کے ساتھ مٹی ہوتی رہیں اور پھر ان کا مکان کھڑا ہو گیا۔

ابھی وہ نئے گھر میں منتقل نہیں ہوئے تھے کہ حکومت وقت نے مکان پر حق ملکیت جتا دیا۔ مسز ملک کو جب پتا چلا، ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن پھر بہت سی رقم کرائے کی سن کر انہوں نے سرکار کے ظلم کو معاف کر دیا۔

اڑوس پڑوس کی عورتوں سے بنا کر رکھی دوستی، گلی محلے میں مکان بناتے سے پیدا ہونے والے رشتے اور مسز ملک کی چھوٹی موٹی امیدیں دھری رہ گئیں۔ بنائے ہوئے گھر کو سنوارنے سجانے کے کئی سپنے ادھورے رہ گئے۔ مسز ملک سوچتیں اور ایک پھیکی سی ہنسی ان کے لپ سٹک زدہ ہونٹوں پر کھیلنے لگتی۔

اور پھر مسٹر ملک کا تبادلہ ہو گیا...... مسز ملک نے شکر کیا کہ نہ اب وہ اپنا مکان دیکھا کریں گی، نہ انہیں غصہ آیا کرے گا۔ دہلی سے چلتے وقت مسز ملک نے سوچا، اچھا ہے، جائیداد تو بن گئی۔ کبھی انہیں افسوس ہوتا کہ اتنے شوق سے انہوں نے مکان بنوایا تھا۔ اپنی ہر ضرورت کا دھیان رکھا تھا لیکن وہ اس میں رہ نہ پائی تھیں۔

تبدیلیوں کے چکر میں ایک سے دوسرے شہر گھومتے ہوئے کئی سال بیت گئے۔ انہیں اپنے مکان میں رہنے کا ارمان تھا، وہ پورا نہ ہوا۔ سرکار نے ان کے گھر میں کوئی سرکاری دفتر کھول رکھا تھا۔ مسز ملک سوچتیں، چلو اچھا ہے، کرایہ تو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ہمارے نام جمع ہو جاتا ہے۔ اگر سرکار کرایے پر نہ لیتی تو کبھی کوئی، کبھی دوسرا کرایہ دار ہوتا۔ کسی کا یہ نخرا، کسی کا وہ کون کرایہ داروں کی فرمائشیں پوری کرتا رہتا۔

یوں تبادلوں کے چکر میں مسز ملک کی ساس چل بسیں، بوڑھی عمر تھی اور کتنی دیر انتظار کرتیں! مسز ملک نے بیٹی بیاہ دی۔ اب بیٹے کا بیاہ رچانا تھا۔ ادھر شوہر کے ریٹائر ہونے کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ریٹائر ہونے سے کچھ دن پہلے وہ بیٹے کا بیاہ بھی کر ڈالیں گے۔ نوکری کے دوران بیاہ رچانے میں سو طرح کی مدد مل جاتی ہے۔

بیٹے کا بیاہ ہو گیا۔ گھر میں بہو آ گئی اور پھر مسٹر ملک ریٹائر ہو گئے۔ لیکن دہلی والا مکان سرکار نے ابھی تک خالی نہیں کیا تھا۔

مسٹر اور مسز ملک اپنے بہو اور بیٹے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ دہلی میں ہی بیٹا ملازم تھا۔ یہ عجیب بات ہی تھی کہ مالک مکان خود کرایے کے گھر میں رہ رہے تھے۔ ان کا اپنا گھر اب تک سرکار نے سنبھالا ہوا تھا۔ مسٹر ملک سرکار سے عرضی پرچے کرتے ہار گئے۔ پھر ایک دن ان کا آخری وقت بھی آ گیا۔

ابھی مسٹر ملک کی موت کو تین ماہ نہیں ہوئے تھے کہ ان کا گھر خالی کر دیا گیا۔

مسز ملک کی فیشن ایبل بہو اپنے گھر میں جانے کے لیے اپنی ساس سے بھی زیادہ بے تاب تھی۔ ادھر مکان خالی ہوا، ادھر اس نے اپنا سامان ڈھونا شروع کر دیا۔ ایک دن، دو دن، تین دن ٹھیلے آتے جاتے رہے۔ بازار سے نیا فرنیچر پہنچتا رہا۔ مسز ملک کی بہو سارا سارا دن مکان میں جا کر صفائی کراتی اور گھر سجاتی رہتی۔

سوموار کی صبح انہیں اپنے گھر منتقل ہونا تھا۔ اس دن سو کر

اٹھے تو باہر بارش ہو رہی تھی۔ مسز ملک کی بہو، بیٹا اور خود وہ انتظار کرتے رہے کہ بارش اب رکتی ہے لیکن پانی مسلسل پڑتا رہا۔ فیصلہ ہوا کہ شام کو اپنے گھر میں منتقل ہوں گے۔ لیکن شام کو بھی بارش جاری تھی۔ مسز ملک بار بار کہتیں کہ مہورت آج کا نکلا ہے، کسی طرح آج اپنے گھر میں پہنچ جانا چاہیے۔ پھر ماں جی کا کہنا مان کر بہو بیٹا بارش ہی میں چل دیے۔ جو سامان باقی رہ گیا تھا وہ پھر ڈھویا جا سکتا ہے۔ اپنی ایک کار تھی، ایک ٹیکسی منگوا لی گئی۔

چھم چھم مینہ پڑ رہا تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی مسز ملک یادوں کے جھرمٹ میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ ارمان یاد آنے لگے جن کے جلو میں انہوں نے اپنا گھر بنوایا تھا۔ وہ دن...... ہائے وہ دن بھی کیسے تھے۔ سارا سارا دن وہ دھوپ میں کھڑی مزدوروں کو کام کرتے دیکھتی رہتیں اور کیا مجال کہ انہیں ذرا برابر بھی تھکاوٹ محسوس ہو۔ آرکیٹیکٹ نے گھر کا رنگین نقشہ بنایا تھا تا کہ معلوم ہو سکے گھر تیار ہو کر کیسا لگے گا۔ نقشے میں برآمدے میں ایک عورت کھڑی تھی۔ بے حد خوبصورت، جیسے کوئی پری ہو۔

اس دن رات کو سونے کے لیے لیٹی مسز ملک کو یوں لگا جیسے آرکیٹیکٹ نے نقشے میں وہ تصویر انہی کی بنائی تھی۔ پھر کئی دن بار بار وہ سنگھار میز کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتیں اور بار بار اس تصویر کو دیکھتیں۔ اب مسز ملک نے سوچا کہ وہ تصویر اپنی بہو کو دکھائیں گی۔

ان کی بہو اگلی سیٹ پر شوہر کے ساتھ بیٹھی ہینڈ بیگ سے شیشہ نکال لپ سٹک سے ہونٹ رنگ رہی تھی۔ آخر اپنے گھر ہی تو جا رہے ہیں، باہر اتنا پانی پڑ رہا تھا۔ اوپر سے رات ہو رہی تھی۔ لیکن یہ آج کل کی لڑکیاں تو، توبہ توبہ کیسے گٹ مٹ گٹ مٹ انگریزی میں باتیں کرتی ہیں۔

مسز ملک سے بس ایک انگریزی نہیں سیکھی گئی اور سب کچھ انہوں نے کیا تھا۔ رقص بھی انہوں نے سیکھا۔ اپنے شوہر کے ساتھ بھی، پرائے مردوں کے ساتھ بھی وہ ناچی تھیں۔

لیکن ان کی بہو تو ان سے دس قدم آگے تھی۔ مسز ملک کو لگا، آرکیٹیکٹ کے رنگین نقشے میں وہ بے حد خوبصورت لڑکی کہیں ان کی بہو تو نہیں؟ نہیں نہیں، ان کی بہو کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ تو تب تک کسی کے سپنے میں بھی نہیں تھی۔ تب تو ان کا بیٹا ابھی سکول میں پڑھتا تھا۔ تربوزی رنگ کی ساڑھی جو ان کی بہو نے آج باندھی ہوئی تھی، وہی رنگ تو تھا شاید نقشے والی لڑکی کا! ہاں، تربوزی رنگ ہی تھا۔ یہ تربوزی رنگ مسز ملک کو کبھی اچھا نہیں لگا۔ اتنا بھڑکیلا رنگ جیسے کسی کو آگ لگی ہو۔ آگ تو لگی ہوئی تھی اس زمانے کو......!

”تربوزی رنگ کی ساڑھی پہن سکتی ہے“، مسز ملک نے سوچا، لیکن میں تو تب مانوں جب یہ میرے جیسی محنت کر سکے۔ جیسے میں نے گھر بنایا تھا اس کی عمر میں۔ ایک ایک اینٹ اپنے سامنے لگوائی۔ چاہے دھوپ ہو یا بارش، میں کبھی نہ ہلی تھی چنائی کی دیوار سے۔ کئی بار اینٹیں اٹھا اٹھا کر مستریوں کو پکڑاتی رہی۔ ربڑ کا پائپ اٹھا کر خود سیمنٹ کی دیواروں پر چھڑکاؤ کرتی رہتی۔ میں نے تو کوئی بار ریت تک چھانی۔

کار کوٹھی پر جا رکی۔ آنکھ جھپکنے کی دیر میں مسز ملک کی بہو کود کر برآمدے میں جا کھڑی ہوئی۔ ٹھیک وہیں کھمبے کے ساتھ لگ کر جیسے نقشے میں لڑکی کھڑی تھی۔ مسز ملک کے کلیجے میں جیسے چھری چل گئی۔ شاید آرکیٹیکٹ نے ان کے ساتھ چھل کیا تھا، دھوکا کیا تھا۔

تربوزی رنگ کے ساتھ اپنے موٹے بھاری جوڑے کو ڈھانپتی بہو ٹیکسی سے سامان اتروا رہی تھی۔ تمام سامان نکل گیا۔ ٹیکسی والا پیسے لے کر چلا گیا۔ مسز ملک یوں کار میں بیٹھی تھیں جیسے کوئی دلدل میں نیچے ہی نیچے دھنستا چلا جا رہا ہو۔ پھر ان کا بیٹا کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ بہو چلی گئی اور نوکر بھی۔ ہر

کمرے میں بتیاں جل اٹھیں۔ مسز ملک کار میں یوں بیٹھی تھیں جیسے ان کا انگ انگ کمزور اور بے جان ہو گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھیں۔

ایک گھنٹہ، دو گھنٹہ گزر گئے اور پھر جیسے گھر والوں کو یاد آیا۔

''ارے ماں جی۔'' ان کا بیٹا گھبرایا ہوا لپکا۔ اس نے موٹر کا دروازہ کھول کر ماں کو باہر نکال لیا۔

''بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی تھی۔'' انہوں نے جھوٹ بولا۔

مسز ملک کا بیٹا ہنستا ہوا اپنی ماں کو کوٹھی میں لے چلا۔ ان کی بہو بھی باہر آ گئی۔ برآمدے میں کھڑی ہنس رہی تھی۔ تربوزی رنگ کی ساڑھی کا پلو اس کے موٹے بھاری جوڑے کو ڈھک رہا تھا۔

''مجھے کچھ کھانا پینا نہیں، اب میں لیٹوں گی۔'' مسز ملک نے بہو سے کہا۔ کھانا میز پر لگ چکا تھا۔ کھانے کی میز پر ہی تو انہیں ماں جی کی یاد آئی تھی۔

''تو پھر اپنے کمرے میں آرام کر لیں۔'' بہو نے ۱۰x۷ کے اس کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بیٹا ماں کا بازو پکڑے انہیں کمرے کی چارپائی پر لٹا آیا۔

''میرا مطلب ہے، یہ کمرا ماں جی کا ہو جائے گا۔ پھر سٹور بنا لیں گے۔'' چارپائی پر لیٹے لیٹے بار بار مسز ملک کے کانوں میں یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

مسز ملک نے خود کو دلاسا دینے کی خاطر سوچا، اب کون سا مجھے بیٹھے رہنا تھا۔ ان کا سرتاج چل دیا تھا، جس کے ساتھ لاکھ بار انہوں نے ایک ساتھ جینے، ایک ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ ارمان بھی ایک ایک کر کے پورے ہو چکے تھے۔

''میرا مطلب ہے یہ کمرا ماں جی کا ہو جائے گا، پھر سٹور بنا لیں گے۔'' مگر بار بار ان کے کانوں میں پڑتی آواز اونچی ہو رہی تھی۔

حیثیت

حضرت عمر مخزومیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے اعلان کروایا:

''مسجد میں جمع ہو جائیں۔ ضروری بات کرنی ہے۔''

جب لوگ کثرت سے جمع ہو گئے تو حضرت عمرؓ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد فرمایا:

''اے لوگو! میری چند خالائیں تھیں، جو قبیلہ بنو مخزوم کی تھیں۔ میں ان کے جانور چرایا کرتا تھا۔ وہ مجھے مٹھی بھر کشمش اور کھجور دے دیا کرتی تھیں۔ میں اس پر سارا دن گزارہ کرتا تھا اور یہ بہت ہی اچھا دن ہوتا تھا، پھر حضرت عمرؓ منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان سے کہا۔ ''اے امیرالمومنین! آپ نے اور تو کوئی خاص بات کہی نہیں، بس اپنا عیب ہی بیان کیا۔''

حضرت عمرؓ نے کہا ''اے عبدالرحمٰن بن عوف! تیرا بھلا ہو۔ میں تنہائی میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرے نفس نے مجھ سے کہا، تو امیرالمومنین ہے۔ تجھ سے افضل کون ہو سکتا ہے؟ تو میں نے چاہا کہ اپنے نفس کو اس کی حیثیت بتا دوں۔''

مسز ملک کو خیال آیا، ہاں میرا ایک ارمان باقی ہے۔ مر تو نہیں جانا ہے۔ کاش مرنے کے بعد وہ یہ دیکھ سکیں کہ ان کی بہو اس کمرے کو سٹور بنائے گی یا نہیں۔

''اور تو سب کچھ ہے، ایک سٹور نہیں ہے اس گھر میں۔'' کھانے کی میز پر بیٹھی بہو کی آواز آئی۔

مسز ملک نے سنا تو انہیں لگا جیسے دل کی حرکت بند ہو گئی ہو۔ ایک جھٹکا سا انہیں محسوس ہوا اور پھر ان کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔



ققنس

شوکت علی ملک

لافانی زندگی کی علامت ایک پُراسرار پرندے کا دلچسپ ماجرا

عجیب و غریب پرندہ ایشیا کی پہاڑیوں میں ملتا ہے۔ نر ہوتا ہے نہ مادہ۔ سارے جنگل میں ایک ہی ہوتا ہے۔ اس کی لمبی چونچ میں ہزاروں سوراخ ہوتے ہیں۔ جب ستی میں آ کر راگ الاپے تو تمام پرندے اس کے گرد جھرمٹ نا لیتے ہیں اور ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے لیکن کوا ر گدھ اس کے پاس نہیں جاتے۔

''جب اس نے دنیا سے کوچ کرنا ہو، تو خوشبودار لکڑیاں اکٹھی کرتا اور پھر ان کے درمیان بیٹھ کر خوشی سے اپنا راگ الاپتا ہے۔ راگ کی تاثیر سے لکڑی کو آگ لگ جاتی ہے اور پرندہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ جلی راکھ ایک انڈے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر اس میں سے ایک بچہ بن کر اڑ جاتا ہے، گویا ایک اور ققنس جنم لیتا ہے'' (مقالات حکمت، جلد دوم از

صوفی برکت علی)

ققنس (PHOENIX) کا وجود ہے یا نہیں یہ دلچسپ بحث عرصہ دراز سے چلی آرہی ہے۔ اس پرندے سے وابستہ قدیم روایات مصریوں اور اشوریوں کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ دستیاب معلومات کے مطابق قدیم مصری دیو مالا میں اس کا نام بینو (Bennu) تھا۔ وہ مصر میں متبرک حیثیت رکھتا تھا کیونکہ مصری اسے اپنے دیوتاؤں کی اولاد سمجھتے تھے۔

مصری روایات کے مطابق ققنس مصر میں ہر پانچ سو سال بعد ظاہر ہوتا۔ وہ اندرون عرب کسی جگہ جنم لیتا اور پھر وہاں سے اڑتا ہوا ہیلیو پولس (Heliopolis) شہر کے مندر پہنچ جاتا۔ وہ اپنے ساتھ مردہ ققنس کے جسم کی راکھ انڈے کی شکل میں لاتا جو بیروزہ (لاکھ) کے غلاف میں لپٹی ہوتی۔ وہ نہایت عقیدت واحترام سے اسے دفن کر دیتا۔ (قدیم مصری شہر ہیلیو پولس میں مصریوں کے سب سے بڑے دیوتا، را کا مندر تھا)۔

مصری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ققنس سنہرے رنگ کے بڑے باز یا بگلے سے ملتا جلتا تھا۔ قدیم یونانی مؤرخ، ہیرو ڈوٹس اور فلسفی پلوٹارک کے نزدیک یہ افسانوی پرندہ غیر معمولی شان وشوکت اور طویل العمری کا نشان ہے۔ ان کے مطابق اس کا وطن ایتھوپیا ہے۔ یہ پرندہ دوبارہ جنم لینے (حیات بعد الموت) اور غیر فانی زندگی رکھنے والی صلاحیتوں اور قوتوں کا مظہر ہے۔

عربوں کا عقیدہ تھا کہ یہ صرف کوہ قاف پر ہی بسیرا کرتا ہے جو ان کے نزدیک دنیا کا مرکز تھا۔ چین میں اسے خوف و دہشت کی علامت ''ڈریگن'' کے مقابلے میں خوشی اور مسرت کا استعارہ سمجھا جاتا۔ مسلمان مؤرخ الجیلی کے نزدیک ققنس کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ محض ایک علامت ہے، جس کا مطلب ہے ''ایک ایسی چیز جس کا ادراک عقل وفہم نہ کر سکے۔''

روایت ہے کہ دنیا میں ایک وقت میں ایک ہی ققنس ہوتا ہے۔ اس کا گھر جنت کا نمونہ ہوتا ہے۔ ایک ہزار سال بعد ققنس اپنی طویل عمری کے بوجھ سے تنگ آکر موت کو گلے لگالیتا ہے۔

وہ پھر برما کے جنگلوں سے اڑتا، منطقہ حارہ کے علاقے عبور کرتا خوشبودار درختوں کے جھنڈ میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہ خوشبودار جڑی بوٹیوں کا ایک گٹھا تیار کرتا ہے۔ پھر کھجور کے درخت کی چوٹی پر گھونسلا بناتا اور اس پر بیٹھ کر سورج دیوتا کے ظہور کا انتظار کرتا ہے جو اس کی موت کا پیغامبر بن کر طلوع ہوتا ہے۔

جونہی صبح ہو، ققنس سورج کی طرف منہ کر کے گھونسلے میں بیٹھتا اور منہ کھول کر مسحور کن نغمہ الاپنے لگتا۔ وہ اتنا دلکش اور شیریں ہوتا کہ سورج دیوتا بھی، جو اپنے دو گھوڑوں والے رتھ میں سوار ہو کر گزر رہا ہوتا، اس کا خوش کن راگ سننے رک جاتا۔

روایات کے مطابق ققنس کا یہ دل پذیر راگ سننے کے بعد سورج دیوتا رتھ کے گھوڑوں کو ایک چابک رسید کرتا جس سے وہ بگٹٹ بھاگنے لگتے۔ تب ان کے سموں سے آگ کی چنگاریاں نکل کر ققنس کے گھونسلے کو آگ لگا دیتیں۔ یوں اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے کے مصداق ققنس کی پانچ سو تا ایک ہزار سالہ زندگی شعلے برساتی آگ میں بھسم ہو کر اپنے اختتام کو پہنچتی۔ کچھ عرصہ بعد اس راکھ میں ایک ننھا سا کیڑا حرکت کرتا ہوا دکھائی دیتا۔ تین دن کے اندر وہ مخلوق ایک نئے ققنس کا روپ دھار لیتی۔

قدیم مؤرخین ہیروڈوٹس اور پلنی کا اتفاق ہے کہ ققنس اور باز کی جسامت برابر ہے۔ ققنس کا جسم چمکدار اور گہرے سرخ رنگ کے پروں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ لمبی دم کے پر نیلے اور سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ سر کے ابروں کا رنگ سرخ اور گردن کے اوپر سنہری، کنڈل اور سر کے پچھلی طرف پروں کا سخت گچھا ہوتا ہے۔ یہ پہلو اکثر مؤرخین کی نظر سے اوجھل رہا ہے۔

یہ پرندہ کیا کھاتا ہے کسی کو علم نہیں۔ کچھ مصنف لکھتے ہیں کہ یہ ماحول (فضا) کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ وقفے وقفے سے کچھ کھاتا ہے لیکن انسان کی موجودگی میں نہیں۔ فلسفیوں کا قول ہے ''ققنس کا وجود روحانی طور پر جنم لینے کی زندہ علامت ہے۔ نیز یہ اپنی ہیئت تبدیل کرنے اور تخلیقی صلاحیتوں کو حیات نو بخشنے کا بھی مظہر ہے۔''

مسلم عقائد ونظریات میں ققنس کا مترادف ''عنقا'' ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا پراسرار پرندہ ہے۔ اس کی شکل وصورت سیمرغ یا بگلے سے ملتی جلتی ہے۔ اسے شروع میں خدا نے کمال فضیلت سے پیدا کیا لیکن رفتہ رفتہ وہ زمین والوں کے لیے عذاب جان بنا لہٰذا اسے نیست ونابود کر دیا گیا۔

''فرہنگ آصفیہ'' مرتبہ مولوی سید احمد دہلوی میں ققنس کے متعلق درج ہے: ''یہ ایک خوش رنگ اور خوش آواز پرندہ ہے۔ اہل لغات کا بیان ہے کہ اس کی چونچ میں تین سو ساٹھ سوراخ ہوتے ہیں۔ ہر ایک سے ایک راگ نکلتا ہے۔ جب اسے بھوک لگے، تو کسی بلند پہاڑ کی طرف منہ کر کے بیٹھتا اور راگ نکالتا ہے۔ اس کی آواز پر فریفتہ ہو کر کئی پرندے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یہ پھر ان میں سے دو چار کو پکڑ کر چٹ کر جاتا ہے۔ جب مرنے کا وقت آئے، تو سوکھی لکڑیاں جمع کرتا، اُن پر بیٹھ کر مستی کے عالم میں گاتا اور پھر پھڑ پھڑاتا ہے۔ جیسے ہی دیپک راگ اس کی چونچ سے نکلے، تو لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور یہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ خدا کی قدرت سے اس راکھ پر مینہ برستا ہے اور پھر اس میں ایک انڈا از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ کچھ مدت بعد پھر اس سے ققنس جنم لیتا ہے۔ فارسی کے شعرا اسے ''آتش زن'' کہتے اور اسے اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حکماء نے علم موسیقی اسی سے حاصل کیا۔ اس لیے اسے موسیقار بھی کہا جاتا ہے۔''

''لغاتِ کشوری'' مرتبہ مولوی سید تصدق حسین رضوی میں درج ہے: ''یہ یونانی لفظ قوقنوس کا مخفف ہے۔ یہ ایک پرندے کا نام ہے جس کی رنگ برنگ آوازوں سے علم موسیقی نے جنم لیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی عمر ہزار برس ہوتی ہے اور یہ مادہ نہیں رکھتا۔''

یہودیوں میں پائی جانے والی روایات میں ققنس کا نام ''مل چم'' (Milchem) لکھا گیا ہے۔ ان کے مطابق جب اماں حوا نے شجر ممنوعہ غلطی سے کھالیا تو ان کا نفس آزاد ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے دوسری مخلوق کو بھی شجر ممنوعہ کھانے اور شریک خطا ہونے پر آمادہ کر لیا ماسوائے ققنس کے... جو اس ترغیب سے مبرا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اسے ایک احاطہ بند شہر عنایت فرمایا۔ ہر ہزار سال گزرنے کے بعد یہ پرندہ آگ میں خاکستر ہو کر راکھ سے وجود میں آنے والے انڈے کے ذریعے دوبارہ جنم لیتا ہے۔ دوسری روایت کے مطابق ''موت کا فرشتہ اسے چھو نہیں سکتا''۔

رومیوں کے نظریے کے مطابق یہ ایسا نوکھا پرندہ ہے جو خود کو دوبارہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ پھل پھول نہیں بلکہ ایک خوشبودار گوند جیسا مادہ کھاتا ہے۔ قدیم چینی روایات کی رو سے ققنس دیوتاؤں کا خاص پرندہ ہے۔ یہ ملاپ کا چینی دیوتا ہے جو اپنی چونچ میں مربع شکل کا مرغولہ (Scroll) اٹھائے ہوتا ہے۔ اس کے گانے میں روایتی چینی سرگم کے پانچوں سر شامل ہوتے ہیں۔ یہ صرف امن وعافیت اور خوشحالی وفارغ البالی کے دور میں ظاہر ہوتا ہے۔ بدحالی اور جنگ کے زمانے میں خود کو نظروں سے اوجھل کر لیتا ہے۔

شمالی امریکا کے سرخ ہندی قبائل کی رو سے اس پرندے کا نام ''گرج چمک لانے والا پرندہ'' (thunder bird) ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس پرندے کے اندر کوئی طاقتور روح پوشیدہ ہے، اسی لیے اس کی چونچ سے بجلی چمکتی اور پر پھڑ پھڑانے سے گرج پیدا ہوتی ہے۔ ققنس بطور یادگاری نشان، کینیڈا اور امریکا کے چٹانی پتھروں پر کندہ ہے۔ اسی طرح کی یادگاری علامات براعظم ایشیا، افریقا اور یورپ میں بھی دیکھی گئی ہیں۔ بنیادی طور پر ققنس کو حیات بعد الموت، لافانی اور مصیبت وبدحالی کو فتح میں بدلنے والے پرندے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہم یہ قضیہ سمیٹتے ہوئے مرزا غالب کے اس شعر پر بات ختم کرتے ہیں:

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا

●●●



کسٹمز کی قطار میں میرے آگے کھڑی لڑکی خاصی خوبصورت تھی۔ جلد کی رنگت تانبے کے مانند تھی۔ چہرے کے خدوخال انتہائی دلکش تھے۔ سُتواں ناک کی نوک پر دھوپ کی تمازت سے چڑھا ہوا میک اپ اترنے لگا تھا۔ قطار میں کھڑے ہوئے میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ طیارے میں سوار ہونے کے بعد میں اُس کے قریب بیٹھنے کی کوشش کروں گا۔

قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ طیارے پر چڑھنے کے بعد دیکھا کہ کھڑکیوں کے قریب کی تمام نشستیں سوائے ایک کے گھر چکی ہیں۔ جب اس لڑکی نے وہ سیٹ اپنے لیے منتخب کرلی تو میرے لیے فطری سی بات تھی کہ اس کے برابر بیٹھ جاؤں۔ چونکہ عام طور پر مسافر کنارے کی نشست پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے، اس لیے یہ توقع بہت کم تھی کہ کوئی اُس کی اور میری تنہائی میں دخل انداز ہوگا۔ میں نے فوراً ہی بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہوائی جہاز پرواز کرے تو میں کچھ نروس ہوجاتا ہوں۔ البتہ جب طیارہ فضا میں بلند ہوگیا اور طیارے کی میزبان لڑکی مسافروں کو خوش آمدید کہہ چکی تو میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہیلو ہم سفر۔" میں نے کہا۔ "مجھے البرٹ شیلٹن کہتے ہیں۔"

اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ مگر گہری نظر سے جائزہ لینے کے بعد غالباً اس نتیجے پر پہنچی کہ میں ایک شریف اور بے ضرر انسان ہوں۔

"کیسے مزاج ہیں البرٹ۔" اُس نے جواب دیا۔ "میرا نام ڈائنا وارٹن ہے۔"

"کیوں نہ ہم ذاتی نوعیت کی معلومات سے پہلے فارغ ہوجائیں۔" میں بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میں طیارے کے سفر کے دوران عموماً اپنے ہم سفر سے باتیں کرنے کا عادی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور گزشتہ تجربات کی روشنی میں میرا اندازہ ہے کہ دوران گفتگو بہت سی باتیں اپنے متعلق بیان کروں گا اور بہت سی باتیں تمھارے

بارے میں سننے کو ملیں گی۔ چنانچہ اگر ہم یہ باتیں پہلے کرلیں تو دوسرے دلچسپ موضوعات کے لیے زیادہ وقت بچا سکیں گے۔ میری عمر پچیس سال ہے۔ کنوارا ہوں۔ دو ماہ قبل میں نے یو۔ سی۔ ایل۔ اے سے گریجوایشن کیا ہے۔ اتنی دیر سے تعلیم مکمل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اٹھارہ سال سے اکیس سال کی عمر تک میں فوج میں تھا۔ اس وقت میں بفیلو جارہا ہوں تاکہ ایلپٹن ڈٹکٹیو ایجنسی میں اپنی ڈیوٹی جوائن کرسکوں۔ اتفاق سے یہ ایجنسی میرے ماموں کی ملکیت ہے۔ ان کا نام فریڈ ایلپٹن ہے۔ چونکہ تم خود بھی بفیلو کی رہنے والی ہو، اس لیے ممکن ہے تم نے ان کا نام سنا ہو۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے چونک کر دیکھا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں بفیلو کی رہنے والی ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"معمولی بات ہے مائی ڈیئر وارٹن۔" میں نے جواب دیا۔ "جب تم قطار میں میرے آگے کھڑی تھیں تو گیٹ پر ٹکٹ دکھاتے وقت میں نے تمھارے کندھے پر سے جھانک کر دیکھا تھا۔ تمھارا واپسی ٹکٹ تھا اور بفیلو سے جاری کیا گیا تھا۔"

"بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو۔" اس نے شوخ نگاہوں سے مسکراتے ہوئے کہا "بالکل شرلاک ہومز کی طرح۔ مگر ظاہر ہے، کہ جب تم ایک سراغ رساں ایجنسی میں ملازمت کرنے جارہے ہو تو تم سے ایسی ہی باتوں کی توقع کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اپنی ڈگری بھی شاید کرمنالوجی میں حاصل کی ہوگی۔"

"جی نہیں میرا مضمون فلسفہ تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں نے جو کچھ بتایا وہ بہت ہی معمولی باتیں ہیں جو کوئی بھی شخص ذرا سی توجہ اور مشاہدے سے بتا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اب ایک آخری انکشاف اور۔ تم نے بفیلو یونیورسٹی سے ایک سال قبل بی اے کیا ہے اور غالباً نرسنگ میں۔"

"مگر چونکہ آج کل ہماری سوسائٹی میں فلسفیوں کی زیادہ کھپت نہیں اس لیے بدرجہ مجبوری میں نے اپنے ماموں کی پیشکش منظور کرلی۔ ویسے اس میدان میں بھی فلسفہ خاصی مدد کرسکتا ہے۔"

"میں تمھارے اس اندازے سے بہت متاثر ہوئی ہوں جو تم نے میرے بفیلو کی باشندہ ہونے کے بارے میں لگایا۔" ڈائنا بولی۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری قوت مشاہدہ کافی تیز ہے۔ کیا تم میرے متعلق کچھ اور باتیں بتا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "مثلاً میں بتا سکتا ہوں کہ تم جنوبی کیلیفورنیا صرف تفریح کرنے آئی تھیں۔"

"اوہ! یہ بات تمھیں کیسے معلوم ہوئی؟"

"تین وجوہ سے۔" میں نے جواب دیا۔ "پہلی بات تو یہ کہ اگر تم کام کی تلاش میں یہاں مستقل قیام کے خیال سے آئی ہوتیں تو واپسی کا ٹکٹ نہ خریدا ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگست عموماً تفریح کا مہینا سمجھا جاتا ہے۔ تیسرا نکتہ یہ کہ تمھاری رنگت ظاہر کرتی ہے کہ تم نے خاصا وقت ساحل سمندر پر دھوپ میں لیٹے یا بیٹھے ہوئے گزارہ ہے۔ ایسا کوئی سیر و تفریح کے لیے آنے والا ہی کرسکتا ہے۔"

"بہت خوب۔" اس نے دلچسپی سے کہا "کچھ اور بتاؤ۔"

"ضرور۔" میں نے سر ہلایا۔ "یہاں تم اپنے منگیتر سے بھی ملنے آئی تھیں مگر روانگی سے کچھ قبل تم نے اپنی منگنی توڑ دی۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم میرا پیچھا کرتے رہے ہو۔" اُس نے مشکوک نظروں سے مجھے گھورا۔

''ہرگز نہیں۔ میں نے آج سے پہلے تمھیں دیکھا تک نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ بات کہ تم نے اپنی منگنی توڑ دی ہے، مجھے اس طرح معلوم ہوئی کہ تمھارے الٹے ہاتھ کی اس انگلی پر جس میں منگنی کا چھلا پہنا جاتا ہے، سفید داغ موجود ہے جس کی گولائی اور موٹائی بالکل منگنی کے چھلے کی طرح ہے۔ اس جگہ جلد کی سفیدی ظاہر کرتی ہے کہ اگر تم نے چھلا پہلے اتارا ہوتا تو یہ جگہ بھی تانبے کی رنگت اختیار کر لیتی۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ اسے تم نے روانگی سے کچھ دیر قبل ہی اتارا ہے۔''

ڈائنا نے ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''تمھاری وضاحت کے بعد بات کتنی آسان معلوم ہوتی ہے۔'' اس نے کہا ''کوئی اور انکشاف بھی کرو گے یا بس۔''

''میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ تمھارا منگیتر یا تو یو۔ سی۔ ایل۔ اے۔ میں کرمنالوجی کی تعلیم حاصل کر رہا ہے یا پھر اسی نوعیت کا کوئی مضمون وہاں پڑھتا ہے۔''

''بہت خوب۔ یہ اندازہ تم نے کس بات سے لگایا؟''

''تمھاری اس بات سے کہ تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں نے کرمنالوجی کے مضمون میں ڈگری حاصل کی ہے۔'' میں نے بتایا ''بفیلو میں رہتے ہوئے تمھیں یہ بات کس طرح معلوم ہو سکتی تھی کہ یو۔ سی۔ ایل۔ اے میں یہ مضمون بھی پڑھایا جاتا ہے۔ سوائے اس صورت کے کہ یا تو تمھارا قریبی تعلق وہاں کے کسی طالب علم سے ہو یا پروفیسر سے۔''

''بہت خوب۔ تم تو واقعی بہت ہوشیار اور ذہین آدمی ہو۔''

''میں نے جو کچھ بتایا وہ بہت ہی معمولی باتیں ہیں جو کوئی بھی شخص ذرا سی توجہ اور مشاہدے سے بتا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب ایک آخری انکشاف اور۔ تم نے بفیلو یونیورسٹی سے ایک سال قبل بی اے کیا ہے اور غالباً نرسنگ میں۔''

''اور شاید اس کی وضاحت بھی دوسری باتوں کی طرح بالکل سادہ اور عام ہو گی، کیوں؟'' اس نے طنز کیا۔

''نہیں، اس کا تعلق میرے ذاتی تجربے سے زیادہ ہے۔'' میں بولا۔ ''فوج میں ملازمت کے آخری سال میری ملاقات ایک نرس سے ہوئی تھی جس نے بفیلو یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ اُس نے اپنے سیدھے ہاتھ میں جس طرح کی کلاس انگوٹھی پہنی ہوئی تھی، بالکل اسی طرح کی انگوٹھی تم نے اپنے سیدھے ہاتھ میں پہن رکھی ہے۔ جہاں تک سال کا تعلق ہے تو وہ تمھاری انگوٹھی پر اتنا واضح طور پر کھدا ہوا ہے کہ میرے لیے پڑھنا کچھ مشکل نہیں تھا۔''

''تم واقعی بہت حیرت انگیز آدمی ہو۔'' ڈائنا نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

اگرچہ وہ مجھے رفتہ رفتہ اتنا ہی پسند کرتی جا رہی تھی جتنا میں اُسے لیکن اُس نے ازخود اپنی ذات کے بارے میں کوئی بات نہیں بتائی۔ گفتگو ان نتائج سے آگے نہیں بڑھی جو میں نے اپنے مشاہدے سے اخذ کیے تھے۔ مثال کے طور پر اس نے اپنے سابقہ منگیتر کے بارے میں کچھ کہا اور نہ ہی وضاحت کی کہ اُن کی منگنی کیوں ٹوٹ گئی تھی میں نے بھی مزید کریدنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ البتہ اُس نے یہ ضرور بتایا کہ بفیلو میں اس کا گھر فلمور کے علاقے میں واقع ہے۔ اتنا ہی نہیں اُس نے اپنا فون نمبر بھی بتا دیا۔

ہم لاس اینجلس سے گیارہ بج کر پچاس منٹ پر روانہ ہوئے تھے۔ جب پانچ بج کر پچاس منٹ پر طیارہ ڈیٹورٹ پہنچا تو ہم گہرے دوست بن چکے تھے۔ ڈیٹورٹ سے پرواز کے تھوڑی دیر بعد میں ٹوائلٹ سے واپس لوٹ رہا تھا تو میں نے پچھلی سیٹ پر دو آدمیوں کو دیکھا جنھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں سے باندھ رکھا تھا۔ دونوں کی عمر پینتالیس پچاس سال کے درمیان معلوم ہوتی تھی۔ یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا کہ ان دونوں میں پولیس افسر کون ہے اور مجرم کون۔

کنارے کی سیٹ والا شخص لازمی پولیس افسر تھا کیونکہ اس نے ہتھکڑی اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی میں پہن رکھی تھی۔ دوسرے شخص کا سیدھا ہاتھ جکڑا ہوا تھا۔ وہ پولیس افسر بہت دبلا اور لمبا سا آدمی تھا اور کسی حد تک ابراہم لنکن سے مشابہہ نظر آرہا تھا۔ دوسرا آدمی بھی لمبا تھا مگر اس کا جسم بھاری تھا۔ چہرے پر گوشت اور جلد تانبہ کی رنگت کی تھی۔

طیارے کی میزبان مسافروں سے کھانے کے آرڈر لے رہی تھی۔ میں نے سنا کہ ان دونوں نے اپنے کھانے کے ساتھ کافی کا آرڈر بھی دیا۔ ہم نے سوئس اسٹیک کا آرڈر دیا اور جب میزبان چلی گئی تو میں نے ڈائنا کو ان دونوں مسافروں کے بارے میں بتایا۔

''قیدی کا حلیہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ایسا جو پچاس سال کے کسی بھی شخص پر منطبق ہو سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

اس اثنا میں کھانا آگیا اور ہم دوسری باتیں کرنے لگے۔ کھانے کے بعد جب میزبان برتن جمع کر رہی تھی، پچھلی سیٹ سے کچھ گھبرائی ہوئی آوازوں نے ہمیں گھوم کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ طویل قامت زرد رُو پولیس افسر اپنے ساتھی کے بے حس و حرکت جسم کو اٹھا کر قطار کی درمیانی جگہ میں لٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی کلائی سے ہتھکڑی کھول دی تھی۔ مگر دوسرے آدمی کا ہاتھ ابھی آزاد نہیں ہوا تھا۔ پھر اس نے جھک کر اس کی نبض دیکھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر میزبان بھی لپکی ہوئی آئی۔ پولیس افسر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس پر دل کا دورہ پڑا ہے۔'' وہ بولا ''نبض کی رفتار بے حد سست اور کمزور ہے۔''

ہماری طرح طیارے کے دوسرے مسافر بھی اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان ہی میں سے ایک چھریرے جسم کا آدمی جو بظاہر بڑا شریف نظر آرہا تھا اور جس کی عمر چالیس پینتالیس سال کی معلوم ہو رہی تھی، آگے بڑھا۔

''میں ڈاکٹر ہوں۔'' اُس نے کہا۔

میزبان فوراً ایک طرف ہٹ گئی۔ پولیس افسر نے ڈاکٹر سے اپنا تعارف سارجنٹ کوپلینڈ کے نام سے کروایا۔ ڈاکٹر نے بے ہوش آدمی کی نبض دیکھی۔ پھر اس کے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے میزبان کی طرف دیکھا اور کہا ''میرا بیگ میری سیٹ کے نیچے رکھا ہے، مہربانی کر کے وہ لا دو۔''

''ڈاکٹر نے شیشی کا ڈھکنا کھول کر اسے سونگھا ممکن ہے اس شیشی میں کسی اور طرح کی گولیاں ہوں اور اس نے نیویارک واپس جانے اور اپنی سزا میں مزید بیس سال کے اضافے سے بچنے کے لیے خودکشی کرنی چاہی ہو۔''

میزبان نے جلدی سے بیگ اٹھا دیا۔ ڈاکٹر نے اسے کھول کر اسٹیتھوسکوپ نکالا اور مریض کے دل کی دھڑکن سننے لگا۔

''خوش قسمتی سے طیارہ پر آکسیجن پہنچانے کا انتظام ہے۔'' اس نے میزبان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ہم بفیلو کس وقت پہنچیں گے۔''

''اس وقت سات بجے ہیں۔'' میزبان نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ''طیارہ پونے آٹھ بجے بفیلو اترے گا۔''

''گویا ابھی پینتالیس منٹ باقی ہیں۔'' ڈاکٹر بولا ''میرا مشورہ ہے کہ تم پائلٹ سے کہہ کر ریڈیو کے ذریعے ائیرپورٹ پر پیغام بھجوا دو وہاں ایک ایمبولینس مریض کو سٹی ہسپتال لے جانے کے لیے موجود ہونی چاہیے۔ ایمبولینس کے ساتھ کسی مددگار کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھی سٹی ہسپتال میں کام کرتا

ہوں۔ اس لیے مریض کے ساتھ میں خود جاؤں گا پھر سارجنٹ بھی ہمراہ ہوں گے۔ یہ پیغام دینے کے بعد مجھے ایک کمبل لادو۔ مریض کوگرم رکھنے کی ضرورت ہے۔''

''بہت اچھا ڈاکٹر۔'' میزبان نے جواب دیا اور پائلٹ کے کیبن کی جانب بڑھ گئی۔ڈاکٹر سارجنٹ کی طرف متوجہ ہوا۔

''اسے اٹھا کرسیٹ پرلٹادوتاکہ آکسیجن دی جاسکے۔'' اس نے کہا پھر میری طرف دیکھا اور بولا''طاقتور نوجوان معلوم ہوتے ہو۔ذراسہاراتودو۔''

ہم تینوں نے مل کرمریض کو پشت کے بل سیٹ پرلٹادیا۔ ڈاکٹر نے سیٹ کے ساتھ ہی لگاہوا آکسیجن ماسک نکال کراُس کے منہ پر چڑھادیا اور پھر اپنے آلے سے اس کے دل کی دھڑکن سننے لگا۔

''حالت زیادہ خراب نہیں تو کچھ بہتر بھی نہیں ہے۔'' وہ بولا۔''مناسب ہوگا کہ اس کی ہتھکڑی کھول دی جائے۔''

سارجنٹ نے جیب سے ایک چابی نکال کر ہتھکڑی کھول دی اور پھر دونوں چیزیں اپنی جیب میں رکھ لیں۔

''میرانام مارٹن اسمتھ ہے۔''ڈاکٹر نے بتایا۔

''تم سے مل کرخوشی ہوئی۔'' سارجنٹ نے ہاتھ ملاتے ہوئے جواب دیا۔''خوش قسمتی ہی ہے کہ تم جہاز پر موجود تھے۔''

''میرا نام البرٹ شیلٹن ہے۔'' میں نے ازخود اپنا تعارف کروایا۔ڈاکٹر نے میرے تعاون کاشکریہ ادا کیا۔

''یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے میری سیٹ کی ساتھی ایک نرس ہے۔ضرورت ہوتواس کی مدد بھی مل سکتی ہے۔''

''نہیں سراس کی کوئی ضرورت نہیں۔''ڈاکٹر نے چونک کر مجھے دیکھتے ہوئے کہااور پھر بالمقابل کی نشست کی طرف دیکھا جہاں اس وقت صرف ایک آدمی بیٹھا تھا۔ڈاکٹر نے مریض کے قریب رہنے کاعذر پیش کرتے ہوئے اس سے کسی دوسری سیٹ پر بیٹھنے کی درخواست کی جسے اس نے خوشی سے مان لیا۔

''اب تم چاہوتو کھڑکی کے قریب بیٹھ سکتے ہو۔'' ڈاکٹر نے سارجنٹ سے کہا''تاکہ مریض کی حالت دیکھنے کے لیے مجھے تمھیں باربار پریشان نہ کرنا پڑے۔''

''ضرور۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔''ابھی ابھی ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ ذرا اس کی تصدیق یا تردید کرلوں۔''

پھر مریض پر جھکتے ہوئے سارجنٹ کوپلینڈ نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ آخر کار وہ ایک جیب سے کوئی چھوٹی سی شیشی برآمد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔اس میں کوئی رقیق مادہ بھراہوا تھا۔سارجنٹ نے شیشی ڈاکٹر کے ہاتھ میں دے دی۔ اپنی سیٹ سے اُچک کر دیکھتے ہوئے میں نے اس کا لیبل پڑھا۔ اس پر ایسی شکر کی گولیوں کا نام لکھا ہوا تھا جس میں کیمیاوی عمل سے انتہائی مٹھاس مرتکز کردی جاتی ہے۔

''یہ تو عام گولیاں ہیں۔'' ڈاکٹر بولا''انھیں شکر کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔''

''کھانے کے وقت یہ گولیاں کافی میں ڈالنا چاہتا تھا۔'' سارجنٹ نے بتایا۔''شیشی دیکھنے کے بعد میں نے اجازت دے دی۔ مگر ابھی ابھی مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے اس شیشی میں کسی اور طرح کی گولیاں ہوں اور اس نے نیویارک واپس جانے اور اپنی سزا میں مزید بیس سال کے اضافے سے بچنے کے لیے خودکشی کرنی چاہی ہو۔''

''ہوں۔'' ڈاکٹر نے سوچنے کے انداز میں شیشی کا ڈھکنا کھولا۔ اسے سونگھ کر دیکھا۔''اگر ایسی کوئی بات ہے تو میں یہ شیشی بھی اپنے ساتھ ہسپتال لے جاؤں گا تاکہ وہاں لیبارٹری میں تجزیہ کرکے معلوم کیا جاسکے۔ اس طرح تو کچھ بتانا ممکن نہیں۔ اس نے شیشی اپنی جیب میں ڈال لی۔

''لیکن اگر یہ شخص حراست میں تھا تو اس کے پاس شیشی کہاں سے آگئی؟'' اس نے سوال کیا۔

''دوبارہ گرفتار کیے جانے سے پہلے یہ کئی ہفتہ آزاد رہا ہے۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔''چھ ہفتے قبل یہ سنگ سنگ کے جیل خانے سے فرار ہوگیا تھا اور صرف ایک ہفتہ ہوا کہ اسے ویسٹ کوسٹ پر پکڑا گیا ہے ممکن ہے اس نے یہ سوچ کر کہ دوبارہ گرفتاری سے موت بہتر ہے، کسی وقت یہ شیشی خرید کر ضرورت کے وقت کام آنے کے لیے رکھ چھوڑی ہو۔''

''یہ کس جرم میں سزا کاٹ رہا تھا؟''ڈاکٹر نے پوچھا۔

''اس پر تین درجن سے زیادہ ڈکیتیوں کا الزام ہے۔'' سارجنٹ نے بتایا۔''کیا تم نے ولی دی پیرٹ ڈائل کا نام نہیں سنا۔''

''ہاں کچھ خیال تو آتا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا''مگر یہ تو کئی سال کی بات ہے۔''

''تقریباً بارہ سال کی۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔''یہ ڈوئل نامی گروہ کا سردار تھا۔ گروہ میں آٹھ نو بدمعاش شامل تھے۔ ولی اور دو مجرموں کے علاوہ باقی سب یا تو جیلوں میں ہیں یا مر چکے۔ جو دو باقی ہیں ان میں ایک ولی کا چھوٹا بھائی جم ہے اور دوسرا اس کا کزن ایڈی گرین۔ یہ دونوں مفرور ہیں۔ایڈی گرین تو کبھی پکڑا بھی نہیں گیا۔ چنانچہ پولیس کے پاس اس کا کوئی فوٹو نہیں ہے۔ البتہ جم کا ریکارڈ موجود ہے۔ میں نے اس کا فوٹو بھی دیکھا ہے۔ اس کی صورت ولی سے بہت ملتی ہے۔''

میں پیچھے کھڑا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا۔''ولی کا نام ولی دی پیرٹ کیسے پڑا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ڈاکا مارتے وقت کسی طوطے کی طرح مسلسل ٹراتا رہتا تھا۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔''کبھی بینک کے ملازمین سے باتیں کرتا۔ گاہکوں کو طرح طرح کی ہدایات دیتا اور خواتین سے معذرت طلب کرتا۔ بدصورت عورتوں سے کہتا کہ وہ انتہائی حسین نظر آرہی ہیں۔''

''اور ایڈی گرین۔''

''دراصل وہ ڈاکو سے زیادہ نوسرباز معلوم ہوتا تھا۔'' سارجنٹ نے بتایا۔''اس کے کام کرنے کا طریقہ کچھ ایسا ہی تھا۔ جس بینک میں ڈاکے کا پروگرام ہوتا وہ جا کر اس کے منیجر سے ملاقات کرتا۔ کہتا کہ وہ ایک صنعتکار ہے اور شہر میں اپنی فیکٹری کی برانچ قائم کرنا چاہتا ہے۔ کیا بینک میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ دس لاکھ ڈالر ماہانہ کی تنخواہوں کا انتظام اور حساب کتاب رکھ سکے۔ نتیجے میں منیجر اسے متاثر کرنے کی غرض سے اپنے یہاں کے حفاظتی اور دوسرے انتظامات پوری تفصیل سے اُسے سمجھاتا اور کہتا کہ وہ اس کے بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھولے تو اس کی رقم ہر طرح سے محفوظ رہے گی۔''

''ذرا دونوں کو غور سے دیکھو۔'' میں نے سرگوشی میں کہا''قیدی کی کھال کی رنگت تانبے کی طرح ہے۔ یہ قطعی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ دس سال تک جیل میں رہ چکا۔ اس کے مقابلے میں سارجنٹ کا چہرہ بالکل زرد پڑا ہوا ہے۔''

اس وقت طیارے کی میزبان کمبل لے کر واپس آئی۔

''پائلٹ نے تمھارا پیغام پہنچا دیا ہے۔'' اس نے ڈاکٹر کو بتایا۔''ایمبولینس مقررہ وقت پر ایئر پورٹ آجائے گی۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ڈرائیور کے علاوہ کسی آدمی کی ضرورت نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر نے اظہار خوشنودی کے طور پر سر ہلایا اور کمبل مریض کو اُوڑھا دیا۔

''اب اس کی حالت کیسی ہے؟'' میزبان نے پوچھا۔

”اچھی نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”مگر بہر حال وہ ابھی زندہ ہے۔“

میزبان واپس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے سارجنٹ کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟“ اُس نے پوچھا۔

”یقیناً۔“

”مریض کی حالت ایسی تو نہیں کہ وہ بھاگ سکے۔ پھر وہاں ہسپتال میں بھی قیدیوں کا وارڈ الگ ہوتا ہے۔ صحتیاب ہونے پر بھی وہ وہاں سے فرار نہیں ہو سکتا۔ بہر حال یہ تمھاری مرضی پر منحصر ہے۔“

”میں اپنے قیدی کے ساتھ ہی رہنا پسند کروں گا۔“ سارجنٹ نے جواب دیا۔

”اگر اس کی یہ حالت کسی زہر کے بجائے سچ مچ دل کے دورے کا نتیجہ ہو تو کم سے کم ایک ماہ تک اسے ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ تم اتنی مدت تک تو اس کے ساتھ نہیں رہو گے۔“

”جی نہیں ایسی صورت میں اسے بفیلو پولیس کی نگرانی میں دے کر واپس لوٹ جاؤں گا۔ جب وہ دوبارہ سفر کے قابل ہوا، تو پھر واپس آؤں گا۔“

”ممکن ہے اسے میرے چارج میں ہی دے دیا جائے۔“ ڈاکٹر نے کہا ”اگر تم مجھے اپنا کارڈ دے دو تو میں تمھیں اس کی حالت سے مطلع کرتا رہوں گا۔“

سارجنٹ نے اپنا بٹوہ نکال کر اس کی جیبیں ٹٹولیں۔ ”اتفاق سے اس وقت میرے پاس کوئی کارڈ نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کوئی کاغذ دو تو میں اس پر اپنا نام و پتا لکھ دوں۔“

ڈاکٹر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ہوائی ٹکٹ کا لفافہ برآمد کیا اور سارجنٹ کے ہاتھ میں دے دیا۔ سارجنٹ نے لفافہ اپنے گھٹنے پر رکھا اور قلم نکال کر اس پر لکھنے لگا۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈائنا نے میرے کان میں سرگوشی کی:

”جب تم نے انھیں میری خدمات کی پیش کش کی تو میں ڈر ہی گئی تھی۔“ وہ بولی ”میں رجسٹرڈ نرس نہیں ہوں۔“

”مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ ہو۔“ میں نے اسے تعجّب سے دیکھا۔

”میں نے نہیں تم نے کہا تھا۔“ اس نے جواب دیا ”اور میں نے اس خیال سے اس کی تردید نہیں کی کہ تم اس وقت سراغرسانی کے موڈ میں تھے۔ کہیں میرے انکار سے تمھارے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔“

”اوہ۔“ مجھے کچھ مایوسی ہوئی مگر پھر سنبھل کر بولا ”بہر حال ڈاکٹر نے تمھاری ضرورت نہیں سمجھی۔“

اچانک میرے ذہن میں کوئی خیال ابھرا اور میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔

”کیا بات ہے؟“ ڈائنا نے پوچھا۔

”میں نے ابھی سارجنٹ کوپلینڈ کو قلم سے لکھتے دیکھا ہے۔“ میں نے بتایا ”اور جانتی ہو وہ بائیں ہاتھ سے لکھ رہا تھا۔“

”تو پھر؟“

”تو پھر یہ کہ اس نے قیدی کو اپنے بائیں ہاتھ سے کیوں باندھ رکھا تھا؟“

”ہاں یہ بات ہے تو عجیب سی۔“ ڈائنا کچھ غور کرنے کے بعد بولی۔

”حقیقت یہ ہے۔“ میں بالکل آہستہ بات کر رہا تھا ”کہ ہمارے پاس صرف سارجنٹ کوپلینڈ ہی کا بیان ہے کہ وہ پولیس افسر ہے اور دوسرا شخص ایک مجرم اور اس کا قیدی ہے۔“

”میں سمجھی نہیں تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”ذرا دونوں کو غور سے دیکھو۔“ میں نے سرگوشی میں کہا ”قیدی کی کھال کی رنگت تانبے کی طرح ہے۔ یہ قطعی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ دس سال تک جیل میں رہ چکا۔ اس کے مقابلے میں سارجنٹ کا چہرہ بالکل زرد پڑا ہوا ہے۔“

”وہ چھ ہفتہ قبل جیل سے فرار ہوا تھا۔“ ڈائنا نے جواب دیا۔ ”یہ مدت چہرے کی رنگت دھوپ کی تمازت سے تانبے کی

طرح کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ نیویارک میں رہتے ہیں، ان کے چہرے عام طور پر زرد ہو جاتے ہیں۔“

”جو لوگ دفتروں یا فلیٹوں میں مقیّد رہیں ان کے بے شک ہو جاتے ہوں گے۔“ میں نے کہا ”لیکن ایک پولیس افسر کا چہرہ زرد ہونے کی کوئی وجہ نہیں جسے زیادہ تر باہر رہنا پڑتا ہے۔“

”جو کچھ تم اندازہ لگا رہے ہو اگر وہ درست ہے“ ڈائنا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی ”تو پھر اس پر عمل کرنا اس کے لیے کیسے ممکن ہوا؟“

میں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنے خیالات ترتیب دینے کے لیے تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔

”فرض کرو۔“ آخر میں نے کہا ”کہ دونوں آدمی بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے ہیں۔ اس صورت میں حقیقی سارجنٹ کوپلینڈ قیدی کو اپنے داہنے ہاتھ کے ساتھ جکڑے گا تاکہ اس کا بایاں ہاتھ ضرورت پڑنے پر ریوالور نکالنے کے لیے آزاد رہے۔ میرا اندازہ ہے کہ شیشی میں کسی قسم کا زہر ہے جو ولی نے کسی نہ کسی طرح سارجنٹ کی کافی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد سارجنٹ کے بے ہوش ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اس کے بے ہوش ہوتے ہی اس کا بٹوہ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنا بٹوہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔ اس کا ریوالور کھول کر خود اپنی کمر سے باندھ لیا۔ پھر زہر کی شیشی بھی اس کی جیب میں ڈال دی۔ سارجنٹ کی جیب سے چابی حاصل کر کے اپنے ہاتھ کی ہتھکڑی کھول لی مگر اس کے ہاتھ میں بندھی رہنے دی۔“

> میری توجہ زرد چہرہ والے آدمی پر مرکوز تھی کہ اگر وہ کوئی غلط حرکت کرے تو اسے روکا جا سکے۔
>
> اچانک اس کا سیدھا ہاتھ کوٹ کے اندر غائب ہوا اور پھر باہر نکلا تو اس میں اعشاریہ ۳۸ بور کا سرکاری ریوالور دبا ہوا تھا۔“

”یہ بات تھی تو اس نے خود ہی ڈاکٹر کی توجہ زہر کی شیشی کی طرف مبذول کیوں کروائی۔“ ڈائنا نے اعتراض کیا۔

”اس لیے کہ جب ہسپتال میں مریض کے تفصیلی معائنہ کے بعد یہ ظاہر ہو کہ اس پر دل کا دورہ نہیں پڑا بلکہ اسے زہر دیا گیا ہے تو کوئی اس نام نہاد سارجنٹ پر شبہ نہ کرے کیونکہ وہ پہلے ہی نہ صرف زہر کی شیشی بلکہ اس کے بارے میں ایک ممکن کہانی بھی بیان کر چکا۔ بفیلو میں کوئی سارجنٹ کوپلینڈ کا صورت آشنا نہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اپنے قیدی کو پولیس کی نگرانی میں دے کر اس سے قبل کہ کوئی یہ جان سکے کہ مریض ہی اصل میں سارجنٹ کوپلینڈ ہے، کہیں بھی فرار ہو سکتا ہے۔“

”سوائے اس صورت میں کہ مریض کو ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہوش آجائے۔“ ڈائنا نے کہا۔

”ہاں یہ امکان ضرور موجود ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”شاید اسی لیے ہمارا زرد چہرہ دوست اس کے ساتھ ایمبولینس میں ہسپتال جانے پر مصر ہے کہ اسے راستے میں ہوش نہ آسکے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیوں نہ ہم بھی کوئی بہانہ کر کے ان کے ساتھ ہی چلیں۔“

”وہ کس لیے؟“ ڈائنا چونکی۔

”اس لیے کہ نام نہاد سارجنٹ کوپلینڈ اگر راستے میں اپنے مریض کو ختم کرنے کی کوشش کرے تو اسے روک سکیں۔“

”کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ تم ایئرپورٹ سے پولیس کو فون کر کے اپنے خدشات سے آگاہ کر دو۔ وہ خود کوئی انتظام کر لے گی۔“

”اور جب تک وہ کوئی انتظام کرے گی مریض دوسرے جہان کو سدھار چکا ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شاید تمھیں

یہ خطرہ ہے کہ ایمبولینس میں جانے سے ہمیں نقصان پہنچے گا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب تک ہمارے دوست کو یہ اطمینان ہے کہ کوئی اس پر شبہ نہیں کر رہا، وہ کوئی حماقت نہیں کرے گا۔ مریض کی حالت ایسی ہے کہ مجھے یقین نہیں کہ اسے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہوش آسکے۔ میں صرف اس لیے ساتھ جانا چاہتا ہوں کہ ہماری موجودگی اسے کوئی مزید قدم اٹھانے سے باز رکھے گی۔ اب بتاؤ کہ تم آمادہ ہو یا نہیں؟"

"لیکن ہم ایمبولینس میں کیسے جائیں گے۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ تمھیں نرس خیال کر رہے ہیں اور میں نے ابھی تک اپنے بارے میں نہیں بتایا کہ میں کون ہوں۔"

میں پھر اٹھ کر پچھلی سیٹ کی طرف گیا۔ ڈاکٹر ایک مرتبہ پھر مریض کے دل کی حرکت کا معائنہ کر رہا تھا۔

"ڈاکٹر۔" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "میں یو۔ سی۔ ایل۔ اے میں میڈیکل کا طالب علم ہوں۔ میری ساتھی رجسٹرڈ نرس ہے۔ ہم ایمبولینس میں مریض کے ساتھ جانے کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔"

"اس طرح ایمبولینس میں زیادہ آدمی ہو جائیں گے۔" سارجنٹ نے اعتراض کیا۔

"نہیں خیر جگہ تو بہت ہوگی۔" ڈاکٹر بولا۔ "ہسپتال سے ایمبولینس کے ساتھ صرف ڈرائیور ہی آئے گا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نام نہاد سارجنٹ کو یہ بات کچھ پسند نہیں آئی۔ مگر چونکہ وہ ڈاکٹر کی بات رد نہیں کر سکتا تھا، اس لیے خاموش ہوگیا۔ بفیلو میں جب ہمارا طیارہ ائیر پورٹ پر اترا تو حسب توقع ایمبولینس انتظار کر رہی تھی۔ سب سے پہلے مریض کو اتارا گیا۔ مجھ سمیت ڈاکٹر اسمتھ اور نام نہاد سارجنٹ نے جسے میں ولی دی پیرٹ سمجھ رہا تھا، مریض کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں سوار کروا دیا۔ ڈائنا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ائیر پورٹ پولیس کے ایک جوان نے بھی ہمارے ساتھ جانے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر نے منع کر دیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر نے دروازہ بند کیا اور ڈرائیور کو چلنے کی ہدایت کی۔ روانہ ہوتے وقت ایمبولینس کی سرخ روشنی جل رہی تھی اور سائرن بھی بج رہا تھا۔ مگر ائیر پورٹ کے گیٹ سے کچھ دور پہنچتے ہی ڈرائیور نے دونوں چیزیں بند کر دیں۔

"ڈرائیور۔" اچانک ڈائنا بولی۔ "یہ تم شمال کی جانب کیوں گھوم رہے ہو؟"

ڈرائیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دزدیدہ نظروں سے میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر اسمتھ اپنا بیگ کھول رہا ہے۔ میری توجہ زرد چہرہ والے آدمی پر مرکوز تھی کہ اگر وہ کوئی غلط حرکت کرے تو اسے روکا جا سکے۔ اچانک اس کا سیدھا ہاتھ کوٹ کے اندر غائب ہوا اور پھر باہر نکلا تو اس میں اعشاریہ ۳۸ بور کا سرکاری ریوالور دبا ہوا تھا۔

فوج میں ہمیں اس قسم کی صورت حال سے نپٹنے کی خاص تربیت دی گئی تھی۔ میں نے پھرتی سے زرد چہرہ آدمی کی کلائی پر ہاتھ مارا۔ اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور دوسرے لمحے ریوالور میرے قبضے میں تھا۔

"شکریہ۔" ڈاکٹر نے بڑے کھردرے لہجے میں کہا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ مجھے کامیاب نہیں ہونے دے گا۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا اور میرا منہ لٹک گیا۔ ڈاکٹر اعشاریہ ۴۵ بور کے بھاری ریوالور سے ہم سب کو زد میں لیے ہوئے تھا۔ میں نے ہاتھ میں لیے ریوالور کو حسرت سے دیکھا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

"مگر میں سمجھ گیا ہوں۔" سارجنٹ کوپلینڈ نے اپنی کلائی سہلاتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر اسمتھ حقیقت میں ایڈی گرین کا دوسرا نام ہے اور یہ دل کا مصنوعی دورہ فرار کے منصوبے کا حصہ تھا۔"

"بالکل ٹھیک۔" اچانک اسٹریچر پر لیٹے ہوئے مریض نے بڑی پھرتی سے میرا ریوالور چھین لیا۔ "شیشی میں اسپارٹن سلفیٹ تھا۔ اس کے استعمال سے دل کی حرکت وقتی طور پر کمزور پڑ جاتی ہے۔ ممکن ہے کوئی ڈاکٹر دل کے دورے کے فریب میں نہ آئے مگر ایک عام آدمی کو بہ آسانی دھوکا دیا جا سکتا ہے۔" اس نے نقلی ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"تم نے ان دونوں کو ایمبولینس میں آنے کا موقع کیوں دیا۔" اس نے ایڈی گرین سے پوچھا۔

"میرا خیال تھا کہ ائیر پورٹ پولیس کا کوئی آدمی بھی ہمارے ساتھ آنے کی کوشش کرے گا لیکن ان لوگوں کی موجودگی ایمبولینس میں جگہ کی تنگی کا معقول عذر ثابت ہوئی۔"

"کیا تم بتاؤ گے کہ تم نے میرا ریوالور کیوں چھینا۔" سارجنٹ نے مجھ سے سوال کیا۔

"مجھے افسوس ہے سارجنٹ۔" میں نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "میرا خیال تھا کہ تم اصل میں ولی دی پیرٹ ہو اور تم نے کسی طرح اصلی سارجنٹ کو بے ہوش کر کے اس کا بہروپ بھر لیا ہے۔"

"یہ خیال تمھیں کیسے آیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے تمھیں بائیں ہاتھ سے لکھتے ہوئے دیکھا۔ اس کے علاوہ تم نے قیدی کو اپنی الٹی کلائی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ پھر تمھارا چہرہ بھی بہت پیلا نظر آرہا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ زردی طویل مدت تک جیل میں بند رہنے کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔"

"میں الٹے ہاتھ سے لکھتا اور سیدھے ہاتھ سے نشانہ لگاتا ہوں۔" سارجنٹ نے بتایا "اور چہرے کی زردی اس لیے ہے کہ میں نیویارک میں رات کی شفٹ میں کام کرتا ہوں۔"

"اوہ۔" ظاہر ہے کہ میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا۔

"یہاں حالات قابو میں ہیں جم۔" ولی نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "تمھیں تو کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔"

"بالکل نہیں۔" جم نے جواب دیا۔ "جیسے ہی ایمبولینس قریب آئی، میں نے ٹرک سے اس کا راستہ بند کر دیا۔ اس میں صرف ڈرائیور بیٹھا تھا۔ اُسے باندھ کر ٹرک میں ڈالنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہاں سے کچھ دور سیڈان کار تیار کھڑی ہے۔ اس میں سوار ہو کر ہم بہ آسانی کینیڈا پہنچ سکتے ہیں۔"

"یہ تمھارا چھوٹا بھائی جم ہے۔" سارجنٹ نے ولی سے پوچھا۔

"ہاں۔" ولی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہم ڈوئل خاندان کے لوگ ہمیشہ ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔"

"ہمارے بارے میں تمھارا کیا پلان ہے؟"

"اچھا سوال ہے سارجنٹ۔" ولی مسکرایا۔ "تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟" سارجنٹ نے پوچھا۔

مجھے سردی کی تیز لہر اپنے پورے جسم میں رینگتی محسوس ہوئی۔ میں نے معذرت خواہانہ نظروں سے ڈائنا کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ مگر وہ بڑے حوصلے سے مسکرائی۔ ولی نے اپنے ساتھی ایڈی کی جانب دیکھا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ ہم سب کو اچھی طرح اپنے اسلحے کی زد میں لیے ہوئے ہے، اپنا ریوالور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ جعلی ڈاکٹر کا ریوالور

> "اگر تم نے اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی" ڈائنا بڑی سپاٹ آواز میں ولی سے مخاطب تھی۔ "تو میں پہلے تمھارے کزن ایڈی کو شوٹ کروں گی اور پھر تمھیں بھی گولی ماردوں گی۔ اور تم ایڈی، اپنے ریوالور کا سیفٹی کیچ لگا کر اسے میری طرف پھینک دو۔"

اس کے گھٹنے پر ٹکا ہوا تھا۔ نال اس طرح اٹھی تھی کہ اسے ضرورت کے وقت کسی بھی جانب موڑا جا سکتا تھا۔ ڈائنا نے ایڈی کی طرف دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کیا میں اپنے بیگ سے رومال نکال سکتی ہوں؟''

''بڑے شوق سے۔'' ایڈی نے اجازت دے دی۔

ڈائنا نے اپنا بیگ کھول کر اس میں ہاتھ ڈالا اور پھر جو اس کا ہاتھ باہر نکلا تو اس میں اعشاریہ ۳۸ بور کا ویسا ہی ریوالور دبا ہوا تھا جیسا میں نے سارجنٹ کے پاس دیکھا تھا۔ یہی نہیں، اس سے پہلے کہ ایڈی کوئی حرکت کر سکے ڈائنا ریوالور اس کی طرف تان چکی تھی۔ میں تو خیر حیران تھا ہی ایڈی بھی کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہ گیا۔

''اگر تم نے اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی'' ڈائنا بڑی سپاٹ آواز میں ولی سے مخاطب تھی۔ ''تو میں پہلے تمھارے کزن ایڈی کو شوٹ کروں گی اور پھر تمھیں بھی گولی مار دوں گی۔ اور تم ایڈی، اپنے ریوالور کا سیفٹی کیچ لگا کر اسے میری طرف پھینک دو۔'' وہ آہستہ لہجے میں بول رہی تھی تا کہ ڈرائیور جم اس کی بات نہ سن سکے۔

ایڈی نے ناچار حکم کی تعمیل کی۔ ڈائنا نے اس کا ریوالور سارجنٹ کو پلینڈ کو دے دیا۔ پھر ولی کی جیب سے سارجنٹ کا ریوالور نکال کر اسے بھی اس کے حوالے کر دیا۔ سارجنٹ نے اپنا ریوالور ہاتھ میں آتے ہی اس کی نال جم کی پیٹھ سے لگا کر ایمبولینس روکنے اور پھر اپنا ریوالور نکال کر دینے کی ہدایت کی۔ جم کو بھی اس حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

جب تک تینوں ڈاکوؤں کو مکمل طور پر قابو میں نہیں کر لیا گیا میں نے یا سارجنٹ کو پلینڈ نے اس مسئلے میں سر کھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ڈائنا کے پاس ریوالور کہاں سے آیا۔ سارجنٹ نے ولی کے ہاتھ پشت کی جانب کر کے باندھ دیے۔ پھر ایڈی کی ٹائی کھول کر اس کے ساتھ اور ولی کی ٹائی کھول کر جم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ جب ان تینوں کو ایمبولینس میں بھر دیا گیا تو سارجنٹ نے ڈائنا کی طرف دیکھا۔ ''مجھے معلوم نہیں تھا کہ نرسیں بھی ریوالور لے کر سفر کرتی ہیں۔'' وہ بولا۔

''میں نرس نہیں ہوں۔'' ڈائنا نے جواب دیا۔ ''میرا تعلق پولیس سے ہے۔''

''پولیس سے!'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں، تمھیں کوئی اعتراض ہے۔'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''بالکل نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کے برعکس اگر محکمہ پولیس کا کوئی رکن کسی پرائیویٹ سراغ رساں کا دوست ہو تو یہ اس کی خوش قسمتی سمجھی جاتی ہے۔ پھر تم جیسا دوست......''

''اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ میں نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تو شاید تمھارے یہ جذبات نہ رہیں۔''

''کیا؟'' میں چونکا۔

''ہم اس مسئلے پر بعد میں گفتگو کریں گے۔'' ڈائنا نے جلدی سے کہا۔ ''پہلا کام تو ان مجرموں کو پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچانا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' سارجنٹ نے تائید کی اور میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم ایمبولینس چلا سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔''

''تو پھر تم ایمبولینس ڈرائیو کرو۔ میں پچھلے حصہ میں قیدیوں کی نگرانی کرتا رہوں گا۔ مس وارٹن چاہیں تو تمھارے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ سکتی ہیں۔''

ڈائنا میرے ساتھ آ بیٹھی۔ ایمبولینس روانہ ہوئی۔ ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔

''تم کیا کہہ رہی تھیں۔'' آخر مجھے بولنا ہی پڑا۔

''تم ضرور مجھ پر ناراض ہو گے۔'' وہ کچھ شرمندگی سے

بولی۔ ''بات یہ ہے کہ جب تم اپنی سراغ رسانی کا مظاہرہ کر رہے تھے تو میں نے کئی باتوں میں جھوٹ بولا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جھوٹ نہیں بولا محض خاموش رہ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ تمھارے اندازے درست ہیں۔ جبکہ وہ غلط تھے۔''

''اوہ۔'' میں نے کہا۔ ''کون کون سے؟''

''مثلاً یہ کہ میں لاس اینجلس میں سیر و تفریح کے لیے نہیں گئی تھی۔'' ڈائنا نے بتایا۔ ''میں یو۔ سی۔ ایل۔ اے میں کرمنالوجی کا کورس پڑھ رہی ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے کئی ہفتہ ساحل سمندر پر گزارے۔ یہی وجہ ہے کہ میری رنگت تانبے کی طرح ہو گئی۔ اس کے علاوہ میں نے بفیلو یونیورسٹی میں نہیں پڑھا بلکہ فریڈونیا اسٹیٹ کالج میں تعلیم حاصل کی ہے۔''

''تب پھر بفیلو یونیورسٹی کی انگوٹھی کیوں پہنے ہوئے ہو۔''

''یہ میری نہیں، میرے ایک دوست لڑکے کی ہے۔'' اس نے جواب دیا یہاں ایک دستور یہ بھی ہے کہ لڑکیاں لڑکوں کی تعلیمی انگوٹھیاں اپنی منگنی والی انگلی میں پہن لیتی ہیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ کسی ایک لڑکے کے ساتھ باہر جا رہی ہیں اور ادھر اُدھر بھٹکنے کے لیے تیار نہیں لہٰذا بے کار کوشش نہ کی جائے۔''

''مگر یہ انگوٹھی تم نے اپنی منگنی والی انگلی میں نہیں پہنی ہوئی۔'' میں نے اعتراض کیا۔

''درست ہے۔'' ڈائنا نے جواب دیا۔ ''لیکن ایک دن قبل تک اسی انگلی میں تھی۔ میرے دوست کو یہ پتا نہیں کہ میں نے اسے دوسری انگلی میں پہننا شروع کر دیا ہے۔''

''اوہ۔ گویا تمھارا منگیتر لاس اینجلس میں نہیں رہتا اور تم نے اپنی منگنی اسے بتائے بغیر ختم کر دی۔''

''منگنی نہیں۔'' ڈائنا نے کہا ''جیسا کہ میں نے کہا، یہ صرف کسی ایک لڑکے کے ساتھ باہر جانے کی علامت ہے جو بعد میں منگنی کے اعلان میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ مگر جہاں تک میرے دوست کا تعلق ہے، تو میں کئی ماہ سے اس کے ساتھ ترک تعلق پر غور کر رہی تھی۔ لیکن چونکہ کوئی اور ایسا شخص نہیں تھا جو اس کی جگہ لے سکتا لہٰذا میں نے انگوٹھی اتارنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''تو پھر اب کیوں اتار دی تھی۔'' میں نے پوچھا۔

''جب ہم لوڈنگ گیٹ کے سامنے قطار میں کھڑے تھے تو میں نے تمھاری نگاہوں سے اندازہ لگایا کہ تم مجھے پسندیدگی سے دیکھ رہے ہو۔ میں نے سوچا، ممکن ہے طیارے میں تم میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کرو اور ایسی صورت میں شاید تمھیں میری منگنی کی انگلی میں انگوٹھی دیکھ کر مایوسی ہو۔ چنانچہ میں نے اسے اتار کر سیدھے ہاتھ میں پہن لیا۔''

یہ انکشاف کہ جب میں طیارے میں اس پر اپنی سراغ رسانی کا رعب ڈال رہا تھا تو وہ دل ہی دل میں میری سادہ لوحی پر مسکرا رہی ہوگی، مجھے برہم نہیں کر سکا جیسا کہ اسے اندیشہ تھا۔ البتہ اس نے میرے احساس برتری کو ضرور ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کا یہ کہنا کہ میرے اندازے غلط تھے، دراصل اس کی ایک اور مہربانی ہی تھی۔ حقیقت میں میرا صرف ایک ہی خیال درست تھا کہ وہ بفیلو کی رہنے والی ہے اور بس۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی کہ اُس نے میری پسندیدگی کا اتنا خیال کیا کہ اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری پسندیدگی یک طرفہ نہیں بلکہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ چنانچہ ممکن ہے کہ میں سراغ رسانی اور مشاہدے سے اندازہ لگانے کے فن میں اتنا کامیاب ثابت نہیں ہوا ہوں لیکن اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ میرے اندر کوئی خوبی ایسی ضرور ہے کہ جو ڈائنا جیسی حسین رفیقۂ حیات حاصل کرنے میں کامیابی کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔



لاہور کا والٹن کیمپ

مقصود احمد چغتائی

پنجاب کے سب سے بڑے مہاجر کیمپ کی داستان

قیامِ پاکستان کے وقت مسلمانوں نے بھارت سے پاکستان ہجرت کی۔ جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا، تو ہندوستان سے لاکھوں مہاجرین نئے وطن میں چلے آئے۔ اس زمانے میں لاہور میں ''والٹن کیمپ'' کے نام سے ایک بہت بڑا مہاجر کیمپ قائم کیا گیا۔

کم لوگ جانتے ہیں کہ والٹن کے قیام میں سکاؤٹس کی خدمات، ایثار اور انتھک محنت بھی شامل ہے۔

والٹن کا تاریخی پس منظر

روایات کے مطابق پرانے لاہور کے مضافات میں دور دور تک آبادی نہیں تھی۔ البتہ چند نزدیکی گاؤں امرسدھو، گوپال نگر، کوڑا پنڈ اور چرڑ کے نام سے آباد تھے۔ ان گاؤں میں رہنے والوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔

کہا جاتا ہے کہ موجودہ والٹن کو بسانے کا سہرا سر ینگ ڈگلس کے سر ہے جو پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ سر ڈگلس نے ۱۹۲۲ء میں چندہ اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی تاکہ علاقہ والٹن میں ۱۲۰ کمروں اور دو برآمدوں پر مشتمل ایک عمارت تعمیر کر کے اسے یوتھ ہوسٹل بنایا جا سکے۔ سر ڈگلس عالی رتبہ ہونے کے باوجود اپنا ہیٹ اُٹھاتے اور لاہور سمیت پنجاب کے دور دراز علاقوں کا طویل سفر کرتے۔ اس وقت کے امرا اور صاحبِ دل اصحاب کے پاس جاتے، اور چندہ اکٹھا کرنے کے لیے اپنا ہیٹ بڑھانے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔

ان کی شب و روز کی محنت کام آئی اور اس تاریخی جگہ پر ایک عمارت کی تعمیر شروع ہو گئی۔ سر ڈگلس والٹن فلاح و بہبود کا اس قدر جذبہ رکھتے تھے کہ دورانِ تعمیر وہ خود ایک معمولی کیمپ میں مقیم رہے اور اپنا تمام وقت تعمیری سرگرمیوں کے لیے وقف کر دیا۔

والٹن کی اہمیت

والٹن میں ان تاریخی عمارتوں کی تعمیر کا بنیادی مقصد نوجوانوں کو مفید شہری بنانا، ان کی اخلاقی تربیت اور صحت مندانہ ماحول میں پروان چڑھنے کے لیے سازگار ماحول مہیا کرنا تھا۔ والٹن کی چند دوسری تاریخی عمارتوں میں پاکستان ریلوے ٹریننگ سنٹر، والٹن کا پرانا ائیر پورٹ یعنی موجودہ پاکستان فلائنگ کلب، دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ یہاں موجود پنجاب بوائے اسکاؤٹس ٹریننگ سینٹر، برِصغیر پاک و ہند میں دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ وہاں ہر سال لاکھوں نوجوان عملی تربیت حاصل کرتے ہیں۔

۱۹۹۲ء میں اس مہاجر کیمپ کی یادگار باب پاکستان بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت والٹن کو حکومت کی طرف سے مہاجر کیمپ کا درجہ دیا گیا تھا۔ یہ مہاجر کیمپ دو سال تک قائم رہا جہاں مہاجروں کی امداد کے واسطے نوجوانانِ مسلم لیگ نے بوائے اسکاؤٹس کے شانہ بشانہ کام کیا۔ بھارت سے پاکستان میں داخل ہونے والے مہاجرین کی دن رات خدمت کی، زخمیوں کی مرہم پٹی انجام پائی، بچھڑے خاندان ملوانے میں معاون بنے اور یوں دکھی انسانیت کی خدمت کی اعلیٰ اور انوکھی مثال قائم کر دی۔

مہاجر کیمپ کے انتظامات:

۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد مہاجر کیمپ قائم کرنے کے سلسلے میں مناسب اقدامات کیے گئے۔ مہاجرین کی کثیر تعداد کے باعث مہاجر کیمپ کو مختلف اضلاع میں پھیلا دیا گیا، جن میں ڈی.جی خان، ملتان، شیخوپورہ، منصر (راولپنڈی)، سیالکوٹ، لائلپور (موجودہ فیصل آباد) شامل ہیں۔ ان سب مہاجر کیمپوں کا نظم و نسق چلانے کے لیے پنجاب بوائے اسکاؤٹس کے افراد کو دسمبر ۱۹۴۷ء میں مختلف اضلاع بھیجا گیا۔ اُن افراد نے تقریباً دو سال تک کیمپ کمانڈنٹ/ڈپٹی کیمپ کمانڈنٹ کی حیثیت سے اپنا کام خوش اسلوبی سے کیا۔ یہ افراد دسمبر ۱۹۴۸ء میں مندرجہ بالا عارضی فرائض انجام دینے کے بعد اپنی اصلی پوزیشنوں پر واپس آ گئے۔

والٹن میں انتظامات کو انجام دینے کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ کار اختیار کیا گیا:

(الف) مہاجر کیمپ کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا جن میں سے سات ملٹری بیرک سے ملحقہ تھے جبکہ آٹھواں بوائے اسکاؤٹس بیرک کا کیمپ بنایا گیا۔

(ب) انتظامات بہتر طور پر چلانے کے لیے جو بلاک قائم کیے گئے اُن میں انتظامی بلاک، مہاجرین کا استقبالیہ سنٹر، اغوا شدہ خواتین کا ہاسٹل اور ضعیف و تنہا افراد کا مہاجر کیمپ شامل تھے۔

مہاجرین سب سے پہلے استقبالیہ سنٹر آتے۔ نام درج کرنے کے بعد انہیں حسبِ ضرورت کیمپ کے کسی ایک حصے میں بھیج دیا جاتا۔ انہیں کھانا، کپڑے اور رہائش مہیا کی جاتی۔ کیمپ میں بالعموم لوگ عارضی قیام کیا کرتے تھے، اگرچہ لوگوں کے وسائل محدود تھے مگر جذبۂ ایمانی موجزن تھا۔ بہت سارے افراد جن کے رشتے دار پہلے ہی پاکستان آ چکے تھے، وہ کیمپ میں اپنے بچھڑے ہوئے اقارب سے مل جاتے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایک کروڑ مسلمانوں نے بھارت سے پاکستان ہجرت کی تو ان میں سے صرف دس فیصد ہی ایسے مہاجرین ہوں گے جو والٹن نہ ٹھہرے ہوں۔ اس طرح تقریباً نوّے لاکھ افراد نے اس کیمپ میں قیام کیا۔

قائداعظمؒ کا دورۂ والٹن:

۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظمؒ محترمہ فاطمہ جناح اور مہاجروں کے وزیر میاں افتخار الدین کے ہمراہ تشریف لائے۔ ان کو اے ایم کے لغاری مہاجر کمشنر نے خوش آمدید کہا۔ قائداعظمؒ نے اپنے اس دورے کے دوران دیکھا کہ کیمپ کی ڈسپنسری میں میڈیکل طالب علم مریضوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جب وہ کچن کے انتظامات دیکھ رہے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ مہاجرین کو خود کام کرنے دیں، کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ یہاں مستقلاً مہمان ہیں۔ اس موقع پر قائداعظمؒ کا تعارف مسلمان رضا کار لڑکیوں سے بھی کروایا گیا۔

والٹن کیمپ کے خاص خاص واقعات:

☆ مشرقی پنجاب سے آنے والے مہاجرین کو راستے میں کھانا دستیاب نہ ہو سکا۔

☆ صوبائی قائداعظمؒ ریلیف فنڈ کا قیام ۷ اکتوبر کو عمل میں آیا۔

☆ وزیراعظم لیاقت علی خان نے بیرونی ممالک سے مہاجرین کے لیے گرم کپڑوں کی امداد کی درخواست کی کہ پاکستان کو گرم کپڑے دیے جائیں۔ دراصل ''بھارت سے آنے والے مسلمان تھکے ماندے، غیر توانا اور بیمار بلکہ بعض نیم مردہ حالت میں پاکستان پہنچ رہے تھے...... جبکہ پاکستان کے پاس ایک بھی گرم کپڑوں کی فیکٹری نہیں تھی۔''

☆ پنجاب مسلم لیگ خواتین کمیٹی کے مطابق سب سے مشکل کام عصمت دری کا شکار ہونے والی خواتین کی فہرست تیار کرنا تھا۔

حکومتِ پاکستان باب پاکستان کی تعمیر پر مبارکباد کی مستحق ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ بوائے اسکاؤٹس کی تاریخی عمارتوں کو گرانے کی بجائے انہیں تاریخی ورثہ قرار دیا جانا چاہیے۔ حکومتِ پاکستان نے اسکاؤٹس کے معاملات بہتر طور پر حل کرنے کے لیے جو بورڈ آف ٹرسٹی قائم کیا ہے، وہ قابلِ تحسین اقدام ہے۔

رابسون اپنی ماں سے بہت نالاں تھا۔ حالانکہ مسز ماریسے تُند خو یا جابر قسم کی عورت ہرگز نہیں تھی۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو مارنا پیٹنا تو درکنار، ذرا سی لعنت ملامت کرنے کی بھی ہمت نہ رکھتی تھی۔ بیٹے کو جھڑک دینے کا اس میں حوصلہ ہی نہ تھا۔ خاوند کے ناگہانی انتقال کے بعد رابسون ہی تو اس کا سب کچھ تھا۔ میاں بیوی کے پیار کی پہلی اور آخری نشانی رابسون ہو بہو اپنے والد کی تصویر تھا۔

مسز ماریسے نہ صرف گھر میں بیٹے کا خیال رکھتی بلکہ اکثر اس کا کھانا لے کر اسکول پہنچ جاتی۔ اسکول سے واپسی میں ذرا دیر ہوئی اور مسز ماریسے اسکول میں جا وارد ہوتی اور بعض اوقات تو ٹیچر سے محض اس لیے الجھ پڑتی کہ اس نے رابسون کو زیادہ دیر اسکول میں کیوں بٹھائے رکھا۔ ماں کی اسی حد سے بڑھی ہوئی محبت کے باعث رابسون پریشان رہتا۔ اس کے ہم مکتب اس کی ماں کے رویے پر اُسے چھیڑتے اور طرح طرح کے فقرے کستے:

"آنٹی ماریسے کو کھانا لانے کے بجائے رابسون کے لیے دودھ کی بوتل لانی چاہیے...... بے چارہ ننھا منا بچہ ہی تو ہے۔"

"ارے سنو! رابسون کو اسکول کے بجائے نرسری ہوم میں ہونا چاہیے۔ ابھی بہت چھوٹا ہے نا ہمارا مُنّا۔"

"تم دیکھو گے کہ رابسون کی ممی اسے بارہویں سالگرہ پر تحفے میں ننھا مُنّا جھولا دیں گی۔"

ماں کی انہی باتوں سے رابسون کو چڑ تھی۔ وہ ہزار بار منع کر چکا تھا مگر مسز ماریسے ایسے اس کی نگہداشت کرتیں گویا وہ بارہ سال کے صحت مند اور کھلنڈرے لڑکے کے بجائے جھولے میں پڑا بارہ ماہ کا روں روں کرتا بچہ ہو۔



مسز ماریسے عمر کے چالیس سال گزرنے کے بعد بھی خاصی پُرکشش خاتون تھی۔ خاوند کی وفات کے بعد کئی مردوں نے اُسے جیون ساتھی بنانے کی پیش کش کی، مگر وہ ہر بار محض

رابسون کی وجہ سے ٹال گئی۔ ابتدائی تعلیم مکمّل کر کے رابسون فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ شاید مزید تعلیم حاصل کرتا مگر ماں کی بے چارگی اور معاشی بدحالی نے اُسے اس خیال سے باز رکھا۔ مسز ماریسے نے اس سے تعلیم جاری رکھنے کے لیے شدید اصرار بھی کیا مگر وہ فوج میں چلا گیا۔

مسز ماریسے کی زندگی ویران ہو گئی۔ وہ سارا دن رابسون کا انتظار کرنے، کھانا پکانے، اس کی چیزیں سنبھال سنبھال کر رکھنے، سینڈوچ تیار کرنے اور اس کی دیگر ضروریات پوری کرنے میں کاٹ دیتی تھی۔ مگر اب رابسون مہینوں گھر کا رُخ نہ کرتا۔ ڈیوٹی آخر ڈیوٹی تھی اور پھر فوج کی ملازمت...... کریلا اور نیم چڑھا والی بات تھی۔ رابسون سال دو سال بعد گھر آتا۔ تو گویا مسز ماریسے کے وجود میں زندگی کی نئی لہر دوڑ جاتی جو تین چار ہفتوں کے بعد رابسون کی واپسی کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی اور ماں پھر بیٹے کی آمد کے دن گننے لگتی۔

مسز ماریسے نے بارہا رابسون سے اس کی رجمنٹ کا نام اور نمبر وغیرہ پوچھا مگر وہ ہر بار خوبصورتی سے ٹال گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ماں فوج کی بیرکوں میں بھی نہ چلی آئے اور اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے خفت اٹھانی پڑے۔ تاہم بیٹے کی یونیفارم پر موجود مخصوص نشان سے ماں یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئی کہ اس کا بیٹا توپ خانے میں کام کرتا ہے۔

رابسون کو گھر آئے سوا دو برس ہو چکے تھے۔ اُسے حال ہی میں کمپنی کمانڈر کے عہدے پر ترقی ملی تھی۔ وہ ماں کو یہ خبر سنانے کے لیے بہت بے تاب تھا۔ اس نے چھٹی کے لیے درخواست بھی دے رکھی تھی۔ تب اچانک جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ دشمن نے ملکی سرحدوں پر حملہ کر دیا تھا۔ چھٹی ملنے کا تو ذکر ہی کیا، چھٹی پر گئے ہوئے فوجیوں کو بھی واپس بلا لیا گیا۔

سرحد پر گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں طرف فوجیں دشمن کو نیست و نابود کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھیں۔ آخر طویل محاذ آرائی کے بعد وطن کا دفاع کرنے والی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ توپ خانے کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا اور بھاری جانی نقصان کے بعد سپاہی پیچھے ہٹنا شروع ہوئے۔

بیس ہزار کے لگ بھگ تھکے ماندے، غیر منظّم، حوصلہ ہارے اور لڑنے کے جذبے سے عاری سپاہی پسپا ہو رہے تھے۔ شام اپنے سیاہی مائل پروں میں صبح سے مسلسل ہونے والی برف باری کی سفیدی کو چھپا رہی تھی۔ سپاہیوں کو پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں کھانے کا ایک لقمہ تک نہ ملا تھا۔ چاروں طرف برف میں ڈھکا وسیع و عریض ناہموار علاقہ تھا جس پر جمی ہوئی برف کی سفیدی بھوکے سپاہیوں کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔ بلند و بالا درختوں کے پتے کھائے تو جا سکتے تھے مگر ان تک رسائی آسان کام نہ تھا اور رُکنے یا آرام کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔

دشمن کی فوجیں تعاقب میں بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ شام کی مدھم سی ملگجی روشنی میں سپاہیوں کے بوٹوں تلے آنے والی برف کی چرچراہٹ اور کندھوں سے لٹکتے ایک دو خالی برتنوں کی کھنکار شامل ہو گئی تھی۔ تھکے ہارے سپاہی جھُکے کندھے، چیتھڑوں کی شکل میں جسم پر لٹکتی وردیاں اور دلوں میں دشمن کے بڑھے چلے آنے کا خوف لیے خود کو گھسیٹتے ہوئے تیز سے تیز تر چلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

مسلسل برف باری سے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ سردی کی شدت سے رگوں میں خون منجمد ہو رہا تھا۔ سپاہیوں کے ہاتھ بندوقوں کے دستوں پر شل ہو کر رہ گئے تھے اور ان میں لکڑی جیسی سختی آ گئی تھی۔ بیس ہزار سپاہی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں قریبی فوجی مرکز تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ بھوک، تکلیف اور پسپائی کے رنج سے افسر اور سپاہی کا

فرق صرف وردیوں یا ان پر آویزاں مخصوص نشانات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ سپاہی من مانی پر اُتر آئے تھے اور افسر محض دبی زبان میں احکام صادر کر کے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش میں مصروف تھے۔

ناٹے قد کا ایک سپاہی بار بار اپنا جوتا اتارتا اور ننگے پاؤں چلنے کی کوشش کرتا۔ اس کا پاؤں زخمی ہو رہا تھا اور ننگے پیر چلتے ہوئے وہ برف پر خون کے دھبے چھوڑتا ہوا چل رہا تھا۔ آخر تھک کر وہ چند منٹ آرام کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ چلنے والوں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا مگر کسی میں بولنے کی سکت نہ تھی۔ یہ بات سب اچھی طرح جانتے تھے کہ جو شخص ایک بار تھک کر برف پر بیٹھ جاتا وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو جاتا۔ سردی اس قدر شدید تھی کہ ایک گھنٹے میں آدمی کا خون جمنے لگتا اور برف پر ستانے کے لیے بیٹھ کر اٹھنا گویا دوسرا جنم لینا تھا۔ تھکا ماندہ جسم برف پر گرنے کے بعد برف ہی کا ایک حصہ بن جاتا۔ مضمحل اعضاء شل ہو جاتے اور برف گرم انسانی جسم کو ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں لے کر ٹھنڈا کر دیتی۔

سپاہی خود کو گرم اور زندہ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ تیزی سے پھیلتے ہوئے رات کے اندھیرے میں ان کے بوٹوں کے نیچے سفید برف چرچراتی تو انھیں اپنے دکھتے ہوئے جوڑ جوڑ کا درد شدید ہوتا ہوا محسوس ہونے لگتا۔ اکثر دعائیں مانگتے کہ دشمن کا کوئی بھولا بھٹکا سپاہی یا دستہ کسی طرح ان کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کا قیمہ کر ڈالیں...... مگر دشمن صرف تعاقب میں تھا۔

کمپنی کمانڈر رابسون اور اس کا ہم عہدہ دوست مرکاس بھی پسپا ہو رہے تھے۔ مرکاس کو دو سپاہی دکھائی دیے جو ایک پست قامت شخص کو بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ کمزور سا آدمی تھا۔ جس کی ڈاڑھی مونچھ صاف تھی اور چہرے سے پریشانی ترشح تھی۔ سپاہیوں کو شک تھا کہ وہ جاسوس ہے۔

دشمن کا جاسوس پکڑے جانے کی خبر نہایت تیزی سے سپاہیوں میں پھیل گئی۔ ان کے دلوں میں دشمن کے خلاف چھپی نفرت چہروں سے برسنے لگی اور وہ جلدی جلدی جاسوس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اچانک ایک آواز اُبھری۔

''اِسے گولی مار دینی چاہیے۔''

یہ ایک فقرہ ہزیمت زدہ سپاہیوں کا خون کھولا دینے کے لیے کافی تھا۔ مرکاس تیزی سے سپاہیوں کی جانب بڑھا۔ اُسے شک تھا کہ جھنجلائے ہوئے سپاہی باہم دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ بیشتر اس کے کہ وہ سپاہیوں کو جاسوس کے بارے میں کوئی حکم دیتا۔ سپاہیوں نے اس مشتبہ شخص کو اٹھا کر پوری قوت کے ساتھ برف پر پٹک دیا۔ پھر اٹھا کر ایک درخت کے تنے کے ساتھ دے مارا۔ چند گز تک اسے برف پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ اب وہ نحیف و نزار جسم کوئی آواز نکالے بغیر برف کے یخ بستہ فرش پر پڑا تھا۔ غالباً زندگی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اسے چیخنے چلانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

یکا یک ایک سپاہی نے برف پر پڑے گرم کمبلوں کے چیتھڑوں میں لپٹے لاشے پر فائر کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے چند اور سپاہیوں نے اسی نشانے پر فائر کیا اور دوبارہ فائر کرنے کے لیے اپنی بندوقیں لوڈ کرنے لگے اور ذرا سی دیر میں شکست خوردہ سپاہی لاشے پر پہلے فائر کرنے کے لیے باہم گتھم گتھا ہونے لگے۔ اجنبی کی لاش پر گولیاں بارش کے قطروں کی طرح برس رہی تھیں مگر وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس ناتواں کی ہلاکت کے لیے تو محض ایک ضرب ہی کافی تھی۔ سپاہی خواہ مخواہ گولیاں ضائع کر رہے تھے۔

اچانک دور سے ایک سپاہی چلایا:

''دشمن کے سپاہی آ رہے ہیں۔'' اور سب کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ رابسون نے محاذ کی جانب نظر دوڑائی۔ دشمن کا کوئی اتا پتا نہ تھا مگر سپاہی بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔

دونوں کمپنی کمانڈر دو سپاہیوں کے ساتھ لاشے کے قریب کھڑے تھے۔ سپاہی ہیولوں کی طرح آہستہ آہستہ شام کی ملگجی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ مرکاس بھی جانا چاہتا تھا مگر رابسون کو کھڑے دیکھ کر رک گیا۔ دونوں سپاہیوں نے خون اگلتے گوشت کے ڈھیر کو اٹھایا۔ وہ اسے نیچے کھائی میں لڑھکا دینا چاہتے تھے مگر کامرس نے حکم دیا۔

''اس کی تلاشی لی جائے۔'' اور اس نے گریس لگی ہوئی موٹی سلائیوں پر مشتمل ماچس سپاہیوں کو دے دی۔

سپاہیوں نے خون میں لتھڑے لاشے کی تلاشی لینا شروع کی۔ دونوں کمپنی کمانڈر لاشے کے ذرا اور قریب آ گئے۔ سپاہی نے تیلی جلائی اور لاشے سے لپٹے پرانے کمبل ہٹاتے ہوئے بولا۔

''نیلا سکارف' سفید قمیص' پتلون اور جوتوں کا جوڑا...... جسم پر موجود ہے۔''

پہلی تیلی بجھ گئی۔ سپاہی نے جیبوں کی تلاشی لے کر اعلان کیا:

''ہاتھی دانت کے دستے والا چاقو' چیک کا رومال' دھاگے کی چھوٹی سی گچھی اور روٹی کا ایک ٹکڑا......'' دوسری تیلی بجھ گئی۔

تیسری تیلی جلتی رہی۔ سپاہی جسم ٹٹولتا رہا اور تیلی بجھنے کے ساتھ اس نے کہا ''اس کے علاوہ کچھ نہیں......''

رابسون اس سارے واقعے کے دوران پہلی بار بھاری مگر نیچی آواز میں گویا ہوا:

''اس کے کپڑے اتار دو۔ شاید اس نے اپنے جسم سے کوئی ایسی چیز لپیٹ رکھی ہو جس سے اس کے بارے میں زیادہ صحیح اندازہ ہو سکے۔''

مرکاس نے تیلی جلائی اور دونوں سپاہی لاش کے کپڑے اتارنے لگے۔ دو مزید تیلیاں بجھ چکی تھیں۔ مرکاس نے تیسری تیلی جلائی اور اچانک ایک سپاہی چلایا:

''میرے خدا...... کمانڈر یہ تو عورت ہے۔''

جلتی ہوئی تیلی کامرس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ دونوں کمانڈر خاصے ملول تھے۔ انھیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی عورت اس قدر یخ بستہ موسم میں اس ویرانے میں پہنچ سکتی ہے۔

رابسون دو قدم آگے بڑھا اور گوشت کے بے جان لاشے کے پاس زانوؤں کے بل جھک گیا۔ برف کے فرش سے گھٹنے مس ہوئے تو اسے احساس ہوا کہ عورت کس قدر ٹھنڈے فرش پر پڑی ہے۔ برف پر بکھرے بال اس کے عورت ہونے کی چغلی کھاتے تھے۔ چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔

دونوں سپاہی گونگے بہرے بنے کمانڈر کو لاش پر جھکے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ کسی میں ایک لفظ بھی کہنے کی ہمت نہ تھی۔ رابسون لاش کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کیا طرزِ عمل اختیار کرے۔

''شاید یہ کسی سپاہی کی ماں ہو جو کئی برس تک اپنے بیٹے کی خبر نہ پا کر محاذ تک چلی آئی۔'' کامرس اس قدر دھیمے لہجے میں بول رہا تھا کہ خود اسے بھی یقین نہ تھا کہ وہ خود بات کر رہا ہے یا آواز برف کے سینے سے اٹھ رہی ہے۔

''ماچس......'' رابسون چیخا۔

اس نے مشینی انداز میں ماچس والا ہاتھ کمانڈر کے سامنے کھول دیا۔ تیلی جلا کر رابسون نے لاش کی گردن ٹٹولی۔ تین بڑے موتیوں والا سادہ سا ہار چمک دمک کھو کر بھدا ہو گیا تھا۔ بائیں ہاتھ میں جس کا انگوٹھا سپاہیوں کی فائرنگ کے دوران جسم کا ساتھ چھوڑ چکا تھا، چاندی کی انگوٹھی اپنی آب و تاب کھو دینے کے باوجود تیسری انگلی میں موجود تھی۔

رابسون چیخ اٹھا: ''ماں! تو یہاں بھی چلی آئی۔''

وہ خون میں نہائے ہوئے لاشے سے لپٹ گیا اور نوزائیدہ بچے کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا۔



اعجاز شیخ

ہندوستان کی تقسیم کے جرم میں کانگریس کی سرپرستی میں سکھوں اور ہندو غنڈوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھایا، یہ ایسی غم ناک داستان ہے جسے بیان کرتے ہوئے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ تاہم نئی نسل قیام پاکستان کے مقصد سے کماحقہ واقف نہیں۔ انھیں تو یہ خطہ پاکستان سونے کی طشتری میں رکھا مل گیا۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ سرزمین حاصل کرنے کے لیے کتنی بیٹیوں، ماؤں اور معصوم بچوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

پاکستان ہجرت کرنے والوں میں میری ایک عزیزہ بھی شامل ہیں۔ ان کی کہانی ایسا دردناک باب ہے جو شاید ان کی موت کے بعد ہی ختم ہو۔ گو وہ اب چار بچوں کی ماں ہے۔ ان کے میاں ایک پنکھا ساز کمپنی کے مالک اور صاحبِ حیثیت ہیں۔ مگر وہ جس کرب میں مبتلا ہیں وہ ایک ماں ہی جان سکتی ہے۔ ان کی ایک پیاری، معصوم اور پھول سی بیٹی دریائے بیاس کے کنارے رہ گئی تھی۔

جب ان کا قافلہ دریائے بیاس کے قریب پہنچا تو سکھ درندوں نے حملہ کر دیا اور بے یارو مددگار قافلے کو تہ تیغ کرنے لگا۔ میری عزیزہ اپنی ۲ اور ۴ سالہ بچیوں کے ساتھ درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ گئیں۔ بدقسمتی سے دو سکھوں نے ماں بیٹیوں کو چھپتے دیکھ لیا۔ تبھی ایک سکھ نے کہا "تو معراج دین کی کڑی تے نئیں ؟" (تم معراج دین کی بیٹی تو نہیں؟)

میری عزیزہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں "ہاں میں اس بدنصیب کی بیٹی ہوں۔ تم لوگوں نے میرے ماں باپ کو شہید کر دیا، لو مجھے بھی مار ڈالو۔"

سکھ کہنے لگا "تیرے باپ نے ایک مرتبہ مجھ پر احسان کیا تھا اور کچہری میں میرے حق میں گواہی دی تھی۔ اس کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ میں تجھے دریا پار کروا دوں گا۔"

میری عزیزہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سکھ کے ساتھ چل پڑیں۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ سکھوں کے ایک اور جھتے نے حملہ کر دیا۔ شام ہونے میں ابھی تھوڑا سا وقت تھا۔ دریائے بیاس کا پانی ہر چیز بہائے لے جا رہا تھا۔ بارش اور بجلی کوندنے سے منظر اور بھی خوفناک ہو گیا تھا۔ وہ سکھ کہنے لگا۔ "میں دونوں بچیوں سمیت تمہیں دریا پار نہیں کروا سکتا۔ صرف ایک بچی ساتھ لے لو، دوسری یہیں چھوڑ جاؤ۔"

اسی اثنا میں شور بلند ہوا۔ جس میں مظلوموں کی چیخ و پکار اور آہیں شامل تھیں۔ سکھ جتھے بچے کھچے بے آسرا لوگوں کو مار رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری عزیزہ نے اپنی چھوٹی بچی کو چنے دے کر کیکر کے نیچے بٹھایا اور بڑی کو لے کر چل پڑی۔ تبھی چھوٹی بچی نے چلا کر کہا "ماں! میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے۔"

سکھ نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا جس سے وہ زمین پر گر گئی۔ آج بھی میری عزیزہ ہنستے ہنستے رو پڑتی اور روتے روتے ہنس پڑتی ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگیں "بھائی! مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی؟ کاش وہ سکھ مجھے وہیں قتل کر دیتا۔ مجھے ایسی سزا تو نہ ملتی۔ مجھے بیٹی روبینہ بہت یاد آتی ہے۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ اس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے "ماں! میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے......"

"بے شک اشتہارات فوری طور پر نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے ہی میں نے چوکیدار کی اسامی کے لیے اشتہار دیا اور اسی رات میرے ہاں چوری کی واردات ہو گئی"۔

یہ تو خیر ایک لطیفہ تھا، مگر حقیقت یہی ہے کہ مصنوعات کی فروخت ہو یا ملازم کی ضرورت یا پھر ضرورت رشتہ ہو یا کسی گمشدہ چیز یا شخص کی تلاش، یہاں تک کہ حکومتی، ادارتی یا انفرادی سطح پر اپنی خدمات کی تشہیر مقصود ہو، یہ بات اظہر من



الشمس ہے کہ اشتہارات ہی عوام الناس تک اپنی بات پہنچانے کا بہترین اور موثر ذریعہ بن چکے۔

اشتہار سازی کی تاریخ خاصی قدیم ہے۔ قدیم مصری تہذیب میں گہرے سبز رنگ کا نرسل نما ایک پودا "پیپرس" اشیاء کی فروخت کے پیغامات دینے اور دیوار گیر اشتہارات کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ تجارتی اور سیاسی مہمات کے پیغامات رومی سلطنت کے تاریخی شہر "پومپیائی" اور عرب کے قدیم شہروں کے کھنڈرات میں چسپاں پائے گئے۔ چیزوں کے گم ہونے یا گم شدہ چیزوں کے ملنے کی اطلاع دینے کے "پیپرس" والے اشتہارات قدیم روم اور یونان میں عام تھے۔ قدیم زمانوں میں دیواروں اور چٹانوں پر تصویر کشی بھی اس دور میں اشتہار بازی ہی کی ایک صورت ہے۔ یہ آج بھی ایشیاء، افریقا اور جنوبی امریکا میں مستعمل ہے۔

ساتویں تا گیارہویں صدی قبل از مسیح کے دوران قدیم چین میں بانسری بجا کر ٹافیاں بیچنے سے "صوتی" اشتہار سازی کا آغاز ہوا۔ اس وقت تک صرف چھپے ہوئے پمفلٹس اور سائن بورڈز کے ذریعے اشتہار سازی کی جاتی تھی۔ چین میں "سونگ" بادشاہت کے دور کی تانبے والی پرنٹنگ پلیٹ دریافت ہوئی ہے جو "جینان لیو" نامی لوہار کے اشتہاری پوسٹرز چھاپنے کے لیے بنائی گئی تھی۔

یورپ میں پانچویں سے پندرہویں صدی کے دوران قصبوں اور شہروں کی بڑھوتری تو ہوئی مگر عام لوگوں کی بڑی تعداد ان پڑھ تھی۔ اسی لیے دکانوں کے بورڈوں پر پیشے لکھنے

کی بجائے ان پیشوں کے شناختی نشانات بنائے جاتے۔ مثلاً موچی، لوہار، درزی اور سنار کے لیے جوتے، گھوڑے کی نعل، لباس اور ہیرے کی تصویریں وغیرہ۔ یہاں تک کہ آٹے کی دکان پر گندم کے تھیلے کی تصویر والا بورڈ لگا ہوتا۔

سبزیاں اور پھل کیونکہ شہر کے چوکوں اور چوراہوں پر بگھیوں اور ریڑھوں پر فروخت ہوتے تھے، اس لیے ان کے مالکان گاہکوں کو متوجہ کرنے کی خاطر آواز لگانے والے ملازم رکھا کرتے جنہیں ''ٹاؤن کرائیرز'' کہا جاتا تھا۔ پندرہویں صدی میں چھاپہ خانہ ایجاد ہونے سے قبل اشتہار سازی کی تین اقسام رائج تھیں۔ ان میں ٹریڈ مارک (پیشے کے شناختی نشان)، ٹاؤن کرائیرز اور سائن بورڈز شامل ہیں۔

آج اشتہار سازی باقاعدہ ایک صنعت کا درجہ حاصل کر چکی۔ اس کے ذریعے نہ صرف مصنوعات کو صارفین تک پہنچانے کے لیے نت نئے طریقے اور ترغیبات استعمال ہوتی ہیں بلکہ اس ضمن میں اکثر ایک رجحان یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی طرح کی مصنوعات بنانے والے ادارے اپنے اشتہارات کے ذریعے اپنے حریفوں کے لتے لیتے نظر آتے ہیں۔

مثلاً کچھ عرصہ پہلے ٹیلی ویژن پر فوم بنانے والی ایک مشہور کمپنی کا اشتہار چلتا تھا۔ اس میں دکھایا جاتا کہ ان کے فوم پر ہاتھی اور بلڈوزر چڑھنے کے باوجود فوم پچکتا نہیں۔ اس اشتہار کے ذریعے ظاہر ہے کہ کمپنی صارفین کو یہ بتانا چاہتی تھی، اُن کا فوم بہت اعلیٰ معیار کا ہے۔ اس اشتہار کے جواب میں ان کی حریف ایک اور فوم بنانے والی کمپنی نے اشتہار بنایا جس میں بتایا گیا کہ اُن کا بنایا ہوا فوم ہاتھیوں اور بلڈوزروں نہیں بلکہ انسانوں کے لیے ہے۔ یوں اشتہارات کے ذریعے اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے اور جواب دینے کی طرح پڑ گئی۔

اسی سلسلے کے اگلے قدم کے طور پر ہم نے دیکھا کہ اب یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے حریف ممالک کے درمیان بھی جا پہنچا۔ میدان جنگ اور میڈیا کے محاذ پر ثقافتی لڑائی کے بعد اشتہارات کے ذریعے وار اور جوابی وار کا مظاہرہ اس وقت دیکھنے میں آیا جب کھیل کے میدان میں بھی روائتی حریف بھارت اور پاکستان، کرکٹ ورلڈ کپ ۲۰۱۵ء کے موقع پر آمنے سامنے آئے۔ اس ٹورنامنٹ کے دوران بھارت میں 'موقع موقع' نام کا ایک اشتہار سامنے آیا جس نے شائقین کرکٹ اور عام لوگوں میں بہت شہرت پائی۔

کرکٹ ورلڈ کپ کے اس عظیم ٹورنامنٹ کی تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان آج تک اس کے کسی میچ میں بھارت کو ہرا نہیں سکا۔ یہی ریکارڈ مدنظر رکھتے ہوئے عالمی کپ ۲۰۱۵ء میں ایک بڑے بھارتی صنعتی ادارے نے اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی کے لیے ''موقع موقع'' کے ''جنگل'' والا اشتہار بنایا۔

اس میں دکھایا گیا کہ مارچ ۱۹۹۲ء سے لے کر مارچ ۱۹۹۶ء، جون ۱۹۹۹ء، مارچ ۲۰۰۳ء، مارچ ۲۰۱۱ء اور پھر ۲۰۱۵ء تک کے کرکٹ ورلڈ کپ ٹورنامنٹس میں کیسے ایک پاکستانی نوجوان ہر بار بھارت کے خلاف پاکستان کی فتح کی امید لگاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دوران میں اس کی شادی ہوجاتی ہے۔ بیٹا بھی باپ کی ان امیدوں میں شامل ہو جاتا ہے لیکن پھر ان کی تمنائیں نقش بر آب ہی ثابت ہوتی ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی جیت کا جشن منانے کے لیے آتش بازی کا سامان رکھا ہے۔ وہ پرانا ہو جاتا ہے مگر افسوس، پاکستان کوئی میچ نہیں جیت پاتا۔

''موقع موقع'' اشتہار میں بھارت نے پاکستان کا مذاق اڑایا جس کو نظر انداز کرنا پاکستانی اشتہاری ایجنسیوں کے لیے ناممکن تھا۔ لہٰذا وہ بھی کسی ایسے موقع کی منتظر تھیں جب بھارت کو مذاق اڑانے والے اشتہار کا کرارا جواب دیا جاسکے۔ بالآخر پاکستان کی کرکٹ ٹیم نے بھارت کے خلاف آئی سی سی چمپئینز ٹرافی ۲۰۱۷ء کا فائنل میچ جیت کہ انہیں یہ موقع فراہم کر دیا۔

اس فتح کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کی سب سے بڑی ٹیلی کمیونیکیشن کمپنی نے ''نوایشو، لے لو ٹشو'' کے ''جنگل'' والا اشتہار مشتہر کر دیا جو نہ صرف تمام ٹی وی چینلز پر نشر ہوکر مقبولیت کی سند پا گیا بلکہ پاکستان اور دنیا بھر میں سوشل میڈیا پر فوراً ہی وائرل ہوگیا۔ یوٹیوب، فیس بک اور دیگر سوشل میڈیا پر اس دلچسپ اشتہار کو پوری دنیا میں کروڑوں لوگ دیکھ چکے۔

اِس انوکھے اشتہار کی خصوصیت یہ ہے کہ اِسے تقریباً ڈیڑھ سال قبل بنایا گیا۔ پھر اس کو نشر کرنے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی میڈیا کی دیگر ممتاز شخصیات بھی بھارتی اشتہار ''موقع موقع'' کا جواب دینے کے لیے بے قرار تھیں۔ اس سلسلے میں مشہور اداکار فیصل قریشی نے بھی ایک مختصر ویڈیو بنا کر ریلیز کی۔ یہاں تک کہ پاکستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان سرفراز احمد بھی اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور اپنے گھر کے باہر مبارک باد دینے کے لیے جمع ہزاروں افراد کے ساتھ ''موقع موقع'' کا جنگل گا کر بھارت کی کرکٹ ٹیم کو بتایا کہ زیادہ غرور کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔

یہ دونوں مقبول ہونے والے ایڈ اس امر کا مظہر ہیں کہ اب اشتہار اتنے طاقت ور میڈیم بن چکے کہ وہ انسان کا ذہن بھی منفی یا مثبت رخ موڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

''نوایشو، لے لو ٹشو'' اشتہار کے ڈائریکٹر حسن دوار محض چھبیس سال کے ہیں۔ اس کم عمری میں ہی اچھے کام کرنے کا عمدہ ریکارڈ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ٹیلی ویژن کے لیے بنائے گئے ایک اشتہار کے لیے ۱۹۹۶ء میں بطور ایک چائلڈ اسٹار کام کیا۔ بعد ازاں ۲۰۰۹ء میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے امتحان کے لیے ڈائریکشن کے میدان کو چنا کیونکہ انہیں کیمرے کے سامنے کام کرنے کی بجائے پیچھے کام کرنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔ ان کی پہلی پروڈکشن ایک شارٹ فلم تھی جس کی تکمیل کے بعد انہوں نے اسد الحق کے ساتھ کام کرنا شروع کیا، جن کو وہ اپنا استاد مانتے ہیں۔ ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۳ء کے دوران اسد الحق سے تمام اسرار و رموز سیکھنے کے بعد انہوں نے اپنا پروڈکشن ہاؤس قائم کر لیا۔ آج وہ پاکستان کی بڑی بڑی کمپنیوں کے لیے اشتہار بناتے ہیں۔

''نوایشو، لے لو ٹشو'' کی بے انتہا پذیرائی کے بعد حسن دوار کا کہنا تھا کہ جب پاکستان نے بھارت کے خلاف میچ جیت لیا اور یہ اشتہار نشر کر دیا گیا تو ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ سپر وائرل ہوگیا۔ لاکھوں پاکستانی خصوصاً نوجوان جوش و خروش کے ساتھ اسے ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کر کے جیت کا جشن منانے لگے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اُن کے فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور بے شمار لوگ اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ اشتہار نہ صرف بار بار شیئر کیا گیا بلکہ ٹیلی ویژن کے تمام چینلوں پر بھی نشر ہو رہا تھا۔

''موقع موقع'' اور نوایشو لے لو ٹشو'' میں ایک بنیادی فرق ہے۔ موقع موقع بنا کر بھارتیوں نے پاکستانی قوم کا مذاق اڑایا اور اپنے آپ کو برتر ثابت کرنا چاہا۔ اس سلسلے میں ''باپ بیٹا'' کی اصطلاح بھی بہت مشہور ہوئی لیکن نوایشو لے لوٹشو میں پاکستانی بھارتیوں کی اشک شوئی کرتے اور انہیں بتاتے ہیں کہ کھیل کو کھیل ہی رہنے دو، اسے جنگ نہ بناؤ۔

یہ دونوں مقبول ہونے والے ایڈ اس امر کا بھی مظہر ہیں کہ اب اشتہار اتنے طاقت ور میڈیم بن چکے کہ وہ انسان کے ذہن کو بھی منفی یا مثبت رخ موڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اب ان کی قوت کو عام انداز میں نہ لیجیے، وہ رجحان ساز ثابت ہو سکتے ہیں۔



محمد ذاکر علی خاں

”حسینِ عالم“ ملک کا اِنتخاب کرنے کے لیے اگر کوئی عالمی مقابلہ منعقد کراویا جائے تو دلکش قدرتی مناظر، صحت افزا ماحول، اعلیٰ شہری منصوبہ بندی، مثالی نظامِ مواصلات، شاہراہوں کی تزئین، وُسعت، جگہ جگہ وسیع پارکوں میں کھلے ہوئے پھولوں کی رنگت، اس پر نسیم عطر بیز کی نکہت، غرض اس مقصد کے لیے کوئی بھی پیمانہ مقرر کیا جائے، کینیڈا کو پہلی پوزیشن حاصل ہوگی۔

اس سرزمین پر حسنِ قدرت کا شاہکاریوں تو ایک سے ایک خوبصورت شہر موجود ہے لیکن ”مانٹریال“ کا شمار حسین ترین دیاروں میں ہوتا ہے جو محبوب ہے اور دیارِ محبوباں بھی۔ یہ شہر صوبہ کیوبک میں واقع ہے جہاں بیشتر آبادی کی زبان فرانسیسی ہے۔ چاروں طرف دَریاؤں کی آغوش میں انگڑائیاں لیتی شاد آباد بلندیوں پر پروان چڑھنے والے اس شہر کے نام کے معنی ”کوہِ شاہی“ بنتے ہیں، کیونکہ ”مانٹ“ کے معنی ماؤنٹین اور اسپین کی زبان میں ”ریال“ کا مفہوم ”رائل“ ہے۔

مانٹریال کے وسط میں ایک پہاڑی بھی ”ماؤنٹ رائل“ کہلاتی ہے۔ اس کی تین چوٹیاں ہیں۔ ویسٹ ماؤنٹ سمٹ نامی چوٹی سطحِ سمندر سے ۶۵۹ فٹ بلند ہے۔ اسی سرسبز و شاداب چوٹی پر ایک عظیم الشان چرچ استادہ ہے۔ جس کی بنیاد ”برادر آندرے“ نامی ایک پادری نے ۱۹۰۴ء میں رکھی اور ۱۹۲۳ء میں وہاں باقاعدہ چرچ تعمیر ہو گیا جو اب سینٹ جوزف اوریٹری کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ یہ کینیڈا کا سب سے بڑا چرچ اور دنیا میں بائیسویں بڑی عمارت ہے۔

یہ کلیسا تقریباً سارے شہر سے دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے ایک طرح سے یہ چوٹی شہر مانٹریال کی نگراں معلوم ہوتی ہے۔ پرانا شہر یا کاروباری علاقہ جسے مَغربی اصطلاح میں ”ڈاؤن ٹاؤن“ کہا جاتا ہے، اس پہاڑی کے پہلو میں پھیلا ہوا ہے۔ چناچہ یہ خوشنما پہاڑی اور اطراف و اکناف شہر کا نظارہ کرنے اور ہوا خوری کے لیے بہترین مواقع فراہم کرتے ہیں۔ چرچ کے بلند ترین مینار نما حصّے پر ایک بہت بڑی صَلیب آویزاں ہے، جسے ٹیوب لائٹیں منوّر رکھتی ہیں۔ یہ طاقتور روشنیاں شام کو عَجب دلکش منظر فراہم کرتی ہیں۔

ہمارے بھائی، اچّو خان (عبدالعزیز خان) مانٹریال کے سبزہ زار کے سحر سے اس قدر مسحور ہوئے کہ اس کی ہری بھری زلفوں کے ہمیشہ کے لیے اسیر ہو کر وہیں مقیم ہو گئے۔ البتہ پردیسی ہوتے ہوئے بھی ان کے علم و ہنر کی وہاں اتنی قدر ہے جو مادرِ وطن میں میسر نہیں۔ ایک اچّو خان کیا، پاک دیس کے باصَلاحیت، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہر نوجوان کے لب پر یہی

شکوہ ہے جو اسی وجہ سے مادرِ وطن سے ہجرت پر مجبور کر دیے گئے۔ اچّو خان سے جَب ہم نے اس خوبصورت پہاڑی کو سَر کرنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے بڑے دلچسپ انکشافات کیے۔

چرچ میں اس کے بانی بزرگ برادر آندرے مَدفون ہیں جو مشہور سینٹ جوزف کے پیروکار و معتقد ہیں۔ ان بزرگ کی یہ عام شہرت ہے کہ وہ صاحبِ کرامت ہیں۔ سینٹ جوزف کی توجہات اَب بھی ان کو میسر ہیں، جس کی وجہ سے مریض وہاں پہنچ کر شفایاب ہو جاتے ہیں۔ برادر آندرے کی وفات کے بعد ان کی شہرت عالمگیر ہوئی اور بیرونی دُنیا سے بھی مریض خاص کر معذور لوگ شفایاب ہونے کی غرض سے یہاں برابر آتے رہتے ہیں۔ منتیں مرادیں مانا کرتے اور پھر صحت یاب ہو کر ہی واپس جاتے ہیں۔ اتنا کچھ سُننے کے بعد ہم نے صورتِ حال سے واقفیت حاصل کرنے اور پہاڑی سے شہر کا منظر دیکھنے کے لیے اچّو خان سے کہا کہ وہ ہمیں وہاں ضرور لے جائیں۔ انھوں نے اعزازی گائیڈ بننے کی ہماری تجویز مان لی۔

ایک شام سورج کے نقاب شب ڈالنے سے قبل وہاں پہنچ گئے۔ پہلے پہاڑی کا نچلا حصّہ آتا ہے جہاں زیادہ تر عقیدت مند اپنی گاڑیاں چھوڑ کر پاپیادہ زینے سے چوٹی سر کرتے ہیں۔ ہم نے وہاں جائزہ لینے کے لیے تھوڑا قیام کیا اور یہ دیکھ کر تعجّب ہوا کہ مریضوں کی خاصی تعداد وہاں موجود تھی بعض لوگ وفورِ شوق و احترام یا شدّتِ عقیدت سے سرشار ہو کر ہر سیڑھی پر سجدہ کرتے بالائی حصہ پر واقع چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ ایسے معتقدین کو منزل تک رسائی کے لیے ۳۸۲ سیڑھیاں طے کرنا پڑتی ہیں جسے وہ کارِ ثواب سمجھ کر قبول کرتے ہیں لیکن ہم اس بلندی پر بذریعہ کار ہی گئے جہاں سے ہم نے شہر بھر کا بھرپور سیّاحانہ جائزہ لیا۔ اس وقت سورج نظروں سے اوجھل ہو کر نیم باز آنکھوں سے الوداع کہہ رہا تھا۔ اِدھر روشنیوں کی جلوہ گری کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ انتہائی دلکش اور رنگارنگ منظر تھا، اس پر بادِ صبا کے نرم و خشک جھونکوں نے فضا کو کیف و سرور سے معمور کر دیا۔ وہاں موجود سیّاحوں اور زائرین کا مجمع حسین شام کے نظاروں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ چوٹی کے سینے پر چرچ کی بلند و بالا عمارت سینہ تانے دعوتِ دیدار اور اذنِ عبادت دے رہی تھی۔ طالبِ شفا جوق در جوق بیساکھیوں، ہاتھ گاڑیوں پر دوسروں کا سہارا لے کر اوپر پہنچ رہے تھے۔

جب ہم عمارت کے اندر داخل ہوئے تو رہبری کے لیے کارکن موجود پائے جو لٹریچر بھی فراہم کر رہے تھے۔ عمارت کے اندر داخلے کے بعد اِدھر اُدھر نظر دوڑائی پھر لٹریچر پڑھا تو وہاں ایک دنیا موجود پائی۔ دراصل سینٹ جوزف اوریٹری بہت بڑا مشنری کیمپس نکلا۔ اس میں جملہ کلیسائی ترغیبات کے لیے مختلف شعبہ جات کھلے ہیں۔ عبادت کے کئی وسیع ہال، میوزیم، لائبریری، کیفے ٹیریا، سوئز شاپ اور ایک نہایت شاداب باغیچہ بھی موجود ہے جہاں فواروں کے پانی پر طرح طرح کی روشنیاں رنگ و نور بکھیر رہی تھیں۔ اس دارالخطاب (اوریٹری) سے متعلّق چند تاریخی حقائق قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

چرچ کے بڑے گنبد کا قطر ۱۲۵ فٹ ہے، جبکہ وہ سطحِ سمندر سے ۸۵۶ فٹ اور نزدیکی سڑک سے ۵۳۷ فٹ بلند ہے۔ گرجا گھر میں جو گھنٹا نصب ہے اِس کا وزن ۱۰۹۰۰ کلو گرام ہے۔ یہ گھنٹا دَراصل پیرس کے ایفل ٹاور میں تنصیب کے لیے تیار کیا گیا تھا لیکن تکنیکی وجوہات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا چنانچہ مدّت دراز کے بعد سینٹ جوزف اوریٹری والوں نے اسے حاصل کر لیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس گھنٹے کی دھنیں بڑے موسیقاروں نے ترتیب دی ہیں۔ اس کی دل کو مائل کرنے والی موسیقی کی آواز ہر موسم میں بڑے ذوق و عقیدت سے سُنی جاتی ہے۔ اس معروف مشنری ادارے کے نظر نہ آنے والے

میزبان برادر آندرے ۱۸۴۵ء میں کینیڈا میں ہی پیدا ہوئے۔ خدمت خلق خصوصاً علاج معالجے کی نسبت سے تیس سال کی عمر میں ہی شہرت پائی۔ ۱۹۰۴ء میں سینٹ جوزف کی یاد میں گرجا تعمیر کیا جس کے بعد معتقدین اور مریضوں کی کثیر تعداد وہاں پہنچنے لگی۔ اس کے ساتھ عبادت گاہوں میں اضافہ ہوتا رہا بالآخر ۱۹۳۷ء میں برادر آندرے، دارِ فانی سے ۹۱ سال کی عمر میں کوچ کر گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ انتقال کے بعد دس لاکھ مدّاحوں اور مریدوں نے ان کا آخری دیدار کیا اور ان کی خدمات خاص طور سے مسیحا صفت ہونے کی شہرت کی وجہ سے انہیں انتہائی اہم مقام یعنی عبادت گاہ سے متّصل ہال میں دفن کیا گیا۔ یہ عمارت بلکہ پورا کیمپس ۱۹۵۵ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور چرچ کی فراہم کردہ اطلاعات کے بموجب ہر سال تقریباً بیس لاکھ مریض عبادت گزار، مزار کی زیارت، منّتیں مانگنے اور صحتیابی کی دعائیں کروانے حاضری دیا کرتے ہیں۔

فی الوقت ہمارا موضوع اس کیمپس کی وسعت اور اس کی عمارت نہیں، لہٰذا آئیے لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر جاتے ہیں۔

اَب ہم چرچ کی خاص عبادت گاہ اور برادر آندرے کے مزار والی عمارت میں پہنچ گئے اور پھر عبادت کے ہال میں داخل ہوئے جہاں تقریباً ایک ہزار نشستوں کا انتظام ہے۔ وہاں بڑے کومل سروں میں ہارمونیم اور سازوں پر منقبت اور ثنا کی نغمہ سرائی ہو رہی ہے، ہم بھی احتراماً وہاں خاموش بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں دعا کا سِلسلہ شروع ہوا اور اس طرح یہ پروقار عبادت اِختتام کو پہنچی۔ پھر ہم ہال سے متّصل گیلری میں آئے تو برادر آندرے کے مَرقد پہنچ گئے جہاں عقیدت مند خاموش دعاؤں میں مصروف تھے۔ قبر کے اطراف و جوانب بے شمار چھوٹے چھوٹے بلب فروزاں تھے۔ کچھ طاقوں میں موم بتیاں روشن کی جا رہی تھیں۔

معلوم ہوا کہ منّتیں پوری ہو جانے یعنی صحت یابی کے بعد مریض قمقمے اور بتّیاں جلاتے ہیں۔ مزار کے قریب ہی ایک برآمدے میں بیساکھیوں کا انبار لگا ہوا تھا جس کے متعلّق بتلایا گیا کہ یہ صحتیاب ہو جانے والے مریضوں کی ہیں جو وہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ مریضوں کے متعلّق معلومات کیں تو پتا چلا کہ وہاں دور دراز ممالک مثلاً فلپائن، ہالینڈ، ہانگ کانگ، جاپان وغیرہ سے بھی لوگ آئے ہوئے ہیں۔ اس طرح گویا سال کے بارہ مہینے ''آندرے'' کا سلسلہ مطب جاری رہتا ہے۔ مریضوں کو سینٹ جوزف کے بیسن (کونڈا نما چینی کے برتن) میں رکھا ہوا تیل بھی لگانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ نسخہ برادر آندرے کے زمانے سے بطور اکسیر استعمال ہو رہا ہے۔

> ہم نے ''پیر آندرے شاہ'' کے مزار میں نہ تو کوئی کھانے پینے کا اسٹال دیکھا، نہ کہیں دیگیں نظر آئیں۔ کوئی ماچس یا سگریٹ کی ڈبیا دیکھنے میں نہیں ملی۔ صفائی کا ایسا اہتمام تھا کہ ہر جگہ یکساں طور سے صاف نظر آئی

''اوریٹری کیمپس'' میں دو جگہ سینٹ جوزف کے بڑے بڑے مجسّمے بھی نصب ہیں۔ معتقدین کا خیال ہے کہ مجسموں کی برکات سے ہی مریضوں کو غموں سے نجات ملتی ہے بلکہ جملہ دلی مرادیں بر آتی ہیں۔ سینٹ جوزف کے متعلّق وہاں بہت سی کرامات مشہور ہیں جو بیشتر عیسائی ممالک میں بڑی عقیدت سے سُنائی جاتی ہیں۔ چنانچہ سینٹ جوزف کے لیے بڑے یقین سے بتلایا جاتا ہے کہ جب ۱۸۴۷ء میں پائی ٹاؤن (اوٹوا) میں ''ٹائی فائیڈ'' کی شدید وَبا پھیلی تو شہریوں نے جان بچانے کے لیے جوزف جی کے بت کے چرنوں میں پناہ

لے کر دعائیں کیں۔ ان کی کرامت سے اِس مہلک وَبا سے نجات مل گئی۔

اِسی طرح کہا جاتا ہے کہ ۱۷۱۱ء میں ایک بڑی جنگ ٹل گئی۔ ۱۶۳۹ء میں ایک جہاز برفانی تودے سے ٹکرانے والا تھا، ساری اُمیدیں ختم اور ترکیبیں ناکام ہو گئیں لیکن مسافروں نے جب سینٹ جوزف کو یاد کیا تب جہاز خلافِ توقع اِس ناگہانی حادثہ سے بال بال بچ گیا۔ الغرض ایسے کتنے ہی اور قصّے کہانیاں سننے میں آئیں۔ خود اپنے یہاں کے کسی بُزرگ کے متعلّق مشہور ہے کہ ان کی کرامت سے کئی برس کی ڈوبی ہوئی بارات دریا سے زندہ نکل آئی تھی جس پر بعض لوگ جزوِ ایمان کی طرح یقین کرتے ہیں۔

ہم اِس معلوماتی دَورے کے بعد چرچ سے باہر آئے تو برادر آندرے کی کرامات، مزارات کی بلندی اور عقیدت کیشوں کے ازدحام میں مماثلت دیکھ کر معاً کلفٹن والے بابا عبداللہ شاہ غازی یاد آ گئے کیونکہ بلحاظ کراچی ان کا مزار بھی بلندی پر واقع ہے۔ وہاں بھی حاجت مندوں، مریضوں کے ساتھ ساتھ پیداگیروں کا بھی مجمع لگا رہتا ہے۔ جمعرات کی شام، جمعہ اور اتوار کے دنوں میں وہاں میلے کی سی کیفیت رہتی ہے اور عرس کے ایّام کی گہما گہمی کا تو کہنا ہی کیا۔ اَلبتہ وہاں جگہ جگہ پلاسٹک کی تھیلیاں اڑتی، خالی ڈبے لڑھکتے اور استعمال شدہ غذا وغیرہ کے ٹکڑے بکھرے نظر آتے ہیں۔ پھر وہاں مریضوں سے زیادہ مُراد پانے والے فقیروں کی ٹولیاں ہیں جو لنگر کی دیگوں سے خوراک کی مسلسل فراہمی کے باوجود دو روٹیوں کا سوال کیا کرتے اور چرس پی کر غمِ دنیا غلط کرتے ہیں۔

لیکن ایسی ناقابلِ برداشت حَد تک ناگوار صورتِ حال کے بَرعکس اور معتقدین کے ہجوم کے باوجود ہم نے ''پیر آندرے شاہ'' کے مزار میں نہ تو کوئی کھانے پینے کا اسٹال دیکھا، نہ کہیں نیاز نذر کی دیگیں نظر آئیں۔ حیرت کی بات یہ کہ وہاں کوئی خالی ماچس یا سگریٹ کی ڈبیا دیکھنے میں آئی نہ چپس اور چاکلیٹ کی خالی تھیلیاں پڑی ملیں، بلکہ صفائی کا ایسا اہتمام تھا کہ ہر جگہ یکساں طور سے صاف ستھری نظر آئی۔ پھر وہاں دوشیزائیں تھیں نہ انھیں بہکانے والے مسٹنڈے مجاور! ڈھول پیٹنے والے، دھمال کرنے والے چرس نوش مستوں کو بھی وہاں موجود نہ پایا، بلکہ ادھر تو نہ جیب کترے تھے نہ جیب کتروں کے جیب کترے، یعنی پولیس والے۔

ہم نے کوشش کے باوجود وہاں دیگیں دیکھیں نہ لنگر لُٹتا دیکھا، گلفروش بھی ندارد تھے تو ہار کہاں نظر آتے، دوپٹوں کا بازار بھی نہ تھا، نہ چادریں اور نہ خرید کر چڑھانے والے تھے۔ غرض ہمارے مزارات کے مقابلے میں وہاں ہر طرح سے سنّاٹا بلکہ سکون سا تھا۔ افسوس کہ ہم نے اپنے محسن بزرگوں کی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہوئے بجائے تعظیم و تکریم کے مزاروں کو میلہ گاہوں کا درجہ دے دیا ہے۔

ہم نے جب ایسے انوکھے واقعات سُننے اور مناظر دیکھنے کے بعد قیام گاہ کا رُخ کیا تو پیر آندرے شاہ کی کرامات اور نہ ہی مراد یافتگان کے جوشِ عقیدت نے ہمیں متعجّب کیا کیونکہ زندگی، موت اور امراض سے شفایابی محض اللہ تعالیٰ کے کلی اختیار میں ہے، وہ جسے اور جس طرح چاہے صحت یاب کرے، جس کو چاہے مارے یا جلائے اس میں کسی سوال یا قیل و قال کی گنجائش کہاں۔ آدمی حکیم یا ڈاکٹر کے علاج سے صحت یاب ہو یا کچھ اور شفایابی کا سبب بنے، ہر حال میں صحت دینا نہ دینا ذاتِ باری ہی پر موقوف ہے۔

البتہ ہمیں جس مشاہدے نے متاثر کیا وہ ماحول کی سنجیدگی اور خاموشی تھی کہ بغیر شور وغُل مچائے ناچ گانا کیے زائرین یکسوئی اور وقار سے اپنی مقصد براری کے لیے دَست بہ دعا تھے اور کوشاں بھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دیگر ادیان کے پیروکار اپنے بزرگوں کا کِس طرح احترام کرتے ہیں۔ وہ عبادت گاہوں اور بزرگوں کے مزارات کو تماشا گاہ بنانے کے بجائے تقدس واحترام کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

◆◆◆



شریف ارپن

رات کافی سردتھی۔ انہوں نے اپنے کمروں کے پردے گرا رکھے تھے۔ انگیٹھی میں بھڑکتی آنچ کے شعلے تاپتے ہوئے وہ دونوں باپ بیٹا شطرنج کھیلنے میں محو تھے۔ باپ کو کھیل میں کافی مہارت حاصل تھی لیکن آج وہ اپنے فرزین اس بے پرواہی سے رکھ رہا تھا کہ قریب بیٹھی بیوی کو بھی غصہ آگیا۔

''آج ہوا کو تو دیکھو، کتنی سرد ہے۔'' وہائٹ نے اپنے بیٹے کی کھیل سے توجہ ہٹانے کے لیے کہا کیونکہ وہ نہایت غلط چال چل چکا تھا۔

''ہاں ابو دیکھ رہا ہوں۔'' اس نے شطرنج بورڈ پر جھکتے ہوئے کہا: ''شہ۔!!''

''میرا خیال ہے میجر صاحب مشکل ہی سے آئیں گے۔'' وہائٹ نے احساسِ شکست سے عاجز آکر دروازے کی طرف دیکھا۔ ''دور دراز جگہ پر رہنا بھی ایک مصیبت ہے۔''

''مات۔!!!''

''آپ بیٹے سے مات کھا کر بوکھلا گئے ہیں شاید۔ گھبرائیے نہیں دوسری بار آپ جیت جائیں گے۔'' اس کی بیوی نے فقرہ چست کیا۔

وہائٹ نے ایک کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بیٹے کی طرف دیکھا، پھر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''لو وہ آہی گئے۔!'' اور تینوں نووارد مہمان کا استقبال کرنے جلدی سے کھڑے ہوگئے۔

''بیگم اِن سے مِلو۔ آپ ہیں سارجنٹ میجر مورس، اور آپ......''

میجر نے بڑھ کر دونوں ماں بیٹا سے ہاتھ ملائے اور انگیٹھی کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہائٹ اس کی تواضع کے لیے مشروب اٹھا لایا۔ تیسرے گلاس کے ساتھ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی اور اس نے اپنے سفر کے واقعات سنانا شروع کیے۔ یہ تینوں بڑے انہماک سے سن رہے تھے۔

''بھئی! مورس آج سے ۱۲ سال پہلے ہندوستان چلے گئے تھے۔ اس وقت یہ بالکل چھوٹے سے تھے اور اب دیکھو ماشااللہ کتنے لحیم شحیم نوجوان بن کر لوٹے ہیں۔'' وہائٹ اپنی بیوی اور بیٹے سے مہمان کا مزید تعارف کروا رہا تھا۔

''میجر مورس! ہندوستان جانے کو تو میرا دل بھی بہت چاہتا ہے مگر......'' ''ارے!! یہ غضب نہ کرنا۔ اپنے وطن میں ہی ٹھیک ہو۔'' میجر بولا۔

''دراصل مجھے اس ملک کے فقیر، عبادت گاہیں اور مداری دیکھنے کا اشتیاق ہے! اور ہاں آپ اس روز کسی بندر کے پنجے کا ذکر بھی تو کر رہے تھے۔ کیا تھا وہ......؟'' وہائٹ نے استفسار کیا۔

''چھوڑیئے! وہ تو کوئی خاص چیز نہ تھی۔'' میجر نے ٹالنا چاہا۔

''بندر کا پنجہ؟'' وہائٹ کی بیوی نے تعجّب سے پوچھا۔

''ہاں بھابھی، بس ایک طرح کا جادوئی پنجہ ہے وہ!''

تینوں سامعین نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ''سچ!''

''اچھا بھئی اب آپ لوگوں کو دکھا ہی دیا جائے وہ پنجہ۔''

میجر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سخت منحنی سا پنجہ وہائٹ کی بیوی کی جانب بڑھایا لیکن وہ ڈر کر پرے ہٹ گئی۔ مگر لڑکا اسے ہاتھ میں لے کر بغور معائنہ کرنے لگا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ اس میں کیا خاص بات ہے؟'' وہائٹ نے پنجہ بیٹے کے ہاتھ سے لے کر اسے چاروں طرف گھماتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ پنجہ مجھے ایک فقیر نے ہندوستان میں دیا تھا، محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہر انسان کی زندگی پر تقدیر کا تسلّط ہوتا ہے اور یہ کہ جو لوگ اس معاملے میں بے جا دخل اندازی کرتے ہیں وہ صلے میں مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر پاتے۔ اور ہاں اس درویش نے اس پنجہ پر کچھ عمل بھی کیا تھا۔ اس نے مجھے یہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ تین مختلف لوگ اس سے اپنی کوئی بھی تین خواہشیں پوری کر سکتے ہیں۔''

میجر نے یہ سب کچھ اس سنجیدگی سے بتایا کہ تینوں دم سادھے سنتے رہے۔

''تو چچا جان آپ نے اپنی کوئی خواہش پوری کروائی اس سے؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''ہاں ہاں بیٹے میں تو اسے ایک مرتبہ آزما چکا ہوں۔ ایک مرتبہ کسی اور آدمی نے بھی اس کے ذریعے اپنی تمناؤں کی تکمیل کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس کی پہلی دو باتیں کیا تھیں البتہ اس کی تیسری آرزو موت تھی اور وہ مرگیا۔''

''اگر آپ اس سے مزید استفادہ نہیں کر رہے تو اسے کیوں اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے، کسی اور کو دے دیجیے؟'' وہائٹ نے کہا۔ ''خیال تو میرا بھی یہی ہے اور میں نے اسے فروخت بھی کرنا چاہا لیکن لوگ اسے خریدنے سے ڈرتے ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کی سی الف لیلیٰ کی داستان ہے۔ جو لوگ خریدنا چاہتے ہیں تو وہ پہلے اسے آزمانے کے متمنّی ہیں۔ میں اس کے لیے آمادہ نہیں۔''

''اگر آپ اسے دوبارہ آزمانا چاہیں تو کیا آپ کا مطلب پورا ہو سکتا ہے۔''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' یہ کہتے ہوئے میجر کو نجانے کیا سوجھی کہ اس نے پنجے کو اچانک آگ میں پھینک دیا۔

''ارے یہ کیا کر دیا آپ نے۔'' وہائٹ نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ جلدی سے اسے آگ سے نکال لیا۔

''اسے جل ہی جانے دو۔ کافی پریشانی کا باعث تھا یہ میرے لیے۔'' میجر نے کہا۔

''نہیں مورس! اگر آپ کو اس کی ضرورت نہیں تو مجھے ہی دے دیجیے۔'' وہائٹ نے درخواست کی۔

''نہ بابا نہ! آپ کو دینے کی بجائے اسے آگ میں ڈال دینا زیادہ بہتر ہے۔ اگر آپ اسے لینے پر ہی بضد ہیں تو پھر غور سے سن لیجیے کہ اس کے جو نتائج برآمد ہوں گے میں ان کا ذمہ دار نہیں بنوں گا ہاں۔''

''آپ بالکل مطمئن رہیے میں اسے ضرور آزماؤں گا لیکن آپ پر کوئی حرف نہ آئے گا۔'' وہائٹ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا اب یہ بتائیے کہ اسے بروئے کار کس طرح لایا

جاتا ہے؟''

میجر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''بس اسے اپنے دائیں ہاتھ میں تھام کر جو خواہش چاہتے ہوں، اسے اونچی آواز میں کہہ دیں لیکن میں پھر آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں کہ میں انجام کا ذمہ دار نہیں ہوں۔''

''میجر صاحب آپ مطمئن رہیے۔'' وہائٹ نے پنجے کو اپنی جیب میں رکھ بیوی بیٹے کی طرف پرمعنی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو واقعی یہ الف لیلیٰ کی سی داستان معلوم ہوتی ہے۔'' وہائٹ کی بیوی نے میز پر کھانا لگاتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں وہائٹ ایک تمنا تو جلدی سے یہ پوری کرو کہ میرے چار ہاتھ ہو جائیں تاکہ میں گھر کا سارا کام کاج جلدی جلدی کرلیا کروں۔''

''بہت بہتر! ابھی کرتا ہوں۔ ہاں تو...... میرے پنجے......'' اس نے جونہی جیب سے پنجہ نکالا تو سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میجر چلا گیا، تو بیوی نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے اس کے بدلے میں کچھ رقم نہیں دی اُسے۔''

''بھئی میں تو دینا چاہتا تھا لیکن اس نے خود لینے سے انکار کر دیا۔'' ''اچھا ابا جان! اب فوراً بادشاہ بننے کی تکمیل کروائیے اپنے پنجے سے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مانگا جائے!''

''میں تو کہتی ہوں کہ اگر مکان کی قسط ادا کرنے کے لیے دو سو پونڈ مل جائیں تو اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ لہٰذا کیوں نہ پہلے یہی تمنا کی جائے' ٹھیک ہے نا۔''

''اے بندر کے پنجے! مجھے دو سو پونڈ کی رقم لا کر دو۔''

وہائٹ نے میجر کے بتائے ہوئے طریقے سے پنجے سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

اچانک پنجہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑا۔ بیوی اور لڑکا اس کی جانب دوڑے۔ ''کیا ہوا! کیا ہوا؟''

''ارے یہ تو ہلتا جلتا ہے۔'' اس نے کانپتے ہوئے کہا۔

''جونہی میں نے رقم کے لیے کہا تو یہ میرے ہاتھ میں سانپ کی طرح رینگنے لگا۔''

''لیکن رقم تو کہیں نظر نہیں آرہی؟ میرا خیال ہے یہ محض آپ کا وہم ہے۔'' بیوی نے اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے کہا حالانکہ وہ خود بھی ڈر سے کانپ رہی تھی۔ ''مجھے امید ہے کہ صبح آپ کو سرہانے یہ رقم رکھی ملے گی۔'' لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر تینوں اپنے کمروں میں سونے چلے گئے۔

صبح اس کی بیوی نے ناشتا رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم بھی کس واہیات خیال کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ بھلا اس سائنسی دور میں بھی کہیں ایسا ممکن ہے۔ آپ کا میجر بھی کتنا بدھو ہے۔''

''لیکن بیگم اس کے مطابق تو شبے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔'' ''اچھا ابا میں تو ڈیوٹی پر چلا اور ہاں رقم کو میرے آنے کے بعد ہاتھ لگائیے گا۔'' لڑکے نے مذاقاً کہا۔

وہائٹ اور اس کی بیوی رات کا کھانا کھا بیٹھے ہی تھے کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ ''لو بیگم! تمہارا بیٹا ہربرٹ بھی آگیا شاید۔'' وہ جلدی سے دروازہ کھولنے گئی لیکن ایک اجنبی شخص کو پایا۔

''مادام معاف کیجیے' میں اس فیکٹری سے آیا ہوں جہاں ہربرٹ کام کرتا ہے۔'' اجنبی بولا۔ ''بات کیا ہے آخر؟ ہربرٹ کہاں ہے؟'' ماں نے بے چینی سے پوچھا۔

''بیگم صبر سے کام لو! کیوں بھائی کوئی خاص خبر لائے ہو۔''

''جناب مجھے یہ کہتے ہوئے از حد دکھ محسوس ہو رہا ہے کہ ہربرٹ بری طرح زخمی ہو گیا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں بے ہوش ہے۔''

''میرے خدا!'' ماں دل پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اجنبی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہ مشین میں آگیا تھا لیکن جلد ہی نکال لیا گیا۔ فیکٹری کے مالکان نے

مجھے آپ سے اظہارِ ہمدردی کے لیے بھیجا ہے۔ اس حادثے میں دوسرے لوگوں کے مطابق لڑکے کا ہی سارا قصور تھا۔ اس لیے فیکٹری والے اس کی ذمہ داری اپنے اوپر تو نہیں لے رہے۔ تاہم اس کی خدمات دیکھتے ہوئے علاج کے لیے فیکٹری منیجر نے کچھ رقم بھیجی ہے۔''

''کہیں یہ رقم دو سو پونڈ تو نہیں؟'' باپ نے اضطراب سے پوچھا۔

''ہاں! لیکن آپ لوگوں کو کیسے معلوم ہوا؟'' اجنبی نے تعجب سے پوچھا۔

وہائٹ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا......

کچھ دن بعد ان کے گھر کے نزدیک والے قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا۔ ہربرٹ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا تھا۔ اس کی موت کے بعد ان دونوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ دونوں خاموش بیٹھے گھنٹوں سوچا کرتے اور کبھی کبھار آپس میں باتیں کرتے بیوی کی حالت تو ازحد ناگفتہ تھی۔

''بیگم خدا کے لیے اندر آجاؤ، دیکھو باہر کتنی سردی ہے۔''

''لیکن وہائٹ کیا یہ سردی میرے ہربرٹ کو کھلے آسمان تلے پڑے ہوئے نہیں لگ رہی ہو گی۔'' پھر وہ زور زور سے رونے لگتی۔

ایک دن بولی ''وہائٹ وہ تمہارا بندر کا پنجہ کہاں ہے؟''

''میز کی دراز میں رکھا ہے۔ لیکن اب کیا کرو گی اس منحوس کو؟''

''مجھے افسوس ہے' اس کا پہلے خیال کیوں نہ آیا۔ ابھی ہمیں اپنی بقایا دو خواہشیں پوری کروانا ہیں۔''

''کیا تم پاگل ہوئی ہو۔ کیا پہلی خواہش کی سزا ہمیں کم ملی ہے جو......''

''یہ پنجہ ہاتھ میں لو اور میرے بیٹے کے زندہ ہونے کی خواہش کا اظہار کرو'' وہ جلدی سے پنجہ اٹھا لائی۔

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جب ہماری پہلی خواہش پوری ہو سکتی ہے تو یہ کیوں نہیں۔''

وہ بڑے تذبذب کے عالم میں اپنے بیٹے کے زندہ ہونے کی دعا کرنے لگا۔ آخر اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور پنجہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ وہ اسے اندھیرے میں تلاش کرنے کی غرض سے دیا سلائی جلانا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی۔ ماچس اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آواز پھر سنائی دی۔ وہ گھبرا کر دروازے کی طرف لپکا اور دروازہ بند کر لیا۔ آواز اب کافی بلند سنائی دینے لگی۔

''کیا معاملہ ہے یہ؟'' اس کی بیوی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاید بلی ہے۔'' وہائٹ نے کانپتے ہوئے کہا۔

''نہیں وہائٹ یہ تو ہربرٹ ہے، وہی اس انداز میں دروازے پر دستک دیتا تھا......'' اور پھر وہ دروازہ کھولنے دوڑ پڑی۔

''بیگم یہ کیا غضب کر رہی ہو۔ کہیں مردے بھی......''

''ارے آپ اپنے بیٹے ہی سے ڈر رہے ہیں۔ مجھے جانے دو۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔ میرے بچے میں آرہی ہوں۔''

اسی لمحے وہائٹ وہ پنجہ پردے کے پیچھے پڑا مل گیا۔ اس نے جلدی جلدی اپنی تیسری اور آخری تمنا پنجے پر پھونکنا شروع کی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

جیسے ہی اس نے تیسری تمنا پوری کی' دستک کی آواز اچانک بند ہو گئی۔ گو اس کی گونج ابھی تک کمرے میں سنائی دے رہی تھی۔ بیوی نے کرسی پر چڑھ کر کنڈی کھولی تو ہوا کا ایک سرد جھونکا اس کے جسم کو چھوتا گزر گیا۔

اس نے گھور گھور کر ہر سمت دیکھا لیکن دور تک سنسان سڑک پر بجلی کے کھمبے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس نے مڑ کر وہائٹ کو دیکھا جو پنجہ لیے خاموش کھڑا تھا۔

''وہائٹ' یہ تم نے کیا کیا!!!! او وہائٹ!''

اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

●●●



دار چینی کے کرشمے

بیسیوں امراض میں افاقہ پہنچانے والی درخت کی چھال کا صحت بخش قصّہ

حکیم سید مجاہد محمود برکاتی

برصغیر کے کھانوں میں گرم مسالوں کا اہم جز دار چینی ہے۔ اس کو باورچی خانوں کے بہترین خوشبودار مسالے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس میں صحت یاب کرنے کی ممتاز اور قابل ذکر خصوصیات موجود ہیں۔ دار چینی جسے ہندی میں دار چینی اور انگریزی میں سینامول کہتے ہیں، ماہیت کے اعتبار سے ایک درخت کی چھال ہے، جس کی رنگت سرخی مائل زرد یا ہلکی سیاہی مائل ہوتی ہے، ذائقہ قدرے شیریں تلخی لیے ہوتا ہے۔

اس کی کاشت زیادہ تر سری لنکا، ہندوستان اور چین میں کی جاتی ہے اور جزائر الشرق ہند میں خودرو ہوتا ہے۔ دار چینی اقسام کے اعتبار سے تین قسم کی ہے جو حجم اور رنگت میں مختلف ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں استعمال ہونے والی چین اور سری لنکا کی دار چینی سب سے عمدہ اور خوشبودار ہوتی ہے۔ اطبا نے اس کا مزاج گرم خشک درجہ دوم بتایا ہے۔

جدید سائنسی تحقیق نے بھی اس کا سر ریاح صلاحیت کو بہت اہمیت دی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں شامل فراری تیل انتہائی لطیف اجزا کا مرکب ہوتا ہے جو جلد جزبدن بن جاتا ہے۔ یہ اجزا معدے اور آنتوں پر اثر انداز ہو کر ریح کے اخراج کا سبب بنتے ہیں۔ یوں معدے اور آنتوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جو دار چینی استعمال ہوتی ہے، اس میں ٹیننین کا جز بہت کم ہوتا ہے، اس لیے یہ کاسر ریاح تو ہے مگر قابض نہیں۔

دار چینی خوشبودار، خشک گرم کسیلی، ریاح اور کف ختم کرنے والی ہے۔ کھانے کو ہضم کرنے، بھوک بڑھانے، پیٹ کے کیڑے مارنے اور جگر کو متحرک کرنے والی ہے۔ بلغم ختم کرتی اور تپ دق میں بہت مفید ہوتی ہے۔ دار چینی دل متحرک اور جسم میں پھرتی پیدا کرتی ہے۔ یہ خون صاف کرتی ہے اور اس کے استعمال سے خون میں سفید خلیات (WBC) کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

سر درد کو ختم کرتی ہے۔ دار چینی کے استعمال سے پیشاب زیادہ بنتا ہے۔ قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے رحم سکڑ جاتا ہے۔ دار چینی کا تیل پیٹ سے ریاح کو خارج کرتا ہے۔ یہ اینٹی سپٹک ہے، اس سے زخم کی صفائی ہوتی اور زخم بھر جاتا ہے۔ درد دور ہو جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے جسم میں پھرتی آتی ہے۔

دار چینی سے روزمرہ کے کئی طبی خلل دور کرنا ممکن ہے۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

بدہضمی ہونا، بھوک نا لگنا، پیٹ میں گیس کا بننا اور پیٹ میں درد: صبح دوپہر اور شام، دن میں تین مرتبہ پانی کے ساتھ دو دو گرام دار چینی کا پاؤڈر ذرا سی ہینگ ملا کر لینے سے کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ بھوک لگنے لگتی ہے پیٹ میں ریاح کا بننا بند ہو جاتا ہے اور پیٹ میں درد نہیں رہتا۔

متلی اور قے: پانچ پانچ بوند دار چینی کے تیل کو مصری کے ساتھ ملا کر کھانے یا دار چینی کو منہ میں رکھ کر چوسنے سے یا دار چینی کا کاڑھا پینے سے متلی اور الٹیاں آنا بند ہو جاتی ہیں۔

دست اور پیچش: دار چینی کا کاڑھا بنا کر پینے سے دن میں دو تین مرتبہ دو دو گرام پاؤڈر پانی کے ساتھ لینے یا دار چینی کو

پان میں لگانے والے کتھے کو ہم وزن مقدار میں پیس کر آدھا آدھا چمچ ہر روز دن میں تین مرتبہ پانی کے ساتھ لینے سے دستوں اور پیچش میں بہت افاقہ ہوتا ہے۔ بار بار حاجت کا عمل بھی کم ہو جاتا ہے اور پاخانہ بندھ کر آنے لگتا ہے۔

ٹائی فائیڈ بخار: اس بخار میں دیگر ادویات کے ساتھ ۳ سے ۵ بوند دار چینی کا تیل دینے سے بہت افاقہ ہوتا ہے۔ اس سے پیٹ میں اپھارہ نہیں آتا۔

جگر کا بڑھنا: دار چینی کا پاؤڈر یا اس کا تیل استعمال کرتے رہنے سے جگر کے امراض میں بہت فائدہ ہوتا ہے۔

> دار چینی خوشبودار، خشک گرم کسیلی، ریاح اور کف ختم کرنے والی ہے۔ کھانے کو ہضم کرنے، بھوک بڑھانے، پیٹ کے کیڑے مارنے اور جگر کو متحرک کرنے والی ہے۔

پیٹ میں کیڑے: دو تین روز تک صبح دوپہر شام دن میں تین مرتبہ پانی کے ساتھ دو دو گرام دار چینی کا پاؤڈر لینے سے پیٹ کے کیڑے نیم مردہ ہو کر باہر نکل جاتے ہیں۔

بواسیر: دار چینی کا پاؤڈر یا اس کا استعمال کرتے رہنے سے بواسیر میں بہت افاقہ ہوتا ہے۔

دانت درد: دار چینی کے تیل کو دانت کی جڑ میں لگانے سے دانت درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔

سر درد: دار چینی کو پانی میں پیس کر اس کا ماتھے پر لیپ کرنے سے سر درد میں افاقہ ہوتا ہے۔

زکام اور فلو: پانچ گرام دار چینی، دو لونگ اور چوتھائی چمچ سونٹھ کو پیس کر ایک لیٹر پانی میں ابال لیجیے۔ چوتھائی پانی باقی رہ جانے پر کاڑھا بن جانے پر اسے چھان کر اس کے تین حصے کر لیجیے۔ ایک دو چمچ صبح، دوپہر اور شام پلانے سے فائدہ ہوتا ہے۔

تتلانا: دار چینی چباتے رہنے سے تتلانا ٹھیک ہو جاتا ہے۔

گلے کا کوا بڑھنا: گلے کے کوے کے بڑھ جانے پر دار چینی کو باریک پیس کر اسے انگلی سے کوے پر لگانے اور مریض کو رال ٹپکانے کے لیے کہیے، اس سے کوے کا بڑھنا رک جائے گا اور کھانسی بھی ٹھیک ہو جائیگی۔

بلغمی کھانسی: صبح دوپہر اور شام دن میں تین تین مرتبہ پانی کے ساتھ دو دو گرام دار چینی کا پاؤڈر لینے سے بلغم نہیں بنتا اور کھانسی کو آرام آجاتا ہے۔

پھیپھڑوں کی ٹی بی: پانچ پانچ بوند دار چینی کا تیل صبح دوپہر اور شام دن میں تین مرتبہ مصری کے ساتھ لینے سے پھیپھڑوں کی ٹی بی میں بہت آرام آجاتا ہے۔ ٹی بی کے زخم پر دار چینی کا تیل لگایا جاتا ہے، اس سے زخم بھر جاتا ہے۔

دل کی کمزوری: دار چینی کے پاؤڈر کو تیل کی شکل میں استعمال کرنے سے دل کی کمزوری دور ہو جاتی ہے۔

اعصابی کمزوری، اعصابی درد (Neuralgia) لقوہ (Facial Paralysis) ہلکا (Paresis) اور ادھرنگ (Paralysis): ان امراض میں چند روز تک باقاعدہ صبح دوپہر اور شام دن میں تین تین مرتبہ تین تین گرام دار چینی کا پاؤڈر پانی کے ساتھ یا پانچ پانچ لونگ اور دار چینی کا تیل مصری کے ساتھ ملا کر لینے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

سیلان الدام یا زیادہ خون بہہ جانا: پھیپھڑوں اور سیلان رحم سے سیلان الدم ہونے پر دو تین گرام دار چینی کا پاؤڈر پانی کے ساتھ لینے یا دار چینی کا کاڑھا بنا کر پلانے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

رحم کا پھیل جانا (Subinvolution of the uterus): زچگی ختم ہونے کے بعد عموماً رحم سکڑ کر اپنی معمول (نارمل) کی حالت میں نہیں آتا۔ اس صورت میں دو گرام دار چینی کا پاؤڈر پیپلی کی جڑ اور تھوڑی سی بھانگ کے

ساتھ ملا کر صبح دوپہر اور شام زچہ کو کھلانے سے رحم اپنی معمول کی حالت میں آجاتا ہے۔

پیشاب کی رکاوٹ: دار چینی پیشاب آور ہوتی ہے، لہٰذا صبح دوپہر اور شام پانی کے ساتھ دو دو گرام دار چینی کا پاؤڈر لینے سے پیشاب بلا تکلیف اور کھل کر آجاتا ہے۔

پیشاب میں پس (Pyuria): دار چینی کا پاؤڈر یا اس کا تیل استعمال کرنے سے پیشاب صاف ہوجاتا ہے۔

ویرج کی کمزوری: تین تین گرام دار چینی کا پاؤڈر صبح اور رات سونے سے پہلے گرم دودھ کے ساتھ لینے سے ویرج بڑھتا اور گاڑھا ہوتا ہے اور اس کو تقویت ملتی ہے۔

کینسر: کثیر مقدار میں دار چینی کے استعمال سے کینسر میں افاقہ ہوتا ہے۔

منہ سے بدبو آنا: دار چینی منہ میں رکھ کر چبانے سے منہ کی بدبو ختم ہوجاتی ہے اور دانت بھی مضبوط ہوتے ہیں۔

جلدی امراض اور سوجن: دار چینی کو پانی میں پیس کر اس کو متاثرہ مقام پر لیپ کرنے سے جلدی امراض ختم ہوجاتے ہیں اور سوجن زدہ مقام پر لیپ کرنے سے سوجن اتر جاتی ہے۔

بچھو وغیرہ کا کاٹنا: جہاں بچھو کا ڈنک لگ جاتا ہے، اس پر دار چینی کا تیل لگایا جاتا ہے۔ اس سے سوجن درد اور جلن دور ہوجاتی ہے۔

گیس سے پیٹ میں درد: پیٹ کے اس درد کو دار چینی دور کرتی ہے اور قوت انہضام بڑھاتی ہے۔ دار چینی قلیل مقدار میں ہی استعمال کریں۔ زیادہ مقدار میں نقصان دہ ہے۔

دست: (۱) ۲ گرام پسی ہوئی دار چینی گرم پانی سے پھانک لینے سے دست بند ہوجاتے ہیں۔

(۲) دار چینی اور کتھا برابر مقدار میں پیس کر آدھا چمچ تین بار روزانہ لینے سے دست بند ہوجاتے ہیں۔

قبض، بدہضمی: دار چینی، سونٹھ، زیرہ اور الائچی کی تھوڑی تھوڑی مقدار ملا کر کھاتے رہنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ ان سب کو برابر مقدار میں پیس کر آدھا چمچ گرم پانی سے لیں۔

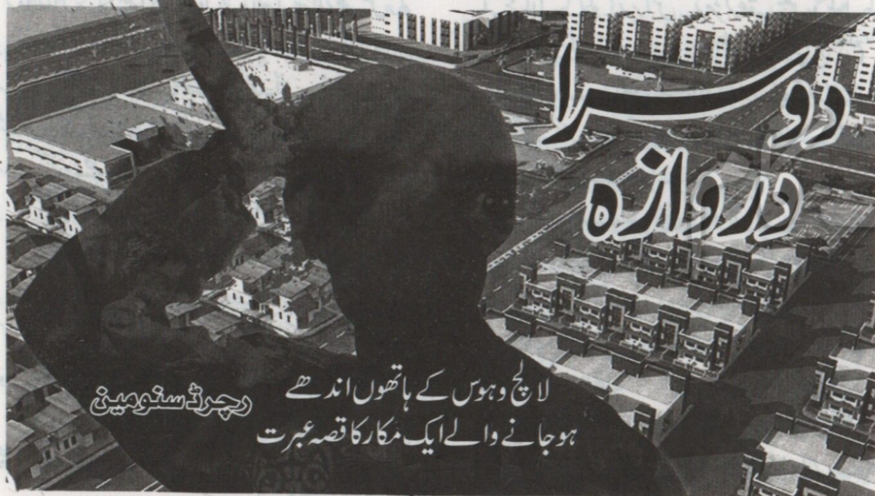
انفلوئنزا: ۵ گرام دار چینی، ۲ لونگ، چوتھائی چمچ سونٹھ۔ ان سب کو پیس کر ایک کلو پانی میں ابالیں۔ چوتھائی پانی رہ جانے پر چھان کر اس پانی کے تین حصے کرکے دن میں تین بار مریض کو پلائیں۔

دودھ ہضم نہ ہونا: بعض لوگوں کو دودھ ہضم نہیں ہوتا اور لوگ اس سے بادی ہونے اور ریاح ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔ ایسے افراد ایک لیٹر دودھ میں تین گرام دار چینی کا سفوف ملا کر اسے جوش دے کر پئیں تو اس سے نہ صرف دودھ ہضم ہوگا بلکہ قوت ہضم بھی بڑھے گی۔

دمہ اور کھانسی: جن لوگوں کو کھانسی اور دمہ کی شکایت ہو وہ ایک گرام دار چینی دو چمچ شہد کے ساتھ صبح اور شام کھائیں۔

الرجی نزلہ زکام: ماحولیاتی آلودگی خصوصاً فضائی آلودگی کی وجہ سے نزلہ، زکام اور چھینکیں آنے کا عارضہ عام ہوگیا ہے۔ بعض لوگوں کو صبح ہوتے ہی ناک سے پانی بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے وہ برگ بنفشہ ۶ گرام تخم میتھی ۶ گرام اور دار چینی ۳ گرام پیس کر آدھے گلاس پانی میں جوش دے کر صبح شام پندرہ دن تک پئیں۔

موٹاپا: موٹاپا آج کا عام مسئلہ ہے اور یہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، کیوں کہ آج کل کھانوں میں لوگ فاسٹ فوڈ کو بہت زیادہ شامل کرنے لگے ہیں جو جسم میں بہت زیادہ چربی بڑھاتا ہے اور پھر لوگ وزن کم کرنے کے لیے طرح طرح کے ٹوٹکے استعمال کرتے ہیں۔ موٹاپا دور کرنے کے لیے ایک کپ پانی میں ایک چمچ دار چینی اور تین چمچ شہد ڈال کر ابال لیں۔ رات کو سونے سے پہلے اس کو چائے کی طرح پی لیں۔ اگر پوری نہ پی جائے تو بچا کر رکھ دیں اور دوسری صبح پی لیں۔ اس کے استعمال سے آپ کا وزن بہت جلد کم ہوجائے گا۔



رات کے ایک بجے اُس سب وے اسٹیشن پر صرف چند افراد اترے' جو سنی ہلز نامی آبادی کے لیے بنایا گیا تھا۔ وہاں چھوٹے مکانوں کا ایک بڑا سلسلہ موجود تھا۔ اُن لوگوں میں ہیری بھی شامل تھا' جو ایک وجیہہ اور خوش قامت شخص تھا۔ وہ بوجوہ سب سے آخر میں اترا۔

اُس نے ٹوپی اور دستانوں کے علاوہ چاقو اپنے کوٹ کے اندر چھپا رکھا تھا۔ وہ ان کے بغیر کبھی نہیں چلتا تھا کیوں کہ اُسے معلوم نہ تھا کہ کب اُسے موقع ملے گا...... آج رات' یا پھر تین دن بعد۔ اگر وہ رات کے چوکی دار کی جگہ سے اُس کی نظر میں آئے بغیر کسی طرح گزر جاتا تو یہ موقع اُسے مل سکتا تھا۔

حالانکہ ہیری کا منصوبہ کچھ عرصے پہلے ہر طرح مکمل ہوچکا تھا مگر اُس نے احتیاطاً جلد بازی نہیں کی تھی۔ وہ میری کو تین سال سے بھگت رہا تھا۔ کچھ اور وقت بھی گزار سکتا تھا۔ میری اشیائے صرف کی ایک بڑی دکان میں جز وقتی ملازمت کرتی تھی۔ وہ ہر ہفتے اپنی ساری تنخواہ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیتی تھی۔ میری یہ کام بڑی مسکینی سے کررہی تھی' اس خوش فہمی کے تحت کہ وہ دونوں ایک مشترکہ بچت کھاتے کو بڑھا رہے ہیں۔

ہیری اچھی خاصی رقم کماتا تھا مگر وہ اُسے ہمیشہ اپنے اوپر خرچ کرتا تھا۔ وہ ایک نمائش پسند اور خود نما آدمی تھا۔ اُسے یہ بہر حال نہیں معلوم تھا کہ اُس کی یہ عادات کس حد تک موثر ہیں۔

اس کا پتا اُسے تب چلا تھا جب ویلما پڑوس والے گھر میں آکے مقیم ہوئی۔ اسے یہ بات سمجھ نہیں آسکی کہ آخر ویلما جیسی عورت سنی ہلز جیسی جگہ پر آکے کیوں رہ رہی ہے جہاں بنے ہوئے چھوٹے مکانات اپنے نقشے میں اس قدر یکساں تھے کہ انھیں پہچاننا مشکل تھا۔ ویلما نے صرف سرسری انداز میں اس قدر بتایا تھا کہ کچھ دشواریوں کی وجہ سے وہ ادھر آئی ہے۔ اُس نے باتوں سے یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ویلما کو نائٹ کلب کی نوکری چھوڑنی پڑی ہے۔

جس وقت سے اُنھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا' اُن کو اپنے درمیان زبردست مقناطیسی کشش کا احساس ہوا تھا اور کسی نے بھی خود کو روکنے کی سعی نہیں کی تھی۔ ملاقات کے بعد ہیری نے خود کو رات کی ڈیوٹی پر تبدیل کروالیا تھا

تا کہ دن میں وہ ویلما سے مل سکے کسی قسم کی پیچیدگی کے بغیر۔

مگر بات بنی نہ تھی۔ راتیں اُسے بہت بیزار کرنے لگی تھیں کیوں کہ اُسے اُس گھر میں جانا پڑتا۔ جس سے اُس کا اب کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور جہاں ایک ایسی عورت رہتی تھی جس سے وہ کوفت محسوس کرتا تھا۔

''ڈیئر!'' اس نے ایک دن ویلما سے کہا ''کاش اس عورت کے ساتھ کچھ ہو جائے......کوئی حادثہ وغیرہ!......''

''تم چاہو تو سب کچھ ویسے ہی ہو سکتا ہے جیسے کہ یہ کوئی حادثہ تھا۔'' ویلما نے سرگوشی میں کہا۔

''اگر میں یہ کام کروں تو تم میرا ساتھ دو گی؟''

''جی۔''

''کہو تو میں اسے طلاق دے دوں۔''

''تمھیں مہر کی رقم ادا کرنی ہو گی۔ ہمارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔''

''تمھیں رقم چاہیے؟'' ہیری نے پوچھا اور ویلما کی آہستہ سے اٹھتی ہوئی پلکوں نے اس کی تصدیق کر دی۔

اس کے بعد ہیری نے عملی اقدامات کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے پہلے ایک فلم رول خریدا اور اُسے لا کر گھر میں رکھ دیا۔ وہ کام آ سکتا تھا۔ وہ سب وے کی آخری ٹرین پکڑتا تھا اور سب سے آخر میں اترتا۔ یہ بطورِ احتیاط تھا۔ اُس نے سب وے کا شیڈول چیک کروایا اور معلوم کر لیا کہ رات کی ریلیں ہمیشہ پندرہ منٹ کے وقفے سے چلتی ہیں۔ ہر رات وہ اپنی گھڑی کو سب وے اسٹیشن کی گھڑی سے ملاتا تھا۔ یہ بھی احتیاطی اقدام تھا۔

آج کی رات بھی دوسری راتوں سے مختلف نہ تھی۔ وہ سب وے کے دروازے سے باہر آیا' اُس نے ادھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کیا کہ اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہاں صرف ایک ٹیکسی کھڑی تھی اور اُس کا ڈرائیور اندر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ساری سڑک سنسان تھی۔

اُس نے سڑک عبور کی' سامنے والے لمبے بلاک کی طرف چل دیا اور کوئی سویں مرتبہ اُس نے سوچا۔ پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہاں رکھے چاقو کو محسوس کیا۔ اُسے یہ چاقو ایک عوامی بیت الخلا سے ملا تھا۔ اس کا سراغ لگانا کسی طرح ممکن نہ تھا اور سوائے میری کے کسی نے اس کی کوئی جھلک نہیں دیکھی تھی۔

جوں ہی وہ رات کے چوکی دار کے بوتھ تک پہنچا' اُس نے رفتار بڑھا دی۔ پھر وہ اُس بوتھ کے قریب ہو گیا۔ اُس کا دل زور سے دھڑ کا' مائک ہوگان وہاں موجود نہ تھا اور...... یہی وہ موقع تھا جس کا اُسے انتظار تھا۔

ہیری پُرسکون رہا۔ وہ اُس جانب اتر گیا جہاں اندھیرا تھا' سنی ہلز کے سجے ہوئے گیٹ وے سے پرے۔ اُس نے سر پر ٹوپی جمائی اور اُس کا چھجا سر پر جھکا لیا۔ اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر لیے۔ پھر فٹ پاتھ چھوڑ دیا اور سامنے کے صحنوں کی طرف چلا۔ وہ مکانوں کے سائے میں چل رہا تھا۔ کوئی اُسے دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ وہ کوئی چور ہے۔

ٹھیک ہے۔ کوئی دیکھتا ہے تو دیکھے' زیادہ سے زیادہ وہ بعد میں پولیس کو یہی بتاتا کہ اُس نے لان میں سے کسی چور کو گزرتے دیکھا تھا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ کوئی گدھا اُسے دیکھ لے۔

اپنے بلاک کے کونے پر اُس نے مڑ کر عقب میں دیکھا۔ اُس نے خود کو پُرسکون کیا۔ جب اُسے اطمینان ہو گیا کہ مطلع صاف ہے' اُس نے دوڑ لگائی' بہت احتیاط اور بے آواز انداز سے' جھکے جھکے۔ اُس کے اندر ہیجان پیدا ہو رہا تھا اور یہ یقین بھی کہ سب کچھ عمدگی سے ہو رہا ہے۔

اُس نے دروازے میں اپنی کنجی داخل کی اور اندر قدم رکھا۔ اُسے خوشی ہوئی کہ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اگر وہ میری کی صورت دیکھ لیتا تو ہو سکتا ہے کہ وہ تذبذب میں پڑ جاتا اور کچھ بھی نہ کر پاتا۔ وہ کوئی سفاک قاتل نہیں تھا۔ وہ تو عام سا آدمی تھا جسے حقائق کا سامنا تھا۔

اُس نے چاقو نکالا اور اُسے دبا کر کھول لیا۔ اُس کی ہتھیلی بھیگ رہی تھی مگر اُس نے دستہ مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اُس نے

اپنا بازو ایک بار گھمایا۔ چہرے کے نقوش میں سختی پیدا ہو گئی۔

وہ مایوسی سے ہال کی سمت بے آواز قدموں سے بڑھا۔ وہ ایک زینہ اترا۔ اس نے دائیں جانب والا دروازہ کھولا۔ میری کا بستر ٹھیک اس کے عقب میں تھا۔

اس نے کئی بار وار کیے اور بہت سفا کی سے۔ اس مرحلے سے وہ بہت خائف تھا مگر یہ جلد ہی ختم ہو گیا......اور بہت عمدگی سے بھی۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی تھی اور بس...... وہ جاگ بھی نہیں سکی تھی۔

پھر وہ مڑا اور باہر نکل گیا تھا۔ اُس نے گھر کا طواف کیا اور بیڈ روم کی کھڑکی کے نیچے جا رکا۔

اُس نے ہاتھ پر دستانہ چڑھایا اور شیشے پر ایک زور کی ضرب رسید کی۔ کھنکھناہٹ سے شیشے ٹوٹے اور بس۔

جب وہ بعد میں دوبارہ کمرے میں آیا' تو اُس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ نقدی اٹھا سکتا۔ اس طرح پولیس کو یقین آ جاتا کہ کوئی باہر سے گھر میں گھسا تھا۔

اُس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

اُسے حیرت ہوئی' اس کام میں بس چھ منٹ لگے تھے۔ وقت کے مطابق سب کچھ کرنے سے اُسے بڑی تقویت ہوئی۔

وہ دوبارہ سڑک پر آ گیا۔ اُس نے بلاک کا لمبا چکر کاٹا اور دوبارہ سب وے کی طرف چل دیا۔ وہ اب جان بوجھ کر دوڑ رہا تھا اور اس طرح کہ فٹ پاتھ پر اُس کے قدموں کی دھم دھم بھی ابھر رہی تھی۔ یہ بھی اُس کے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ دور سے اُسے دیکھ لیا جائے تا کہ یہ بات ثابت ہو سکے کہ ادھر کوئی بھاگ رہا تھا۔

اس نے میدان والا مختصر راستہ اختیار کیا اور کوڑے کے ڈھیر کے سامنے رک گیا۔ اس جگہ اُس نے چاقو اور دستانے ٹھکانے لگائے۔ پھر اندھیرے میں اپنی کنجیاں ٹٹولیں۔ اگر پولیس اس پر شبہ کرتی یا زیادہ گہرائی میں تفتیش کرتی تو وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے پاس وہ کنجی برآمد ہو جو ویلما کے گھر کی تھی۔ اُس نے کنجی وہیں پھینک دی۔

پھر اپنی کنجیوں کا گچھا دوبارہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اُس نے ٹوپی سر پر جمائی اور تیزی سے سب وے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ وہ وقت سے چند منٹ پہلے وہاں پہنچ گیا۔ ایک طرف تاریکی میں کھڑا ہو گیا جدھر ایک اخبار فروش کی دکان تھی۔ اُس نے کئی بار لمبی لمبی سانسیں بھریں اور تمام تفصیلات کو ایک ایک کر کے دہرایا۔

کوئی فروگزاشت نہیں ہوئی تھی' کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ اُسے یقین تھا' ویلما منہ بند رکھے گی' اُسے ویسے بھی چپ ہی رہنا تھا...... اور اگر وہ منہ بند نہ بھی رکھتی تو کوئی ثبوت نہیں تھا' کوئی گواہ نہیں تھا اور نہ ہی میری کے ساتھ کسی قسم کی تکرار کا ذکر کبھی سامنے آتا۔ اُس کا چاقو سے بھی کوئی تعلق قائم نہیں ہو سکتا تھا۔

> کوئی فروگزاشت' کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ اُسے یقین تھا' ویلما منہ بند رکھے گی...... اور اگر وہ منہ بند نہ بھی رکھتی تو کوئی ثبوت، کوئی گواہ نہیں تھا اور نہ ہی میری کے ساتھ کسی قسم کی تکرار کا ذکر کبھی سامنے آتا۔

پھر اُس نے سب وے کی ریل کو رکتے سنا۔ چند مسافر باہر نظر آئے۔ اُس نے چند لمحے انتظار کیا پھر وہ تاریکی سے روشنی میں نکل آیا۔ وہ ٹیکسی ابھی تک وہیں تھی مگر ڈرائیور اب جاگ رہا تھا۔ ہیری نے اُس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اپنے راستے پر چل دیا۔

اب وہ چوکی دار کے بوتھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہوگان بھی اب اُسی کے ساتھ گھر جانے والا تھا' وہ اس وقت موجود ہوتا جب لاش دریافت ہوتی۔ یہ بھی ایک ضروری بات تھی مگر ہیری نے اس کے لیے پہلے سے پس منظر تیار کر رکھا تھا۔ وہ اِدھر ہر رات رکتا تھا۔

ہوگان اپنے سائبان سے باہر نکل آیا۔ اس نے ہیری کو پہچانا اور مسکرایا۔ ''شب بخیر ہیری!'' اُس نے سلام کیا۔ ''تم بالکل صحیح وقت پر پلٹے ہو۔''

ہیری مسکرایا۔ ''ہاں...... اور دوست تم نے جس فلم رول کی بات کی تھی' وہ میں لے آیا ہوں۔ گھر پر رکھا ہے۔ تمھیں اُس کی قیمت چکانے کی ضرورت نہیں۔''

''بہت شکریہ مسٹر ہیری۔''

''چلو میرے ساتھ۔ میں تمھیں دے دیتا ہوں۔''

''شکریہ۔'' چوکی دار نے کہا اور اس کے ساتھ ہولیا۔

راستے میں وہ اپنے مسائل کے بارے میں بولتا رہا۔ ہیری اُس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ جب وہ مڑے اور گھر کے پاس پہنچے تو ہیری نے جیب سے چابیاں نکالیں۔ وہ مکان کے سامنے رک گیا جس کا نمبر اڑتالیس تھا۔

''آؤ...... اندر آجاؤ!'' اس نے ہوگان سے کہا۔ ''میں نے اُسے خواب گاہ میں رکھا ہوا ہے' صرف ایک منٹ لگے گا۔''

اُس نے اپنی چابی مکان کے دروازے میں پھنسائی اور گھمایا' مگر وہ گھومی نہیں۔ اُس نے اُسے نکال کر دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' ہوگان نے پوچھا۔ ''کیا غلط کنجی لگادی تھی؟''

ہیری نے اُس کی طرف خوف بھری نظروں سے دیکھا اور کنجی دوبارہ دروازے میں ڈال دی۔

اب دروازہ کھل گیا۔ میری' جو اس وقت اپنی عبا کی بدی مزید کس رہی تھی' بولی' ''اچھا ہوا تم جلد آگئے۔ میں پریشان تھی۔''

ہیری نے بے یقینی سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اُس کے پیٹ میں گولا سا بنا تھا اور اب حلق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس نے خود کو سنبھالنے کے لیے دروازے کی دہلیز تھام لی۔

''یہ دروازہ!...... یہ دروازہ! بالکل ویسا ہی تھا...... ویلما کے دروازے کی طرح۔''

میری کی آواز اُسے جیسے بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

''میں نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی تھی...... اور میں جاگ گئی تھی۔'' میری بول رہی تھی' ''مجھے یقین ہے کہ پڑوسی عورت کے ساتھ کچھ ہوا ضرور ہے اور...... اور میں بہت بری طرح ڈر گئی۔ ذرا سوچو!...... یہ سب کچھ میرے ساتھ بھی تو ہوسکتا تھا۔''

◆◆◆

اندیشہ

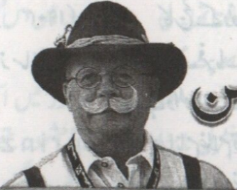
ریل میں ایک صاحب اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اپنا بڑا سا بیگ انھوں نے بیچ راستے میں رکھا ہوا تھا۔ آتے جاتے مسافر اس سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہے تھے۔

ایک مسافر اسے ایک طرف ہٹانے لگا تو وہ صاحب فوراً اخبار چھوڑ کر اسے روکتے ہوئے بولے: ''ارے میاں! یہ کیا کر رہے ہو؟ بیگ تو یہیں رکھا رہنے دو۔''

''جناب! لوگ اس سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہے ہیں۔ آپ اسے کہیں ایک طرف رکھیں۔'' مسافر نے شائستگی سے کہا۔

''ہرگز نہیں!'' وہ صاحب فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ ''اسے یہیں رکھا رہنے دو۔ میں بھلکڑ آدمی ہوں۔ اگر لوگ اس بیگ سے ٹکرا ٹکرا کر نہیں گریں گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں اسے ریل میں ہی بھول جاؤں گا۔''

زبانِ یارمن جرمن



جرمنی میں طویل عرصہ گزارنے والے ایک پاکستانی کے قلم سے بدیسی زبان کی پُرلطف جھلکیاں

میاں غلام قادر

ہم نے جرمنی میں ریل کے ڈبے میں سفر کرتے ہوئے یہ ''فصیح و بلیغ شعر'' ملاحظہ کیا اور اہل وطن کی راہنمائی کے لیے اسے ڈائری میں نوٹ کر لائے۔ آپ بھی اسے سماعت فرمایئے اور جرمنوں کے ذوق شعر کی داد دیجیے۔

Roucher Steig in "Roucher;ein
Oder lass Das Raucher Sein

رَوخر شٹا ئِگ اِن رَوخر آئنِ
اَوڈر لاس ڈس رَوخن زائنِ

جرمن زبان میں رَوخر سگریٹ نوش کو کہتے ہیں۔ گاڑی کے جس ڈبے میں سگریٹ نوش سوار ہوں، اسے بھی اصطلاحاً ''روخر'' کہا جاتا ہے۔ ''آئن شٹائی گن'' کے معنی ہیں ''ڈبے میں سوار ہونا'' اور 'لاسن' کا مطلب ہے ''ترک کرنا''۔ شعر کا مطلب اب بالکل واضح ہے کہ یا تو سگریٹ نوش اپنے ''ہم جنسوں'' کے ساتھ سگریٹ نوشوں والے ڈبے میں بیٹھے یا بصورتِ دیگر سگریٹ نوشی ترک کر دے۔ کہیے شعر پسند آیا؟

اب تو جرمنوں پر کوئی یہ الزام نہیں دھر سکتا کہ وہ سوز و گداز کی نعمت سے محروم ہیں اور انہوں نے روح کی بالیدگی کے لیے اب تک کچھ نہیں کیا۔ ہم نے یہاں صرف جرمن ریلوے کی شعر و شاعری کا تذکرہ کیا ہے۔ ہمارے پاس سند کے طور محکمہ ٹیلیفون کی پوری نظم صنائع و بدائع سے پُر جرمن میں موجود ہے۔ یہ اس بات کا کھلم کھلا ثبوت ہے کہ اغیار بھی عرصہ دراز سے دَرد کی دولت سے مالا مال ہیں۔

قارئین کرام کو شاید یہ جان کر تعجب ہو کہ کچھ عرصہ پہلے تک جرمنی میں بھی ہمارے یہاں کی طرح نام رکھنے کا رواج تھا۔ یعنی اکثر نام بڑے شاعرانہ ہوا کرتے تھے۔ جیسے ہمارے ولی دکنی، نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، عبدالماجد دریابادی، نیاز فتحپوری، جوش ملیح آبادی، ریاض خیر آبادی، ادیب پیشاوری۔ مجاز لکھنوی، شوکت تھانوی، مجید لاہوری اور سلام مچھلی شہری۔

جرمن زبان میں نسبت یا تعلق خاطر ظاہر کرنے کے دو آسان طریقے ہیں، وہ یہ کہ اصل نام کے بعد لفظ فان (VON) یا تسو (ZU) لگا دیا اور معاملہ ختم۔ جیسے:

فریڈرش فان شِلر (ادیب و شاعر... ۱۷۵۹... ۱۸۰۵)

ولف گانگ فان گوئٹے (ادیب و شاعر... ۱۷۴۹... ۱۸۳۲)

فرانتس فان لین باخ (مصوّر... ۱۸۳۲... ۱۹۰۴)

گراف فان زے پے لن (صنعت جہاز سازی... ۱۸۳۸... ۱۹۱۷)

اور پرنتس تسو کو ون شٹائن ۔ (prinzzu Lowenstein)

مندرجہ بالا چند مشہور و معروف ناموں کے ملاحظہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہو چکی کہ امتداد زمانہ سے ان مشاہیر کے اصل نام تو پسِ پشت ڈال دیے گئے ہیں اور انہیں ان کے نسبتی ناموں سے آج کل یاد کیا جاتا ہے جیسے شِلر، گوئٹے۔ بیتوون، زِی مینز وغیرہ۔

اس کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ ماضی میں ہمارے ذرائع ابلاغ مرحوم غلام محمد خان آف لُوند خُوڑ کا پورا نام درست لیتے رہے پھر نام کی طوالت سے خائف ہو کر اسے محض لُوند خُوڑ بنا دیا۔ حالانکہ یہ مرحوم غلام محمد خان کے گاؤں کا نام ہے۔

ناموں کے ذکر سے ہمیں یاد آیا کہ جرمنی کے شہرہ آفاق شاعر (ولف گانگ فان) گوئٹے کا ''مغرب و مشرق کا دیوان'' جسے عام طور پر ''مغربی دیوان'' کہا جاتا ہے اور جس کے جواب میں سو سال بعد حکیم الامت حضرت علامہ اقبال نے ''پیام مشرق'' لکھی، بڑے خاصے کی چیز ہے۔ مغربی دیوان مختلف حصوں پر مشتمل ہے جن کے نام تمام تر مشرقی ہیں۔ مثلاً مغنی نامہ، حافظ نامہ، عشق نام، تفکّر نامہ، رنج نامہ، حکمت نامہ، تیمور نامہ، زلیخا نامہ، ساقی نامہ، مثل نامہ، پارسی نامہ، خلد نامہ وغیرہ۔

ساکنانِ مغرب کے لیے ہمارے نام اکثر دردِ سر کا باعث بنتے ہیں۔ جرمنی میں جب بھی کوئی فارم پُر کرنے کے لیے ہمیں ملتا، ہم ''سر نیم'' اور ''فیملی نیم'' کی پروا کیے بغیر اپنی صوابدید کے مطابق اپنا نام دونوں خانوں تک پھیلا دیتے تا کہ جرمنوں کو نام کا جو حصہ پسند ہو، اسے وہ سر نیم یا فیملی نیم سمجھ لیں۔

کالج کے دنوں میں ہمارے انگریز ٹیوٹر ''ہیلو، گولام'' کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ جب اس طرزِ تخاطب پر ہمارے چاہنے والوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ ان کا نام ''گولام'' نہیں بلکہ پورا نام غلام قادر ہے تو انگریز ٹیوٹر مسٹر ایچ ایم (ہِز میجیسٹی) گلوز نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ ان کا پورا نام ''غلام قادر'' نہیں ''میاں غلام قادر'' ہے۔

ویسے مزہ اُس وقت آتا تھا جب ہمارے یہ انگریز ٹیوٹر ایک دوسرے صاحب کو جن کا نام ''کلیم اللّٰہ'' تھا، محض مسٹر ''الآ'' کہہ کر پکارتے۔ اس سے ہمیں بعد کے زمانے کا ایک لطیفہ یاد آ گیا جو آپ نے بھی معمولی رد و بدل کے ساتھ ضرور سنا ہو گا۔ حکومت کے دو اعلیٰ افسر جن کے نام غلام رسول اور قدرتِ خدا تھے، ٹیلیفون اٹھاتے وقت اپنا تعارف بالترتیب ''رسول ہیر'' اور ''خدا اسپیکنگ'' کہہ کر کروایا کرتے تھے۔

جرمن ناموں میں مَن (mann) کے استعمال کی اسی قدر بہتات ہے جیسے پڑوسی ملک بھارت میں لفظ ''سنگھ'' کہ کسی بھی پسندیدہ لفظ سے مِلا کر ایک تازہ نام ایجاد کرا لیا یا لفظ رام کی۔

اب چند ایسے مشہور جرمن ناموں کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں جن کا اختتام ''مَن'' پر ہوتا ہو۔ سب سے پہلے ہمارے ایک رفیق کار ''ہاگل من'' کا نام پڑھیے۔ ہاگل جرمن میں اولے کو کہتے ہیں۔ اس مناسبت سے ''ہاگل مَن'' کا مطلب ہوا: ''سنو مین''۔ ویسے اگر آپ ہمارے اس جرمن دوست کو کبھی دیکھ لیں تو پھر کسی سنو مین کے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

جناب شفیق الرحمان کے سفرنامہ ''ڈینیوب'' میں ایک آسٹرین کا نام آتا ہے: ''زِلبر مَن'' جسے شفیق الرحمان دلبر کہہ کر پکارتے تھے۔ زِلبر انگریزی لفظ سلور کی جرمن ہے۔ یوں زِلبر مَن کے معنی ہوئے چاندی والا۔ ممکن ہے ان کے آباؤ اجداد کسی زمانہ میں سونے چاندی کا کاروبار کرتے ہوں۔

جرمنی کا ایک مشہور مصور ''میکس لی بَرمَن'' کہلاتا تھا۔ لی بَر کا مطلب ہے پیارا، مَن موہن۔ ایک ادیب ہوپٹ من (HAUPTMANN) گزرے ہیں جن کا زمانہ ۱۸۶۲ء سے ۱۹۴۶ء تک کا ہے۔ ہَوپٹ کے معنی ہیں: سنٹرل یا بڑا جیسے ہاپٹ بان ہوف کا مطلب ہے: سنٹرل ریلوے اسٹیشن۔ ہوپٹ شٹراسہ یعنی شاہرہ مین روڈ۔ ''ہوپٹ مَن'' کے معنی ہوئے مَلِک، چودھری، خان صاحب۔

جرمن طرزِ تخاطب خاصا دل چسپ اور منفرد ہے۔ جب کوئی جرمن ولف گانگ فان گوئٹے کا ذکر کرے گا تو وہ شاذ و نادر ہی صرف ''گوئٹے'' کا لفظ استعمال کرے گا۔ وہ ہمیشہ کہے گا: ''ہر فان گوئٹے'' یا ہر فان شِلّر یا ہَر فان زی مینز وغیرہ۔

لفظ فان کے لغوی معنی ہیں: آف، فرام یا بائی اور اسے لکھا جاتا ہے VON مگر بعض دفعہ چند ناموں کے ساتھ اسے VAN کی شکل میں بھی دیکھنا ممکن ہے، جیسے لڈوِش فان بے تھوون (LUDWIG VANVEETHOVEN)۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ''ہر فان بے تھوون'' کا تعلّق کسی نہ کسی طرح ہالینڈ والوں سے رہا ہر کیونکہ ڈچ میں لفظ فان کی یہی شکل (VAN) مروج ہے۔

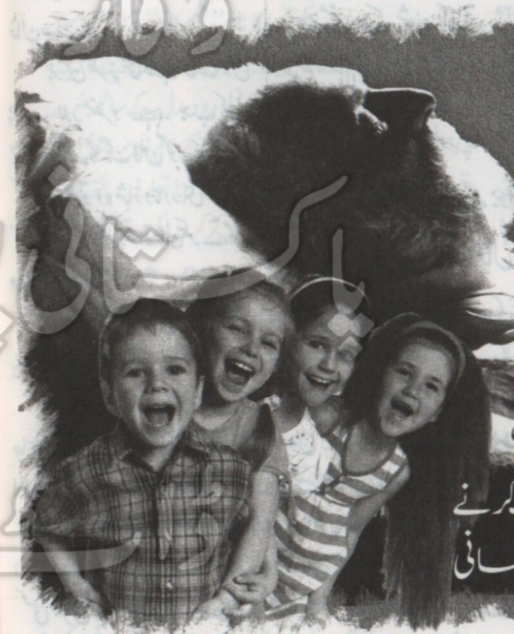
کچھ دیر پہلے ہم نے ایک نام وائز مَن کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو تھوڑا سا چکر دے کر اس نام کو کچھ اور بنا سکتے ہیں۔ مثلاً وائس من (WEISSMANN) جس کے معنی ہوں گے ''مرد سپید رو'' یا وائتس مَن (WEIZMANN) جس کے معنی ہوں گے ''مرد دہقان''۔ جرمن زبان میں ''وائس'' سفید کو کہتے ہیں۔ اور ''وائتس'' گیہوں کو۔ ممکن ہے اخبارات میں اس قسم کا کوئی نام آج کل آپ کی نظر سے گزرا ہو۔

لاہور میں ایک صاحب کسی زمانے میں ''بھینسوں والے'' مشہور تھے۔ بعد میں اسی طرز پر کئی اور تعارفی نام ہماری نظر سے گزرے۔ مثلاً عبدالکریم بندوق والا، غلام محمد کوئٹہ والا، رحمت علی موتی والا، سلیمان کوچین والا، رحمان کپڑے والا، داؤد مل والا، اسلم پرویز راولپنڈی والا، عباس پونا والا، فصیح الدین پٹرول والا اور زبیر مرغی والا وغیرہ۔

آپ کو پڑھ کر خوشی ہو گی کہ جرمنی میں ایسے نام اپنے سَر نیم کا مستقل حصہ ہیں اور نہیں آج تک بڑے فخر سے لکھا جاتا ہے مثلاً اگر زمانہ قدیم میں کسی کے آباؤ اجداد ''چمار'' تھے تو وہ آج بھی ویسے ہی HERR SCHUHMANN, یا HERR SCHUHMACHER کہلاتا ہے۔ چاہے وہ حکومت یا صنعت میں کسی بھی منصب پر کیوں نہ فائز ہو۔

مَن کی پٹی کا ایک اور نام جرمنی میں دو طریقے سے رائج ہے۔ ایک تو ہے HOFFMANN۔ اس ہوف مَن میں ہوف کے معنی ہیں اُمید اور مؤخر الذکّر ہَوف مَن میں ہوف کا مطلب ہے احاطہ یا کورٹ وغیرہ چنانچہ ایک ایف والے ہوف من کا مطلب ہوا درباری۔ ممکن ہے اس ہوف من صاحب کے آباؤ اجداد دربار سے منسلک رہے ہوں اور اس نسبت سے یہ بھی اب تک ''درباری'' کہلاتے ہیں۔

جرمنی کے شہرہ آفاق شاعر (ولف گانگ فان) گوئٹے کا ''مغرب و مشرق کا دیوان'' جسے عام طور پر ''مغربی دیوان'' کہا جاتا ہے اور جس کے جواب میں سو سال بعد حضرت علامہ اقبالؒ نے ''پیام مشرق'' لکھی، بڑے خاصے کی چیز ہے۔



لوگ انگیٹھی کے پاس بیٹھے ابھی تک ایک انوکھے مقدمے کا تذکرہ کر رہے تھے۔ موسیو سیلورا نے جو کسی زمانے میں سرکاری وکیل رہ چکے تھے، اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے کہا:

''اسی سے ملتا جلتا مجھے ایک اور مقدمہ بھی یاد ہے۔ وہ اپنی نوعیت میں بہت ہی عجیب تھا۔ میں اُن دنوں مضافات میں سرکاری مجسٹریٹ تھا اور دیہات کا کام پیرس سے کچھ کم دلچسپ نہ تھا۔ میں اپنے والد کا ممنون ہوں جن کی کوشش سے مجھے ترقی پانے کی امید تھی۔ وہ ان دنوں پیرس کے بہت مشہور جج تھے اور انھی کی وجہ سے موائرن کا مقدمہ میرے سپرد ہوا''۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا ''جی ہاں اس مقدمے کا اُڑتا اُڑتا ذکر میرے کانوں میں بھی پہنچ چکا ہے۔ کیا یہ مقدمہ ان مشہور مقدموں میں سے نہیں جو بعض پہلوؤں سے بہت ہی حیرت انگیز تھے۔''

موسیو سیلورا بولے ''جی ہاں۔ موسیو موائرن شمالی فرانس میں مدرس تھے۔ بے حد تعلیم یافتہ، اعلیٰ درجے کے مہذب اور شناسا ان کا بے انتہا احترام کرتے تھے۔ موائرن نے شادی کی اور تین اولادیں ہوئیں لیکن تینوں بچے دق کا شکار ہو گئے۔ بچوں کی وفات کے بعد موائرن اپنے ننّھے شاگردوں سے بے حد الفت کرنے لگے۔ اُن کو کھلاتے پلاتے، دعوتوں کا خرچ برداشت کرتے اور اپنی جیب سے اُن کو انعام دیا کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کے لاڈ نے بچوں کی طبیعتیں بگاڑ دیں۔ وہ انہیں مٹھائیاں اور کیک دیتے اور پڑھاتے وقت باتیں کرنے سے نہ روکتے۔

''ہر شخص موائرن کی عزت بلکہ اُن سے محبت کرتا تھا لہٰذا اس وقت ہر شخص نے صدمہ محسوس کیا جب ان کے پانچ چہیتے شاگرد اچانک مر گئے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ پانی کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ بعض کہتے تھے ایک عرصے سے بارش نہیں ہوئی اور خشکی کے سبب وبا پھیل گئی لیکن بیماری یا معمولی بخار کی بھی کوئی علامت ظاہر نہ ہوئی تھی۔ صرف یہ ہوتا تھا کہ بچے گھلنے شروع ہو جاتے۔ بھوک بند ہو جاتی۔ کبھی معدے میں درد ہوتا اور آخر بڑی تکلیف کے بعد وہ مر جاتے۔ مرنے والوں میں سے آخری بچے کا پوسٹ مارٹم بھی کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ انتڑیاں معائنے کے لیے پیرس بھیج دی گئی تھیں مگر زہر خورانی کی کوئی علامت نہیں پائی گئی۔

''اس واقعہ کے بعد ایک سال تک مدرسے میں کسی قسم کا مرض رونما نہ ہوا اور نہ کوئی بچہ فوت ہوا لیکن کچھ دن بعد مدرسے کے دو بہت ہی ذہین طالب علم جن پر موائرن کی خاص نظرِ عنایت تھی، کچھ روز بیماری میں مبتلا رہ کر یکا یک چل بسے۔ پوسٹ مارٹم کیا گیا تو معدے اور انتڑیوں کے اندر پِسا ہوا شیشہ نکلا۔ اس پر یہ خیال کیا گیا کہ شاید بچوں نے کوئی ایسی چیز کھالی جو بے پروائی سے تیار کی گئی۔ اس خیال کی تائیدیوں بھی ہو گئی کہ دودھ کی ایک پیالی کی تہ میں کچھ کرچیاں پائی گئیں۔

''اگر موائرن کی خادمہ اچانک بیمار نہ پڑ جاتی تو معاملہ یہیں رفع دفع ہو جاتا لیکن خادمہ میں بھی ڈاکٹر کو ضعف کی وہی علامتیں نظر آئیں جو ان بچوں میں موجود تھیں۔ دریافت کرنے پر اُس نے بڑی مشکل سے یہ بات قبول کی کہ اس نے مٹھائی چرا کر کھائی ہے جو موائرن اپنے شاگردوں کے لیے رکھتے ہیں۔

''عدالت کے حکم پر مدرسے کی تلاشی لی گئی۔ وہاں ایک الماری طرح طرح کی مٹھائیوں سے بھری ہوئی مل گئی۔ یہ مٹھائیاں بچوں کے لیے مخصوص تھیں۔ معائنے سے ظاہر ہوا کہ ان مٹھائیوں میں یا تو شیشے کا باریک چورا تھا یا سوئیوں کے کوٹے ہوئے بہت ہی ننّھے ننّھے ٹکڑے۔ موائرن کو فی الفور گرفتار کر لیا گیا۔ ثبوت اس قدر مکمّل تھا کہ مجھے اس پر یقین کر لینا پڑا۔ لیکن اس کا شریفانہ چال چلن، ایمان داری اور علم اُسے مجرم تسلیم کر لینے میں مانع تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جرم کی وجہ کوئی بھی نظر نہ آتی تھی۔

''یہ نیک، بھلا مانس اور مرنجان مرنج شخص معصوم بچوں کو کیوں مارتا؟ پھر خاص طور پر ان بچوں کو جن سے اسے اس قدر الفت تھی اور جن پر وہ اس قدر شفقت کرتا تھا اور اگر ان سب باتوں کے باوجود اُس نے بچوں کو مارا ہے تو وہ دیوانہ ہے۔ لیکن ایسا ہوشیار، حلیم، زیرک استاد دیوانہ کیسے ہو سکتا ہے؟

''اس کے خلاف ثبوت شد و مد سے جمع ہونے شروع ہوئے۔ جس دکان سے اُس نے مٹھائیاں خریدی تھیں، وہاں مٹھائیوں میں کوئی خطرناک چیز نہ تھی۔ یقیناً خطرناک اجزا خریدنے کے بعد ملائے گئے تھے اور......''

حاضرین میں سے ایک شخص نے نہایت بے تابی سے پوچھا۔ ''موائرن نے اپنی صفائی میں کیا بیان دیا؟''

مجسٹریٹ نے کہا: ''موائرن کا بیان یہ تھا کہ میرا کوئی دشمن چپکے سے گھر میں داخل ہو کر یہ کارروائی کر جاتا ہو گا تاکہ مجھ پر الزام عائد ہو سکے۔ اُس سے پوچھا گیا کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے تو اس نے جواب دیا، ایسا شخص جو میرے کسی شاگرد کی موت سے بے حد دولت حاصل کر سکتا ہو۔ وہ اس کو مارنے کے لیے تمام مٹھائی میں زہر ملا سکتا ہے۔

''یہ بات قرین قیاس تھی۔ موائرن ایسا ایماندار اور قابل رحم نظر آتا تھا کہ اسے ہم یقیناً بری کر دیتے۔ لیکن اتفاق سے دو اور باتوں کا سراغ لگا۔ پسے ہوئے شیشے سے بھری ایک ڈبیہ اُس میز کے چور خانے میں پائی گئی جس میں وہ اپنی رقم رکھتا تھا۔ لیکن اس ثبوت کو بھی استاد نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ بھی

میرے اسی مکار دشمن کا کام ہے۔

’’لیکن ایک دن سامان فاریو سے ایک سوداگر آیا۔ اس نے بیان کیا کہ موائرن نے مجھ سے بہت سی باریک سوئیاں خریدی تھیں اور اس نے اکثر سوئیوں کو یہ کہہ کر دیکھا تھا کہ وہ میرے مطلب کی کافی باریک اور نازک ہیں یا نہیں۔ سوداگر نے اپنے بیان کے ثبوت میں درجن بھر گواہ پیش کر دیے جنھوں نے موائرن کو شناخت کرلیا اور سوداگر کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔

’’یہ بھی معلوم ہوا کہ موائرن مرنے والے بچوں کو اپنی موجودگی میں مٹھائی کھلایا کرتا تھا۔ بچوں کو حکم تھا کہ مٹھائی کا ایک بھورا بھی گرنے نہ پائے۔ موائرن کو پھانسی کا حکم ہوا۔ اُس نے اپیل کی وہ بھی نامنظور ہوئی۔ پھر رحم کی درخواست کی لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ بھی مسترد کر دی جائے گی۔ کیونکہ جرم مہیب اور سنگین تھا اور عوام کی رائے اُس کی طرف سے بے حد خراب ہوچکی تھی۔

’’ایک دن صبح کے وقت میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ جیل خانے کا پادری مجھ سے ملنے آیا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا۔ اسے مجرموں کا خوب تجربہ تھا لیکن اس وقت وہ بوکھلایا ہوا اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے کہا: ’’جناب اگر موائرن کو پھانسی دی گئی تو یہ ایک بے گناہ کا خون ہوگا۔‘‘

’’یہ کہا اور مجھے سلام کر کے پادری چلا گیا لیکن اس کے ان الفاظ نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میں بے چین ہوگیا۔ چند ساعت کے بعد میں پیرس چلا گیا تا کہ اپنے والد کی معرفت شہنشاہ سے ملاقات کرسکوں۔ ’’دوسرے دن مجھے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ نپولین ثالث ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ اشارے پر میں بیٹھ گیا اور میں نے موائرن کا واقعہ اوّل سے آخر تک بیان کر دیا۔

’’اتنے میں دروازہ کھلا اور ملکہ داخل ہوئیں۔ انھیں خیال تھا کہ شہنشاہ تنہا ہوں گے۔ مجھے دیکھ کر واپس لوٹنے لگی تھیں کہ نپولین نے انھیں ٹھہرنے کے لیے کہا اور اس مقدمے کے تمام حالات سنائے۔ ملکہ معظمہ فوراً بول اٹھیں۔ ’’اس شخص کو ضرور معاف کر دینا چاہیے۔ وہ بے گناہ معلوم ہوتا ہے۔‘‘

’’شہنشاہ تذبذب میں تھے۔ جرم نے اُن کا دل ہلا ڈالا تھا۔ انھیں انصاف کا بے حد خیال تھا لیکن ملکہ کے ایک فقرے نے ان کا تذبذب دور کر دیا۔ ملکہ نے کہا۔ ’’کیا ایک مشکوک مجرم کو چھوڑ دینا بہتر ہے یا ایک معصوم کی جان لینا؟‘‘

’’یہ نصیحت کارگر ہوگئی۔ موائرن کو حبس دوام کی سزا دی گئی اور پھانسی کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔

☆☆☆

’’چند سال بعد میں نے سنا کہ طولون میں موائرن کا چال چلن قابلِ ستائش ہے۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ جیل خانے کے گورنر نے اسے اپنے گھریلو کاموں پر لگا لیا ہے۔ اس کے بعد کئی برس تک میں نے موائرن کے متعلق کوئی بات نہ سنی۔

’’گرمی کے موسم میں ایک مرتبہ میں اپنے عزیز ڈی بسے کے ہاں مقیم تھا۔ ایک روز شام کے وقت ایک جوان پادری مجھے دریافت کرتا ہوا آیا۔ اس نے کہا۔ ’’ایک شخص نزع کی حالت میں ہے اور آپ سے ملنے کی تمنا ظاہر کر رہا ہے۔‘‘

ایسے واقعات میرے ساتھ اکثر پیش آتے تھے۔ میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا لیکن اکثر لوگ مجھے یاد رکھتے تھے۔ غرض میں نوجوان پادری کے ہمراہ ہولیا۔ وہ مجھے ایک بوسیدہ اور تباہ حال مکان میں لے گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ پیال کے ڈھیر پر ایک شخص دم توڑ رہا ہے۔ اُس میں ہڈیوں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں تھا لیکن اس ڈھانچے میں سے دو آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا: ’’آپ مجھے پہچانتے ہیں؟‘‘

میرے انکار پر پھر اُس نے کہا ’’میں موائرن ہوں...... مدرس۔‘‘

’’میں نے اقرار میں گردن ہلائی۔ مگر اُس کی یہ حالت دیکھ کر میری روح میں ایک تھرتھری دوڑ گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا: ’’تم یہاں کیسے پہنچے؟‘‘

اُس نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ ’’اب اس کے بیان کرنے کا وقت نہیں۔ یہ بہت طویل داستان ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ کی موجودگی میں اپنے جرم کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں...... آپ کو یاد ہوگا‘ آپ نے میری جان بخشی کروائی تھی...... یہ جب کا قصہ ہے......‘‘

اُس نے مٹھیوں سے پیال بھینچی اور لڑکھڑاتی زبان سے پھر کہنا شروع کیا ’’مجھے آپ سے سچی بات کہہ دینی چاہیے...... میں کسی نہ کسی سے تمام واقعہ بیان کر کے ہی مرنا چاہتا ہوں...... ہاں...... وہ شخص میں تھا۔ میں نے اُن بچوں کو مارا تھا...... سن لیجیے، سن لیجیے۔ میں نے یہ فعل انتقام لینے کے لیے کیا۔

’’میں ایک نیک اور ایمان دار آدمی تھا۔ میں اُس خدا پر ایمان رکھتا تھا جسے ہم دوسروں کی معرفت پہچانتے ہیں...... یعنی رحم اور محبّت کا خدا۔ انصاف کا خدا اور سب سے بڑھ کر...... بہرحال میں اس کی عبادت کرتا تھا جب تک میرے مصائب شروع نہ ہوئے تھے۔ جب تک مجھ پر یہ ظاہر نہ ہوا تھا کہ وہ انسانوں کو مار بھی ڈالتا ہے۔ کیونکہ اُس نے میرے بچوں کو مار ڈالا۔ اُن بچوں کو جنھیں میں دیوانہ وار محبت کرتا تھا، چاہتا تھا۔ میں محبّت کرنے کے لیے بالکل مجبور تھا۔ ایسی محبّت جو کسی دوسرے ماں باپ کو اپنے بچوں سے نہ ہوگی۔ ہاں میں محض اُن کے لیے جیتا تھا اور وہ چل بسے...... تینوں کے تینوں......

’’میرے لیے دنیا اندھیر ہوگئی اور زندگی میں کوئی خوشی باقی نہ رہی۔ آخر ایسا کرنے کی کیا وجہ تھی؟ مجھ غریب نے کیا قصور کیا تھا اور پھر اُن معصوموں نے کیا کیا تھا...... انھوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ اب مجھ پر ظاہر ہوا کہ یہ زندگی محض اتفاقات کا مجموعہ ہے اور کوئی باقاعدہ چیز نہیں...... خدا ہلاکت بھیجتا اور زندگیاں لیتا ہے۔ لوگ فطرت سے برسرِ پیکار ہیں۔ خیر میں نے بھی پکا ارادہ کر لیا کہ اپنے مقتول بچوں کا انتقام لوں گا۔ میں فطرت سے نفرت کرنے لگا اور جان کے بدلے جان لینا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اُس کی تمام تجویزوں کو خاک میں ملا دوں گا...... ہاں جناب میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے اپنے بچوں کے بدلے دوسرے بچوں کو مار ڈالا۔‘‘

’’میں مزید بھی مارتا اگر پولیس مجھے گرفتار نہ کر لیتی۔ مجھے موت کی سزا دی گئی مگر میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ میں نہیں مروں گا کیونکہ اگر مروں گا تو خدا مجھ پر ہنسے گا...... اور یہ مجھے پسند نہیں تھا کہ وہ میری ہنسی اُڑائے...... اس خیال سے میں نے پادری کے سامنے جھوٹ بولا اور جھوٹا حلف اُٹھا لیا...... اس طرح میری جان بچ گئی۔

’’میں نے جھوٹ بولا۔ میں جیتا رہا۔ مگر جناب اب خاتمہ ہے...... اب میں کسی طرح اُس سے بچ نہیں سکتا...... مگر اب مجھے مطلق خوف نہیں، میرا کام پورا ہوگیا اور میں بالکل مطمئن ہوں۔‘‘

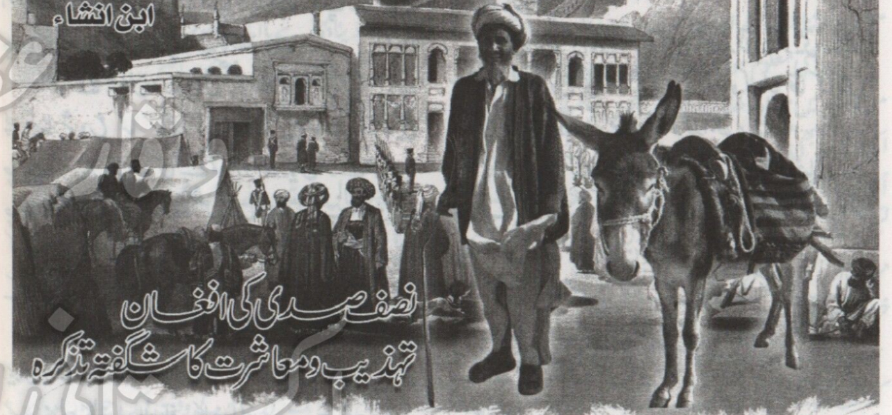
اُس کے بعد وہ خاموش ہوگیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے شروع ہوئے اور وہ سوکھی گھاس کو مٹھیوں میں مروڑنے لگا گویا زندہ رہنے کی آخری کوشش کر رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا۔ ’’تمھیں کچھ اور کہنا ہے؟‘‘

اس نے جواب دیا: ’’نہیں جناب مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا‘‘۔

’’آپ ابھی یہاں ٹھہریں گے‘‘۔ میں نے پادری سے پوچھا۔

پادری نے اثبات میں سر ہلایا تو میں چلنے پر تیار ہو گیا۔ مرنے والے نے مسکرا کر کہا ’’اپنے آقا کی طرف سے مجھے چڑانے کے لیے ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ اچھا کوئی مضائقہ نہیں، انھیں رہنے دیجیے۔ میں بالکل مطمئن ہوں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔‘‘

◆●●



اور رمضان شریف قبلہ کابل میں ایک ہی روز ہم وارد ہوئے۔ پاکستان اس لحاظ سے افغانستان کے مقابلے میں پسماندہ ہے کہ یہاں ابھی ماہِ شعبان چل رہا تھا۔ پشاور سے ڈین ہوٹل کی میزبانی کا لطف اٹھاتے اور چلغوزے ٹھونگتے ہم جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ پون گھنٹے بعد کابل کے خوبصورت ہوائی اڈے پر اُترے تو پتا لگا کہ صاحبو، آج ہر طرف یکم رمضان کی تعطیل ہے۔ آپ کی باچھوں پر جو چلغوزوں کے چھلکے لگے ہیں، انھیں اچھی طرح صاف کر لیجیے۔

کابل میں ہم دو چیزوں کا رعب دل میں لے کر گئے تھے: ایک سردی دوسرے رمضان شریف کا۔ سردی کے ڈر سے ہم نے پوستینوں، دہرے تہرے سوئٹروں، مفلروں، طرح طرح کی ٹوپیوں اور کنٹوپوں، دستانوں اور قطب شمالی والے اوورکوٹوں کا انتظام کیا تھا۔ جاڑے میاں شاید اس کا سن کر دبک گئے اور کابل والوں سے کہا کہ یہ شخص یہاں سے جائے گا تو پھر تم لوگوں سے سمجھوں گا۔ جتنے دن ہم کابل میں رہے، جاڑا بس ایسا ہی تھا جیسا پنڈی میں ہوتا ہے، پشاور میں تھا بلکہ لاہور میں بھی۔ کوئٹہ سے ذرا سردی کی لہر آجائے تو ایسا نقشہ تو کراچی میں بھی ہو جاتا ہے دستانے، سوئٹر، مفلر، کنٹوپ اور حبیب اللہ شہاب والا مہا اوورکوٹ دیکھ دیکھ کر ہم اتنے دنوں جھلایا کیے۔ ایک روز بھی کڑاکے کی دنداں شکن سردی پڑ جاتی، تو ان کا مصرف نکل آتا اور ہمیں گلہ نہ رہتا۔

روزوں کے متعلق اپنے افغان اور پٹھان بھائیوں کے متشدد رویے کا ذکر بھی ہم سن چکے تھے۔ بے شک ہوٹل جس

میں ہم ٹھہرے وہ روشن خیال اور مغربی قسم کا تھا۔ تاہم لوگوں نے بتا رکھا تھا کہ سنا ہے وہاں تڑکے ہی مسافروں کو ٹانگوں سے گھسیٹ کر اٹھا دیتے اور بہ نوک شمشیر روزہ رکھواتے ہیں۔ الحمدللہ کہ یہ اندیشے بھی باطل ثابت ہوئے۔ ہم نے کابل کے ریستورانوں اور بھٹیار خانوں کو اسی طرح احترام کے پردے لٹکاتے کاروبار کرتے دیکھا جیسا کراچی میں دیکھتے ہیں۔ ہم نے ایک آدھ بار روزہ رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے ایک افغان دوست نے کہا، شوق سے رکھو۔ ہم منع نہیں کرتے لیکن اتنا دیکھ لو کہ تم سفر میں ہو اور سفر میں روزے کی احتیاط رکھی جاتی ہے۔ یہ لوگ ہمارے جذبہ ایمانی کو اتنی ڈھیل نہ دیتے تو ہماری روزہ کشائی کی خبر کابل سے آتی۔

کابل میں دو ہی اچھے ہوٹل ہیں، کابل اور سپین زر۔ سپین زر تو ابھی حال ہی میں بنا ہے اور الٹرا ماڈرن گنا جاتا ہے۔ اگرچہ زیادہ بڑا نہیں۔ کابل پرانا ہے۔ وضعدارانہ، شریفانہ اور آرام دہ۔ باہر سے اس کی سہ منزلہ عمارت بے رنگ سی ہے لیکن اندر جائیے تو لاؤنج، کمرے اور ساز و سامان سب نفیس۔ ہم کابل ہوٹل میں اترے۔ کمرے کا بھاڑا ٹھہرایا۔ معلوم ہوا تین سو افغانی روزانہ دینے ہوں گے۔ دس فیصدی سروس اس پر مستزاد۔ ناشتا اور کھانا اس کے علاوہ۔ کسی چیز کے دام ہم سینکڑوں میں سنیں تو ہمیں ہمیشہ اختلاج ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ معلوم کر کے سکون ہوا کہ ایک افغانی ہماری مرحومہ دونی کے برابر ہے۔

ہم نے سو روپے پاکستانی دیے اور ہوٹل والے نے آٹھ سو افغانی ہمیں گن دیے۔ حساب سے چالیس پینتالیس روپے کا کمرا پڑا۔ جسے کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں کہہ سکتے لیکن ہمارے دوست ڈاکٹر گلبرگ تو یہ دام سن کر اچھل ہی پڑے۔ کیونکہ ڈالر کے حساب سے گنیں تو یہی افغانی ایک آنے کا پڑتا ہے اور تین سو افغانی کا مطلب ہوا چار ڈالر روزانہ۔ بات یہ ہے کہ افغانستان میں سکے کی بین الاقوامی قیمت مقرر نہیں۔ ہر روز بازار کا بھاؤ نکلتا ہے۔ ڈالر کے ستر پچھتر افغانی اور روپے کے بہت دوڑ دھوپ سے شاید نو افغانی مل جاتے ہیں۔ بہرحال ہم کسی چیز کے دام سن کر اسے فوراً پاکستانی سکے میں ڈھالتے تو وہ خاصی مہنگی معلوم ہوتی۔ گلبرگ صاحب کی آنکھیں ارزانی دیکھ کر چمک اٹھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کابل جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آگئے کچھ بھی نہ لا سکے اور ڈاکٹر گلبرگ وہاں سے لدے پھندے گئے۔

پشاور کے ہوائی اڈے پر ہم نے اپنے ہم سفروں میں ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ کو دیکھا کہ لمبی سرخ ڈاڑھی ہے اور سر پر بھی کنگھی سے بے نیاز بالوں کا جھاڑ کھڑا ہے۔ تھوڑا لنگڑاتے اور چھڑی لے کر چلتے ہیں۔ پھولدار باسکٹ پہنے ہوئے تھے یعنی ان کی وضع قطع سج دھج سب سے الگ تھی۔ ہم پی آئی اے کے کاؤنٹر پر اپنا ٹکٹ دکھا رہے تھے کہ وہ مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور فرمایا تمہارے پاس یہ SAS یعنی سکنڈے نیوین ایئر سروس کا ٹکٹ کہاں سے آگیا۔ ہم نے بتایا کہ یونیسکو جس کی طرف سے ہم نے یہ سفر اختیار کیا ہے، اس نے پیرس سے اس کا انتظام کیا تھا۔ بولے مجھے یوں جستجو ہوئی کہ میں ڈنمارک کا ہوں اور SAS میرے وطن کی کمپنی ہے۔ اس پر بات چل نکلی۔ ہم نے انھیں بتایا کہ آپ کے وطن کی زیارت بھی ہم کر چکے۔ کوپن ہیگن کے علاوہ السی نور بھی گئے۔ جہاں ہملٹ کا قلعہ ہے اور جہاں سے سمندر پار سویڈن نظر آتا ہے۔

بولے، مجھے افسوس ہے کہ میں نے ساری عمر ڈنمارک میں گزار کر السی نور آج تک نہیں دیکھا۔ ہم نے یہ کہہ کر ان کی ڈھارس بندھائی کہ ہم نے بھی کراچی میں آدھی عمر گزار دی لیکن منگھوپیر نہیں گئے۔ زیادہ تفصیل میں ہم نہیں گئے تاکہ ہمارا منگھوپیر ان کے السی نور کے مقابلے میں کچا نہ پڑ جائے۔ یہ ڈاکٹر گلبرگ تھے۔

ڈاکٹر گلبرگ دوا دارو والے ڈاکٹر ہیں لیکن نسخوں کے علاوہ کتابیں بھی لکھتے ہیں اور یہی ہماری ان سے دوستی کی وجہ ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی کتاب ''اسکیموڈاکٹر'' برطانیہ اور امریکا کے علاوہ کئی ملکوں میں چھپ چکی۔ ہم نے ریڈرز ڈائجسٹ میں اس کا ذکر یا خلاصہ پڑھا تھا اور کچھ کچھ یاد تھا۔ یہ سُن کر وہ اور خوش ہوئے اور اپنی بی بی سے کہا، دیکھو یہ شخص کتنا پڑھا لکھا ہے۔ اس نے غیدغ ڈائجسٹ میں میری کتاب کا ذکر پڑھا ہے۔ فرانسیسیوں کی طرح ''ر'' کا تلفظ وہ ہمیشہ ''غ'' ہی کرتے رہے۔

ڈاکٹر گلبرگ مہم جو آدمی ہیں۔ برسوں گرین لینڈ جا کر اسکیموں کے ساتھ رہے۔ ان کی زبان اور معاشرت اختیار کی۔ انہی کا سا بے نمک کھانا کھاتے رہے۔ یہی مچھلی، ریچھ کا گوشت وغیرہ۔ برف کے جھونپڑوں میں قیام کیا اور پھر یہ کتاب لکھی۔ اب میاں بی بی ایشیا اور مشرق بعید کے دورے پر نکلے تھے۔ کینیا، ہندوستان، تھائی لینڈ اور نیپال ہوتے ہوئے پاکستان آئے تھے۔ اب کابل اور تہران ہو کر وطن واپسی کا پروگرام تھا۔ ہندوستان سے یہ لوگ ایک شب ٹھہر کر بھاگے کیونکہ یہ پارلیمنٹ اسٹریٹ پر جن پتھ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اس روز سادھوؤں اور غیر سادھوؤں کی طرف سے گاؤکشی کے معاملے پر وہ خوف ناک مظاہرہ ہوا تھا جس میں جان و مال کا بے حد نقصان ہوا۔ مظاہرین نے مغربی سیاحوں کو بھی جہاں وہ نظر آئے، گھیر لیا اور کہا، یہ لوگ بھی مسلمانوں سے کم نہیں۔ یہ بھی گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ بڑی مشکل سے بہ خشمگیں مجمع کے نرغے سے نکل کر ہوٹل واپس پہنچے اور اسی دن نیپال روانہ ہو گئے۔

پاکستانیوں خصوصاً پشاور والوں کے یہ بہت معترف تھے کہ بڑے تپاک اور خلوص سے ملتے ہیں۔ پی آئی اے کی خاص طور پر تعریف کرتے تھے کہ اس کے آدمی بہت خلیق اور متواضع ہیں۔ ہاں اپنے پشاور والے ہوٹل کے نام سے بے مزہ ہوتے تھے۔ کہتے تھے یہ نظر بٹو ہے تاکہ پاکستان کو نظر نہ لگ جائے۔ دیکھو کابل ہوٹل میں یہ چار ڈالر روزانہ کا کتنا اچھا کمرا ہے۔ اسے گرم رکھنے کا مرکزی نظام بھی ہے۔ قالین، فرنیچر اور سروس بھی کچھ معقول۔ پشاور میں تین روز رہا اور اس باوا آدم والے زمانے کے کمرے کے تیرہ ڈالر روزانہ دیتا رہا۔ یہی نہیں ان لوگوں نے پانچ روپے روزانہ اس لکڑی کے بھی مجھ سے وصول کیے جو کمرا گرم رکھنے یا اس میں دھواں پھیلانے کے لیے روزانہ جلانی پڑتی تھی۔

جاتے ہوئے جن لوگوں نے ہم سے پوچھا تھا کہ کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے؟ ان کی اطلاع کے لیے گزارش ہے کہ ہوتے ہیں اور بہت ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارا مطلب چار ٹانگوں والی بلا سینگ مخلوق سے ہے۔ دو ٹانگوں والے بھی یقیناً ہوں گے۔ ہم نے زیادہ جستجو نہیں کی۔ یہ گدھے وہ تھے جو زرنگار پارک کے سامنے قطار در قطار کھڑے تھے اور ان کے پالان سنگتروں سے بھرے تھے۔ یہاں سنگترے تُل کر بکتے ہیں۔ ڈاکٹر گلبرگ کی بی بی سنگتروں پر مچل گئیں اور بولیں ان کا بھاؤ پوچھو۔ ہم نے بھاؤ پوچھا ''آغا چند است؟

ایران کی طرح یہاں بھی یہ معلوم ہوا کہ فارسی بولنا آسان ہے سمجھنا مشکل۔ آغا نے جو جواب دیا وہ ہمارے پلے نہ پڑا۔ حالانکہ ہم نے چہ؟ چہ؟؟ کر کے ایک دو بار وضاحت بھی چاہی۔ ان غیر ملکیوں کو یہ بتانا غیر ضروری تھا کہ یہ گدھے والا ان الفاظ میں ادائے مطلب سے قاصر ہے جو ہماری سمجھ میں آسکیں لہٰذا ہم نے کہا، چھوڑیئے، بہت مہنگا دیتا ہے لیکن وہ خاتون تھوڑی دور ایک اور گدھے کے پاس مچل گئیں کہ یہاں سے لے لو۔ یہ سستا دیں گے۔ ہم نے ایک باٹ کی طرف اشارہ کر کے سنگترے والے سے کہا کہ آغا بس ایں قدر دے دو۔

اس نے تولا تو چار سنگترے پڑے۔ قیمت ہم نے نہ پوچھی کہ افہام و تفہیم میں دقت نہ ہو۔ آخر باہم زبان سمجھنے نہ

سمجھنے کا معاملہ ہمارا اور ہمارے افغان بھائیوں کا ہے۔ ڈنمارک والوں کو اس سے کیا مطلب۔ ہم نے دس افغانی کا نوٹ دیا۔ اس نے چار افغانی کاٹ کر باقی ریزگاری ہمیں دے دی۔ ڈاکٹر گلبرگ اور ان کی بی بی نے ہمارا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس دیارِ غیر میں جہاں ہماری زبان اور انگریزی سمجھنے والا کوئی نہیں، تم ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو ہم کیا کرتے۔ ہم نے موزوں الفاظ میں کسر نفسی کرنے کے بعد کہا کہ خیر انسان انسان کے کام آتا ہی ہے۔ بنی آدم اعضائے یک دیگراند۔ وغیرہ۔

افغانستان میں ریلوے کی کہانی یہ معلوم ہوئی کہ شاہ امان اللہ خان نے اپنے زمانے میں دارالامان نام کی تازہ بستی بسائی تھی۔ وہاں تک ریلوے لائن، ریلوے نہ کہیے ٹرالی لائن بچھائی۔ بچہ سقہ نے ان کا تاج و تخت چھینا تو پوچھا، یہ کیا چیز ہے؟ چنانچہ فرنگیوں کی بدعت قرار دے کر اکھاڑ پھینکا۔ ہم نے دارالامان میں اس کے اکھڑے ہوئے زنگ خوردہ سلیپر اور دو تین ٹوٹی پھوٹی بوگیاں آثار صنادید کے طور پر ایک جھونپڑے کے سامنے کھڑی پائیں جو ایک زمانے میں ریلوے اسٹیشن تھا۔ اس وقت بھی ریلوے لائن کا فوری طور پر کوئی منصوبہ نہیں کیونکہ سڑکوں کے ذریعے آمد و رفت کو بہتر بنانا آسان بھی ہے اور کم خرچ بھی۔

دوسرے ممالک اس میں بڑی مدد دے رہے ہیں۔ کچھ سڑکیں روس نے بنائیں اور کچھ ان کی ضد میں آکر امریکا نے بنا دیں۔ روس نے کوہ ہندوکش میں دو میل لمبی سرنگ کھود کر افغانستان میں تجارتی مال کی نقل و حرکت میں غیر معمولی آسانی پیدا کر دی ہے۔ بڑی طاقتوں کے دلوں میں افغانستان کا درد ایسا جاگا ہے یا پھر اسے کچھ اور نام دے دیجیے کہ روس اور امریکا کے علاوہ جو امداد دینے کے معاملے میں اوّل اور دوم ہیں، مغربی جرمنی، فرانس اور برطانیہ بھی دامے درمے، قدمے سخنے افغانستان کی خدمت کو عین سعادت سمجھتے ہیں۔

برطانیہ جو امداد دینے میں پانچویں نمبر پر ہے، دو کارخانے شکر کے اور ایک کارخانہ سرسوں کا تیل نکالنے کا قائم کر رہا ہے، کیوں نہ کرے، اس نے کڑوا پھیکا ہو کر دیکھ لیا۔ جنگیں بھی لڑیں، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ جب دیکھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں یعنی افغانستان والے سلطنت انگلشیہ کے سایۂ عاطفت میں آنے سے انکاری ہیں تو سرسوں کا تیل نکالنے کے کارخانے کی پیش کش کر دی اور کڑوے کسیلے پن کی تلافی کے لیے دو فیکٹریاں شکر کی بھی بنا ڈالیں۔

قابل اعتماد

موصل کے حکمران بدرالدین نے اپنے ایک درباری مجدالدین سے کہا ''مجدالدین! مجھے اپنے ایک اہم کام کے لیے نہایت قابل اعتماد آدمی درکار ہے۔''

مجدالدین نے جواب دیا۔

''حضور والا! میرے بھائی میں یہ صفات موجود ہیں۔ کہیے تو حاضر کر دوں۔''

موصل کے حکمران نے کہا ''ابھی اسی وقت اُسے حاضر کرو۔''

مجدالدین نے اپنے بھائی کو اسی وقت اپنے آقا کی خدمت میں حاضر کر دیا اور خود باہر انتظار کرتا رہا۔ کافی دیر بعد جب وہ باہر نکلا تو مجدالدین نے بھائی سے پوچھا۔

''بھائی! اندر کیا باتیں ہوئیں کچھ مجھے بھی تو بتائیے؟''

بھائی نے جواب دیا: ''میں وہ باتیں بتا کر تمھیں جھوٹا ثابت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ تم موصل کو میری بابت بتا چکے کہ میں ایک قابل اعتماد آدمی ہوں۔''

خزینۂ کتب

عافیہ جہانگیر

کتاب کا نام: انسائیکلو پیڈیا جہان قائدؒ (پانچ جلدوں کا سیٹ)، **مصنف/ تالیف:** علامہ عبدالستار عاصم، **ناشر:** قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل لاہور،
فون نمبرز: ۰۳۳۳،۰۳۲۳-۴۳۹۳۴۲۲

یہ انسائیکلو پیڈیا ایک ایسے وقت میں تخلیق کی گئی جب قوم کو قائداعظمؒ کے اقوال اور راہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ ان حالات میں بہت ضروری ہے کہ اپنے عظیم قائدؒ کے اصول و ضوابط، اقوال و افعال اور نظریات کو نہ صرف پھر سے قوم میں اجاگر کیا جائے بلکہ ہماری نئی نسل کو بھرپور طریقے سے آگاہ بھی کیا جائے۔

اس انسائیکلو پیڈیا کا ورق ورق پڑھنے سے قائداعظم کی زندگی کا کوئی پہلو مخفی نہیں رہتا نہ ہی ان کے نظریات وافکار کے بارے میں کسی قسم کا ابہام باقی رہتا ہے۔ مصنف عبدالستار عاصم کا یہ معرکہ آراء تحقیقی کام نہ صرف موجودہ بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کے لیے بھی روشن چراغ ہے۔

سب سے بڑی خصوصیت اس انسائیکلو پیڈیا میں یہ ہے کہ اس میں موضوعات اور واقعات کو حروف تہجّی کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ قائداعظمؒ کی زندگی کے کسی بھی پہلو سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں تو آپ اپنے مطلوبہ حروف تہجّی میں وہ باآسانی تلاش کر سکتے ہیں۔ قائداعظمؒ پر بے شمار کتب موجود ہیں لیکن اردو زبان کا پہلا مربوط انسائیکلو پیڈیا ایک ایسی تصنیف ہے جس میں آباد جہانِ قائدؒ کا سفر شروع ہوتا ہے اُردو کے پہلے حرف ''آ'' اور پھر قائدؒ کی زندگی کے اس

طویل، پیچیدہ اور پُر خار سفر میں خود کو ان کا ہمنوا پاتے ہوئے' لفظوں کی اس پٹڑی پر کبھی مدھم اور کبھی تیز رفتاری کبھی سانس روکے تو کبھی سرشاری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ چلتے چلتے پہنچ جاتا ہے ''ی'' پر یعنی ان کے ''یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور'' کے تاریخ ساز، پراثر خطاب میں جو ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قائداعظمؒ نے اہلیانِ لاہور سے کیا تھا۔ اس خطاب میں انہوں نے یہ تاریخی جملہ بھی کہا تھا:

''مسلمان مصیبت میں گھبرایا نہیں کرتے''

پانچویں جلد کے صفحہ نمبر ۲۳۹۴ پر قائداعظمؒ کے یہ سنہرے الفاظ اس خطاب کی صورت میں رقم ہیں جس میں انہوں نے مزید فرمایا:

''ہم نے اپنی آزادی کی محبوب منزل حاصل کر لی ہے اور دنیا کی پانچویں بڑی اور خود مختار مملکت قائم کر چکے ہیں۔ وہ آزادی جو کوئی قوم مشکلات اور قربانی کے بغیر حاصل نہیں کر سکتی۔'' تین صفحات پر مشتمل یہ خطاب قاری پر سحر پھونک دیتا ہے۔

تحریک آزادی کے دیگر نامور راہنماؤں اور ہمنواؤں کی نادر اور قیمتی تصاویر اور جناحؒ کے یادگار تاریخی لمحات کی انمول تصاویر نے جہاں، جہان قائدؒ کو چار چاند لگانے کا کام بخوبی انجام دیا ہے وہیں اس کی جلد اول میں ملک کی نامی گرامی شخصیات کی قیمتی آراء بھی اس کتاب کی بابت شامل کی گئی ہیں۔

نام: روح آشنا' **مصنفہ:** شاز ملک' **اشاعت و ملنے کا پتا:** ماورا بکس ۶۰ شاہراہ قائداعظم لاہور' **قیمت:** ۵۰۰ روپے
فون نمبر ۰۴۲-۳۶۳۰۳۳۹۰

شاز ملک وطن سے دور پیرس جیسے جدید اور مغربی معاشرے میں اسلامی ڈھانچے میں ڈھلی ہوئی ایک ممتاز ادیبہ' شاعرہ اور ناول نگار ہیں۔ اس سے پہلے ان کی شاعری کی ایک کتاب ''دل سمندر تو ذات صحرا ہے'' شائع ہو چکی۔ یہ ان کا پہلا ناول ہے جس کے ایک ایک لفظ سے عشق حقیقی کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ ممتاز شاعر خالد شریف لکھتے ہیں کہ شاز ملک درد آشنائی کے مرحلے سے گزر کر راہ سلوک کی کٹھنائیوں پر دستک دیتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ روح کا روح سے آشنا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن اسے خوبصورت الفاظ میں قید کر کے قاری کی فہم و فراست تک پہنچانا مصنفہ کا اصل کمال ہے۔

رسمی طور پر اسے ناول ہی کہا جائے گا لیکن اسے عبادت اور ریاضت کے درمیان کی کوئی گمشدہ کڑی کہنا زیادہ صحیح ہو گا جسے مصنفہ نے اپنی محبّت کے معجزے میں قید کر لیا ہے۔

مجاز سے حقیقت ابدی کی جانب سفر کرتی ہوئی محبّت جو مسجود ملائک بھی ہے اور محبوب رب ارض وسما بھی۔ روح کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی یہ تحریر اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تفہیم کرتی ہے کہ صاحبان لوح و قلم کا منصب محض تفریح مہیا کرنا نہیں بلکہ ارفع مقاصد اور زندگی و مابعد زندگی کے بارے میں ہدایت کی راہ دکھانا بھی ہے۔ یہ خوبصورت ناول آنے والے ادیبوں کے لیے یقیناً ایک مثال بن سکتا ہے۔

نام: مصریات (سفرنامہ)' **مصنف:** محمد سعید جاوید' **اشاعت و ملنے کا پتا:** بک ہوم' بک اسٹریٹ ۴۶ مزنگ روڈ لاہور' **قیمت:** ۸۰۰ روپے' **فون نمبر** ۰۴۲-۳۷۲۴۵۰۷۲

محمد سعید جاوید اس سے پہلے اپنی سوانح عمری تحریر کر کے ادبی و صحافتی حلقوں میں داد وصول کر چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے دورہ مصر کا ایک مکمّل تعارف اور سفرنامہ ہے۔ جس میں انھوں نے دور جدید کے مصریوں اور قدیم فرعونوں

کے ساتھ گزارے ہوئے خوشگوار لمحات کو انتہائی دلچسپ پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ طبیعت لمحے بھر کو بھی بیزار نہیں ہوتی۔ گویا انھوں نے ہنسی مذاق میں ہی قارئین کو مصر کی تاریخ اور جغرافیہ پڑھا دیا ہے۔ اختر عباس اس سفرنامے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس میں شگفتہ اندازِ بیاں ہی نہیں واقعات کی ندرت' مصنّف کی سادگی اور معصومیت بھی ہے۔ پروفیسر حنیف شاہد کہتے ہیں کہ کتاب سے مصریوں کے رویوں، عادات واطوار اور رہن سہن کے بارے میں بے شمار معلومات میسر آتی ہیں۔ نمایاں ابواب میں قاہرہ کا عجائب گھر' اہرام مصر' مصری تاریخ وجغرافیہ' الاقصر کے مندر' اسوان کا شہر اور کلچر شامل ہیں۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک خوبصورت تخلیق اور جامع تفسیرِ مصر ہے۔

نام کتاب: خطبات اقبالؒ میں قرآنی حوالے اور مباحث: تحقیق وتالیف: مسعود احمد خان، اشاعت: اظہار سنز لاہور، قیمت: ۴۵۰ روپے، ملنے کا پتا: اظہار سنز ۱۹۔ اردو بازار لاہور، فون ۰۳۰۰-۴۱۰۶۳۵۷

مسعود احمد خان کا تعلّق شعبہ تعلیم سے رہا ہے۔ انھوں نے تاریخ واقبال شناسی کی خدمات پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ علاوہ ازیں کئی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ زیرتبصرہ کتاب خطبات اقبال میں قرآنی حوالوں کی توثیق اور تحقیق کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی زوال اور علمی جمود قوت وسطوت کے خاتمے کی وجہ اسلام میں مزید تحقیق کا نہ ہونا قرار دیا ہے۔ وہ ایک جگہ علم اور مذہبی مشاہدات کے باب میں خطبے کے اہم نکات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تحصیل علم کے تین ذرائع ہیں: حواس، عقل اور وجدان۔ اگر حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم کی صحت عقل کے ذریعے پرکھی جاسکتی ہے تو وجدان کے ذریعے حاصل کردہ علم کی جانچ بھی عقلی اور عملی معیار کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ عقلی معیار سے مراد ناقدانہ تعبیر ہے اور اس سے فلسفی کام لیتا ہے جبکہ عملی معیار معلومات ومشاہدات کے نتائج کو دیکھنا ہے اور اس سے اللہ کا نبی کام لیتا ہے۔ اس کتاب میں علم اور مذہبی مشاہدات' مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار' ذاتِ الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا' خودی جبر وقدر' حیات بعد الموت' اسلامی ثقافت کی روح' الاجتہاد فی الاسلام' وغیرہ کے موضوعات پر نہایت عمیق انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ جو بہت محنت اور تحقیق طلب کام ہے۔

نام کتاب: مسدس حالی: مصنّف: مولانا الطاف حسین حالی: تحقیق' تدوین وتشریح: ڈاکٹر سید تقی عابدی: اشاعت: بک کارنر جہلم' قیمت ۶۰۰ روپے ملنے کا پتا: بک کارنر پرنٹرز' پبلشرز اینڈ بک سیلرز جہلم فون نمبر: ۰۵۴۴-۶۱۴۹۷۷

ڈاکٹر سید تقی حسن عابدی ایک ممتاز تحقیق کار' ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ وہ دو درجن سے زائد کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ زیرتبصرہ کتاب ''مسدس حالی'' ان کی شاہکار پیش کش ہے۔ اس میں مولانا کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی سوانح عمری بھی شامل ہے جبکہ حالی کی حیات اور شخصیت' تجزیہ' تاثرات اکابرین' مسدس' 'عرض حال جیسے موضوعات پر بھی تحقیقی انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ بطور خاص مسدس پر جن اکابرین

کے تاثرات درج ہیں ان میں سرسید احمد خان' شیخ محمد اکرم' علامہ محمد اقبال' سید سلیمان ندوی' عبدالرحمٰن خان شیروانی' مولوی عبدالحق' سید سرراس مسعود' خواجہ غلام السیّدین' عابد حسین' رام بابو سکسینہ' رشید احمد صدیقی' صالحہ عابد حسین اور سیدہ سیدین حمید شامل ہیں۔

ممتاز شخصیات کے ان تاثرات نے جہاں مولانا حالی کا تصویری خاکہ اپنے اپنے انداز میں پیش کیا وہیں ان کی تحریری کاوش ''مسدس'' کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ مولانا حالی کی شخصیت' کردار' شاعری اور قومی خدمات کے اعتبار سے بے مثال کتاب ہے۔ اسے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

کتاب کا نام: ۱۹۴۷ء میں لدھیانہ کے مسلمانوں پر کیا گزری۔ مصنّف: محمد اسلم۔ ناشر: الخیر پبلی کیشنز' اے ٹی ایم بلڈنگ' پل کوریاں' سمندری روڈ' فیصل آباد۔ فون: ۰۴۱-۲۶۶۷۵۷۴۔ قیمت: ۳۵۰۰ روپے۔

مشرقی پنجاب میں ضلع لدھیانہ ایک مشہور علاقہ ہے۔ اس مردم خیز خطے میں کئی ممتاز ہستیوں نے جنم لیا جن میں مولانا حبیب الرحمٰن' ساحر لدھیانوی' سعادت حسن منٹو' لالہ جیت رائے نمایاں ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت ضلع لدھیانہ کی ۳۵ فیصد آبادی مسلمان تھی۔ ان مسلمانوں کی اکثریت ہجرت کر کے پاکستان چلی آئی۔ آج لدھیانہ کی کل آبادی میں صرف دو فیصد مسلمان ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ہجرت کے وقت مشرقی پنجاب کے دیگر اضلاع کی طرح لدھیانہ میں بھی سکھ اور ہندو شرپسندوں نے مسلمانوں پر روح فرسا ظلم توڑے۔ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کا مال سامان لوٹ لیا' خواتین کو ہوس کا نشانہ بنایا اور ہزارہا مسلمان شہید کر دیے گئے۔ غرض لدھیانہ کے مسلمان نہایت مصائب اور تکالیف اٹھا کر پاکستان آئے اور مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔

زیرتبصرہ کتاب کے مصنّف کے والدین بھی لدھیانہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ جب محمد اسلم نے شعور سنبھالا' تو انھوں نے والدین سے ہجرت کی تکلیف دہ اور افسوس ناک کہانی سنی۔ تبھی اسلم صاحب کو احساس ہوا کہ لدھیانہ کے دیگر خاندانوں نے بھی آگ اور خون کے دریا پار کیے ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ لدھیانہ سے تعلّق رکھنے والے بزرگوں سے انٹرویو کر کے ان کی داستانیں بھی سنی جائیں۔

مصنّف نے پھر تین سال تک دور دراز کے سفر کیے۔ اس دوران انھوں نے کئی لوگوں سے ہجرت کی داستانیں سنیں جنھوں نے عیاں کیا کہ مسلمانانِ ہندوستان نے زبردست قربانیاں دے کر پاکستان بنایا ہے۔

خاص طور پر پاکستان کی نئی نسل کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ آشکارا کرتی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جان و مال کی بیش بہا قربانیاں دے کر آزادی کی نعمت حاصل کی ہے۔ لہٰذا نوجوانوں کو اس کی ہیرے کے مانند قدر کرنا چاہیے۔

کتاب کی پیش کش عمدہ ہے اور طباعت وکاغذ معیاری۔ ۱۸۰۰ بڑے صفحات پر مشتمل اس دستاویز کی قیمت بھی معقول ہے۔ تاریخ پاکستان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک مخزن کی حیثیت رکھتی ہے۔

◆◆◆

اس میں کوئی شک نہیں کہ برسات کا موسم انسان کے اندر ولولے اور رعنائیاں بھی پیدا کرتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی موسم میں چند ایسے عوارض بھی آگھیرتے ہیں جن کی طرف سے بے پروائی برتی جائے تو یہ جان لیوا ثابت ہوسکتے ہیں۔ یہ امراض بظاہر عام سے لگتے ہیں لیکن ذرا سی بے احتیاطی انھیں بڑھاوا دے سکتی ہے۔

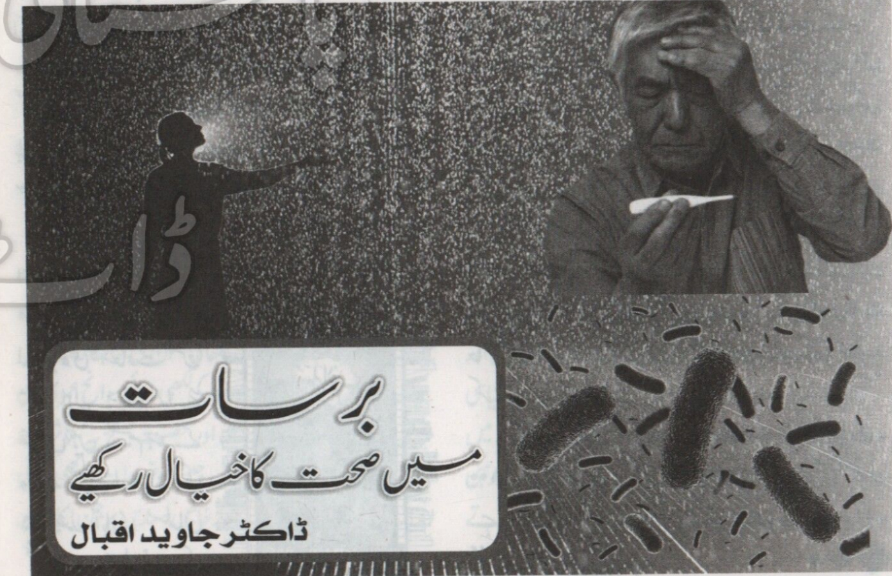
پانی جسم انسانی کی بناوٹ اور اس کی مشینری میں انجام پانے والے مختلف افعال میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی غیر موجودگی یا کمی کی صورت انسانی جسم ناکارہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن گندا اور غلاظت بھرا پانی انسانی جسم میں بے شمار امراض جنم دینے کا سبب بھی ہے۔ برسات کے موسم میں جہاں اور بہت سے امراض آگھیرتے ہیں وہیں گندے پانی کی بھی بہتات ہوتی ہے۔ اس پانی کے استعمال سے درج ذیل امراض لاحق ہوسکتے ہیں:

ہیضہ:

یہ بیماری جنم دینے والے جراثیم آلودہ غذا، پانی، کچی سبزی یا پھل کے ذریعے اعضائے انہضام میں پہنچتے ہیں۔ اس کے علاوہ گندے برتن یا ہاتھ جن پر جراثیم لگے ہوں، اس بیماری کی چھوت لگنے کا سبب بنتے ہیں۔ بیکٹیریا کی معدے میں آمد پر معدے کا تیزابی مادہ اسے راس نہیں آتا، اس وجہ سے ان بیکٹیریا کی اکثریت مرجاتی ہے لیکن جو باقی رہ جاتے ہیں وہ چھوٹی آنت تک پہنچ کر مناسب ماحول اور غذا کی فراوانی کے سبب اپنی تعداد میں سُرعت سے اضافہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچتی ہے۔

چھوٹی آنت میں بیکٹیریا کی کثرت زہریلے مادے

موسمی بیماریوں سے نمٹنے کے تیر بہدف مشورے



ٹوکسن کی افزائش کا سبب بنتی ہے۔ یہ ٹوکسن مادہ چھوٹی آنت کی اندرونی دیوار کو راس نہیں آتا اور وہ متاثر ہونے لگتی ہے۔ آنت کی اندرونی سطح کے خلیے چھٹنے لگتے ہیں (بالکل ایسے ہی جیسے سردیوں کے موسم میں جلد سے خشکی نکلتی ہے)۔ بعدازاں یہ چھوٹی آنت میں پانی اور نمکیات کے انجذاب کو روکتے اور نمکیات کو خارج کرتے ہیں۔ یوں جسم سے بہت سا پانی خارج ہوتا اور مریض پانی کی کمی یعنی (Dehyderation) کا شکار ہوجاتا ہے۔

عام طور پر ہیضہ میں قے و دست کے ساتھ پیٹ میں سخت مروڑ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بند ہیضہ میں دست اور قے بالکل نہیں ہوتے، صرف مروڑ کے ساتھ پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے، مریض کو گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے اور مریض انتہائی کمزور اور لاغر ہوجاتا ہے۔ یہ ایک شدید اور متعدی بیماری ہے جو ایک شخص سے دوسرے کو لگ سکتی ہے۔ اس لیے اسے وبائی بیماری بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ بیماری برسات کے موسم میں پھیلتی ہے۔

اس بیماری کا زمانہ حضانت (Incubation Period) دو سے لے کر پانچ ایام تک ہے۔ مرض کی شدت متفرق حالات میں مختلف ہوتی ہے۔ بعض اوقات مرض اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ مریض اتنا کمزور نہیں ہوتا کہ بستر میں بآرام لیٹنے کی ضرورت محسوس کرے۔ بعض اوقات یہ مرض اتنا شدید اور خطرناک ہوتا ہے کہ مریض ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر موت کی آغوش میں جاسکتا ہے۔ اس مرض سے بچاؤ کے لیے درج ذیل تدابیر پر عمل ضروری ہے:

۱۔ پانی ابال کر ٹھنڈا کر کے استعمال کریں۔

۲۔ تازہ اور صاف ستھرے پھل اور سبزیاں اچھی طرح دھو کر استعمال کریں۔ نیز کھانے پینے کی اشیاء کو مکھیوں سے بچا کر رکھیں۔

۳۔ ہیضہ کے مریض کے پاخانہ اور الٹی وغیرہ پر جراثیم کش ادویہ ڈال دیں یا گڑھا کھود کر دبا دیا جائے۔ جسم کی حدت برقرار رکھنے کے لیے مریض کی گرم بوتل کے ذریعے مالش کرتے رہنا چاہیے۔ کچی پیاز زیادہ استعمال کرنا ہیضہ سے بچاؤ کا موثر ذریعہ ہے۔

۴۔ ہیضہ طفلی میں بچے کو تازہ ہوا بکثرت ملنی چاہیے۔ اگر موسم اجازت دے تو بچے کو باہر کھلی جگہ رکھنا بہتر ہوتا ہے۔ نیم گرم پانی سے کپڑا بھگو کر مریض کا جسم صاف کرتے رہیں۔ مریض کی غذا سیال اور مقوی ہونی چاہیے۔

ٹائیفائیڈ بخار:

اس کو آنتوں کا انفیکشن بھی کہتے ہیں۔ ٹائیفائیڈ کے جراثیم آلودہ پانی اور غذا کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں صحت عامہ کی سہولتوں کے فقدان اور گندے پانی کی نکاسی کے ناقص نظام کے باعث یہ بیماری کثرت سے پائی جاتی ہے۔ یہ ایک متعدی مرض ہے، جو ''سالمونیلا ٹائی فی'' (Salmonella Typhi) نامی جرثومے سے پھیلتا ہے۔ یہ بیکٹیریا صرف انسانی جسم کے اندر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ ٹائیفائیڈ کے مریضوں میں یہ بیکٹیریا خون اور آنتوں میں ملتا ہے۔ سالمونیلا نامی جرثومے کی کئی اقسام ہیں جو انسانی آنتوں کو نشانہ بناتی ہیں۔ ان کی وجہ سے جو بخار ہو، اسے امعائی یعنی آنتوں کا بخار کہتے ہیں۔

اس جراثیم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف انسانوں میں پھلتے پھولتے ہیں۔ ایک انسان سے دوسرے کو لگتے ہیں۔ یوں بیمار انسان اس مرض کو پھیلاتے ہیں۔ جن لوگوں کو یہ بخار ہوا ان میں صحت یابی کے بعد بھی یہ جراثیم کم از کم ایک سال تک موجود رہتے ہیں۔ ایسے افراد کو طبی زبان میں ''کیرئیرز'' (Carriers) کہتے ہیں۔ ٹائیفائیڈ کا بیکٹیریا بیمار افراد اور کیرئیرز افراد کے فضلے سے خارج ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ ٹائیفائیڈ بخار چمٹنے کا خطرہ علامات غائب ہوجانے کے باوجود بھی برقرار رہتا ہے۔ ظاہری طور پر مرض کی علامتیں ختم ہونے کے باوجود بھی آپ کے جسم میں ٹائیفائیڈ کے جراثیم موجود رہ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں بیماری دوبارہ نمودار ہوسکتی ہے یا آپ انجانے میں یہ مرض دوسروں کو بھی منتقل کرسکتے

ہیں۔ لہٰذا اگر آپ ٹائیفائیڈ سے متاثر ہیں یا ماضی میں اس کا شکار رہ چکے اور ایسی جگہ ملازمت کرتے ہیں جہاں آپ کھانے پینے کی اشیاء یا چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال پر مامور ہیں تو اس وقت تک اپنی ملازمت پر نہ جائیں جب تک کہ معالج اس بات کی حتمی تصدیق کردے کہ آپ مکمّل طور پر صحتمند ہو چکے۔

بیماری کے مکمّل خاتمے کا اطمینان فضلہ کے ٹیسٹ (Culture Stool) کے بعد ہوتا ہے۔ اگر آپ کے جسم میں ٹائیفائیڈ کے جراثیم بالکل موجود نہیں تو فضلہ میں سالمونیلا ٹائیفائی نہیں ملے گا۔ اس عارضے سے بچاؤ کے لیے چند باتیں یاد رکھیں:

قیمہ: قیمے سے بننے والی اشیاء بشمول کباب اور برگر وغیرہ میں جراثیم بڑی تیزی سے پروان چڑھتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی طرح کی انفیکشن سے بچنے کے لیے قیمے کو اچھی طرح پکایا جائے۔

چکن: کچی یا نیم پکی ہوئی مرغی کا گوشت ٹائیفائیڈ اور کھانے کے ذریعے پھیلنے والی بیماری (فوڈ پوائزننگ) کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مرغی کے کچے گوشت سے ٹپکے ہوئے خون یا خون آلود پانی کو پکے ہوئے اور تیار شدہ کھانے پر نہ گرنے دیں۔ پولٹری کی تمام اشیاء کو اچھی طرح ۱۸۰ درجہ سینٹی گریڈ پر پکائیں۔

انڈے: انڈوں کو خوب اچھی طرح پکا کر استعمال کریں۔ کچے انڈوں کو فریج میں یا ٹھنڈی جگہ پر رکھیں۔ انڈہ پکانے کے فوراً بعد استعمال کرلیں۔ انڈے سے بنی ہوئی ڈشز اور مایونیز وغیرہ کو فریج یا ٹھنڈی جگہ پر رکھیں۔ کچے انڈے سمیٹنے کے بعد ہاتھ ہمیشہ گرم پانی اور صابن سے دھوئیں۔

سبزیاں اور پھل: سبزیاں اور پھل ہمیشہ تازہ استعمال کریں اور انہیں خوب اچھی طرح دھولیں۔

پانی اور مشروب: پینے کے پانی کو اُبال کر استعمال کریں۔

ہیپاٹائٹس اے:

ہیپاٹائٹس اے کا وائرس ٹائیفائیڈ کی طرح تیزی سے پھیلتا ہے۔ یہ ایک متعدی کیفیت ہے۔ ایک خاص قسم کے وائرس، ایچ اے وی کے جسم میں سرایت کر جانے سے جگر متاثر ہونے لگتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں عام مرض ہے۔ چھوٹے بچوں میں عموماً بچپن کے یرقان کا باعث بنتا ہے۔ عموماً لوگ اس وائرس کو زیادہ خطرناک نہیں سمجھتے۔

یہ بات درست ہے کہ اس سے متاثرہ افراد بی اور سی ہیپاٹائٹس کی نسبت کم خطرے میں ہوتے اور عموماً پوری طرح صحت یاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن یہ امکان رَد نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے متاثرہ افراد بھی بہت سی طبی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وائرس اے کے اسباب بھی برسات کے موسم میں عام ہوتے ہیں جیسے: صاف پانی کی عدم دستیابی، استعمال شدہ پانی یا گٹر کی پانی کی نکاسی کا ناقص انتظام، شہری آبادی میں بے ہنگم اضافہ اور گندگی کا اضافہ وغیرہ۔

یاد رہے کہ ہیپاٹائٹس اے کا وائرس مریض کی انتڑیوں میں سے پاخانے کے راستے خارج ہوتا ہے۔ یہ مختلف ذرائع سے دوسرے انسانوں میں منتقل ہوتا ہے مثلاً مکھیوں کے کھانے پینے کی چیزوں پر بیٹھنے، ہاتھوں کو رفع حاجت کے بعد اچھی طرح صابن وغیرہ سے نہ دھونے اور کھانے پینے کی چیزوں کو ہاتھ لگانے سے۔

عموماً اس مرض سے متاثرہ مریض کا کھانا پینا بند کر دیا جاتا ہے اور صرف جھاڑ پھونک ہی کروائی جاتی ہے۔ رُوحانی علاج کی افادیت اپنی جگہ لیکن مریض کو مناسب ادویہ اور خوراک بھی استعمال کروانا چاہیے تاکہ وہ کمزور نہ ہو۔ واضح رہے کہ اس مرض کے لیے پرہیز بھی کوئی خاص نہیں ہوتا بلکہ یوں کہہ لیں کہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ ہاں اتنا خیال رکھیں کہ مریض کو بہت زیادہ چکنائی نہ دیں۔ مشروبات کا استعمال زیادہ کروائیں اور آرام زیادہ سے زیادہ کرائیے۔

اسہال:

موسمِ برسات میں لاحق ہونے والا عام عارضہ اسہال بھی ہے۔ بار بار پتلا اور نرم پاخانہ خارج ہو تو اسے اسہال کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ دراصل کوئی بیماری نہیں بلکہ ایک علامت ہے۔

اصل مرض انتڑیوں اور معدہ کی مخاطی جھلی کی سوزش ہے جس کی وجہ سے ہاضمہ کا نظام خراب ہوتا یا کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس مرض میں عام طور پر پیچش کی طرح مروڑ نہیں پڑتے اور پاخانہ کرتے ہوئے زور بھی نہیں لگانا پڑتا۔ پانچ سال سے کم عمر بچوں کی ہونے والی اموات میں ایک تہائی کا سبب اسہال ہی ہوتا ہے۔

یہ مرض پیدا کرنے والے جراثیم متفرق علاقوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موسموں میں مختلف قسم کے جراثیم حملہ آور ہوتے ہیں ۔ برسات کا موسم ان جراثیموں کا پسندیدہ ہوتا ہے کیوں کہ اس میں یہ اپنی نمو بہت زیادہ کرتے ہیں۔ اسہال کے تقریباً ایک تہائی واقعات اسی وائرس کا نتیجہ ہیں جن میں ''رُوٹا'' نامی وائرس زیادہ عام ہے۔ باقی ماندہ مریض مختلف اقسام کے جراثیم کا نشانہ بنتے ہیں۔ بچے عموماً غذائی بے احتیاطی کی وجہ سے اسہال کا شکار ہوتے ہیں۔

اسہال سے متاثرہ بیشتر بچوں کو دوا سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان کے جسم میں پانی کی شدید کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں دورانِ علاج او آر ایس (Oral Rehydration Solution) یا نمکین پانی پلانا مفید رہتا ہے۔ او آر ایس میں گلوکوز اور دیگر عناصر بچے کو مطلوبہ غذائیت فراہم کرتے ہیں۔

مچھر کاٹنے کے سبب لاحق امراض:

برسات اور مچھر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں لیکن چند احتیاطی تدابیر اختیار کر کے مچھروں سے بچاؤ ممکن ہے۔ ملیریا اور ڈینگی بخار کا وائرس انسانی جسم میں متاثرہ مادہ مچھر کے ذریعے پھیلتا ہے۔ مچھر عام طور پر کسی متاثرہ انسان کا خون چوستے وقت یہ وائرس حاصل کر لیتا ہے۔ تقریباً آٹھ دس دن بعد اس قابل ہوتا ہے کہ اس وائرس کو کسی تندرست انسان کے اندر منتقل کر سکے۔ متاثرہ مادہ مچھر اپنے یہ اثرات اپنے انڈوں کے ذریعے بھی انسانوں تک پہنچا سکتی ہے جیسے کسی کھانے پینے والی چیز پر اپنے انڈے دے ڈالے۔

انسانی جسم اس وائرس کا بہترین میزبان ثابت ہوتا ہے۔ مشاہدات و تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ بندر بھی اس وائرس سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہ وائرس انسانی خون میں دو سے سات دن کے اندر اندر پوری طرح سرایت کر جاتا ہے۔ فوراً ہی انسان میں اس کی علامات جیسے بخار، سر درد اور جسم کا درد وغیرہ ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ ڈینگی اور ملیریا سے بچاؤ کے لیے درج ذیل ہدایات پر عمل کریں:

☆ پانی ذخیرہ کرنے والے برتنوں اور پانی کی ٹینکی ڈھانپ کر رکھیں۔

☆ مچھروں سے بچاؤ کے لیے دروازے اور کھڑکیوں پر جالی لگائیں تاکہ وہ اندر نہ آنے پائیں۔ کمرے کے اندر کوئی مچھر محسوس ہو تو میٹ یا کوائل استعمال کریں۔ اس کے علاوہ پورے گھر میں مچھر مار اسپرے کروائیں۔

☆ چھوٹے اور شیر خوار بچوں کو مچھر دانی سے باہر ہرگز نہ سلائیں۔

☆ گھر میں صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھیں اور گندگی اکھٹی نہ ہونے دیں۔ نیز علامات ظاہر ہونے پر فوری طور پر قریبی ہسپتال سے رجوع کریں۔

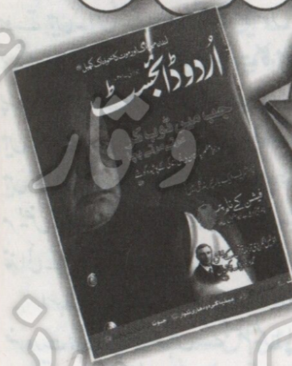
پانی یا بارش میں بھیگ جانے سے وابستہ امراض:

برسات کے موسم میں سانس کے عوارض بھی لاحق ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے افراد کو الرجی کا عارضہ ہو سکتا ہے۔ بارش میں بھیگ جانے کے سبب کھانسی، نزلہ، زکام اور فلو کی کیفیت ہو سکتی ہے۔ جب ناک سے پتلا مواد خارج ہونے لگے اور اس کا عمومی سبب ناک کی سوزش ہو تو اسے زکام کہا جاتا ہے۔ یہی رطوبت اگر حلق میں ٹپکنے لگے تو اسے نزلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آج کل فلو اور انفلوئنزا جیسے امراض بھی زبان زدِ عام ہیں۔ فلو اور انفلوئنزا ایک ہی بیماری کے دو نام ہیں۔ دراصل جو وبائی زکام جراثیم کے سبب چمٹے، اس کو فلو یا انفلوئنزا کہتے ہیں۔ یہ اکثر موسمِ برسات میں انسان کو چمٹ جاتا ہے۔

◆◆◆





قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

اُردو ڈائجسٹ آج ایک تناور درخت بن چکا۔طیب اعجاز قریشی کا ایگزیکٹیو نوٹ ہر ماہ نئے انداز سے نظر نواز ہوتا ہے۔شمارۂ جولائی میں اشفاق احمد کا طویل افسانہ بہت دلکش تھا۔شمارے کی تعریف کرنا گویا سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے۔

(نقی حسین نقی امروہی، کراچی)

☆☆☆☆☆

ہمارے ملک کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ فحاشی، بے باکی اور بے لباسی کو دانستہ فروغ دیا جا رہا ہے اور اشرف المخلوقات شیطان کے بہکاوے میں، اس کی مکروہ چالوں میں پھنستا چلا جا رہا خصوصاً مسلمانوں کو مادر پدر آزادی کی طرف مائل ہوتا دیکھ کر واقعی دل خون کے آنسو روتا ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ ہم ترقی معکوس کرتے ہوئے دوبارہ پتوں والی دنیا میں جا رہے۔انسان ایک بار پھر پتوں سے اپنا جسم ڈھانکنے کی طرف راغب ہو رہا ہے۔ یہ رذیل لوگ ہیں خواہ کتنے ہی تعلیم یافتہ ہوں۔ یہ بدترین جاہل ہیں۔ یہی تو ہیں جنہوں نے وطنِ عزیز کا نقشہ بگاڑا ہے۔

اس بار فیشن اور حیا کے موضوع پر جو مضمون چھپا وہ بہت سے دردمندوں اور دکھی دلوں کی فریاد ہے۔ یہ فکرانگیز تحریر دل کو لگی لیکن فکرانگیز تو ان لوگوں کے لیے جن لوگوں کو آپ جگانا چاہ رہے ہیں مگر جو جاگنا ہی نہ چاہیں ان کے لیے صدائے بے وقوفانہ و بے درماں ہے۔ تاہم ہم اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے۔

(رضی الدین سید۔کراچی)

☆☆☆☆☆

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اردو ڈائجسٹ نے اردو زبان و ادب اور ملکی و بین الاقوامی سیاست کے بے لاگ تجزیوں کے ذریعے کئی نسلوں کو متاثر کیا اور ان کے ذہنوں کی آبیاری کی۔ ہماری تین نسلوں سے یہ رسالہ انتہائی ذوق وشوق سے پڑھا جا رہا ہے اور مشرقی روایات اور خاندانی اقتدار کے ضمن میں اسلامی اور پاکستانیت کے جذبے کو بچپن سے ہی راسخ کرنے کے سلسلے میں اردو ڈائجسٹ کا کردار اظہر من الشمس ہے۔الطاف حسن قریشی صاحب کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے جناب طیب اعجاز قریشی کا ادارتی نوٹ حالات حاضرہ کی مختصر مگر جامع تصویر کشی کرتا نظر آتا ہے۔

دو تجاویز پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، امید ہے کہ انہیں درخورِ اعتنا کیا جائے گا۔ اول، ڈائجسٹ میں بچوں کے صفحات کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے اور دوئم، جیسا کہ آج کل انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے تو اس بارے میں بھی معلوماتی مضامین تواتر کے ساتھ شامل کیے جانے چاہئیں۔

شامی مسلمانوں کی مدد کے سلسلے میں اردو ڈائجسٹ اور کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی کا سیمینار ملی جذبے کے تحت ایک قابل قدر اور ہمدردانہ کاوش تھے۔اس کے علاوہ ''لندن میں آگ'' مضمون نے ان ترقی یافتہ ممالک کے نظام کی خامیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے مثبت کردار نے اسلام کے دہشت پسندانہ جعلی تصویر کی نفی کر دی۔

(مرزا اسانول بیگ۔بہاولپور)

اسلام اور حب الوطنی کا فروغ ہی اردو ڈائجسٹ کی اساس ہے اور اشاعت کے پہلے دن سے آج تک یہی ہمارا مطمحِ نظر بھی۔اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا اندازہ آپ جیسے قارئین کے تبصروں سے ہی ہوتا ہے۔آپ کی دونوں تجاویز صائب ہیں۔ آنے والے دنوں میں بچوں کے صفحات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے بارے میں مضامین کا سلسلہ زیرِ غور ہے۔ امید ہے جلد ہی آپ ان کو رسالے میں موجود پائیں گے۔

(شکریہ۔ادارہ)

☆☆☆☆☆

آپ سب کی محنت رنگ لا رہی ہے۔ مارکیٹ میں اردو ڈائجسٹ کا کوئی مقابل نہیں۔ ہر شمارہ ایک مکمل کتاب ہے۔ جو رنگ برنگے مفید معلوماتی اور اہمیت کی حامل تحریروں سے مزین ہوتا ہے محترم سید عاصم محمود، ڈاکٹر آصف محمود جاہ اور ذیشان محمد بیگ کی مستقل شمولیت سے رسالہ مزید ترقی کرے گا۔

(محمد خلیل چودھری، دینہ، ضلع جہلم)

محترم! آپ کی تمام تجاویز نوٹ کر لی ہیں اور ادارتی بورڈ ضرور ان پر غور کرے گا۔جگہ کی کمی کے باعث پورا خط شائع کرنا ممکن نہ تھا مگر خاطر جمع رکھیں آپ جلد ہی اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ کو نئی روشن تبدیلیوں سے مزین پائیں گے۔ انشاللہ۔

(شکریہ۔ادارہ)

☆☆☆☆☆

میں اُردو ڈائجسٹ کے مضامین شوق سے پڑھتا ہوں۔ماشااللہ بہت معیاری ہوتے ہیں۔کامیاب رسالہ نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

(پروفیسر ڈاکٹر بابر علی، ملتان)

☆☆☆☆☆

وینکوور کی پبلک لائبریری

پاکستان سے اتنی دور یہاں کی پبلک لائبریری میں اُردو ڈائجسٹ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ اُمید ہے آپ لوگوں کی ادبی اور انتظامی کاوشوں کی بدولت اُردو ڈائجسٹ مزید ترقی پائے گا۔

(طاہر خان، وینکوور، کینیڈا)

محترم! یقین کیجیے کہ جتنی خوشی آپ کو اپنا پسندیدہ رسالہ بیرونِ ملک پھلتے پھولتے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ خوشی ہمیں آپ کی محبّت اور قدر دانی پر محسوس ہوتی ہے۔آپ کا بے حد شکریہ۔

(ادارہ)

ماہ جولائی کے شمارے میں کہانی اتفاق اور راضی برضا بہت اچھی لگیں۔ مضامین میں کلمہ طیبہ والا برطانوی سکہ، نومسلم مارما محمد پکتھال اور لندن میں آگ بہت معلومات افزا تھے۔ اس کے علاوہ فیشن دیوتا کے چرنوں میں میڈیا کی دودھاری تلوار واقعی لمحۂ فکریہ لیے ہوئے مضامین تھے۔ ہمیں بحیثیت قوم اس حوالے سے سوچنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ادارے کو مزید ترقی دے۔

(ڈاکٹر ثمینہ کوثر۔ لاہور)

محترمہ! ڈائجسٹ کی پسندیدگی پر ہم آپ کے شکرگزار ہیں اور ہماری کوشش رہے گی کہ یونہی ہر ماہ نئی کاوشوں اور تبدیلیوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں رنگا رنگ شمارہ پیش کرتے رہیں۔

شکریہ۔ ادارہ

☆☆☆☆☆

میں نے آپ کو اِس سے پہلے بھی ایک خط لکھا۔ مگر...... کوئی پوسٹ نہیں کرواتا تھا کہ بس صرف ایک خط کون پوسٹ کروائے، ساتھ کچھ اور بھی تو ہو۔ اور یہ ”کچھ اور“...... اُف، کچھ بھی تو لکھا ہوا آپ کے معیار کا نہیں لگ رہا تھا۔

پہلی دو کہانیوں کے چھپنے کے بعد، تو اب میں اور بھی زیادہ محتاط ہوگئی کہ کچھ ایسا لکھوں جو آپ کے معیار پہ پورا اُتر سکے۔

وقت کو اگر کچھ پیچھے لے جائیں تو...... ملک عراق ہے۔ اب تلک لے آئیں تو مصر ہے، یا پھر شام اور تھوڑا آگے لے جائیں تو......؟ فرض کریں اگر ہم ہوں، تو......؟ کیا اب بھی خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوں گے، ہم یوں، ہی ایک ایک کر کے ہر مسلم ملک کو اور اُس میں موجود مسلمانوں کو کٹتے، مرتے دیکھتے رہیں گے اور ایک پیغام ہے اپنے شامی بہن بھائیوں کے نام...... یہ زندگی تو تھوڑی سی ہے ناں...... کچھ ہی برس...... اِن تکالیف سے گھبرا کر بھلا ایمان کیوں کھونا۔ ایمان زیادہ قیمتی ہے ناں...... جان سے اور بچوں سے بھی......

اللہ آپ کو اپنی بارگاہ میں سرخرو کرے اور ہمیں بھی...... آمین......

(فائزہ ثمرین۔ ڈی آئی خان)

☆☆☆☆☆

محترمہ! آپ کیا خوب لکھتی ہیں۔ خط لکھنے کا انداز ہمیں بہت بھایا اور ہم نے اسے اس محفل میں شامل کرلیا۔ اندازِ تحریر بتاتا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو ہلکی پھلکی اور طنز و مزاح پر مبنی تحاریر پر بھی قسمت آزمائی کرسکتی ہیں۔ حوصلہ افزائی کرنے کے لیے ہم ہیں نا! خوش رہیئے آباد رہیئے۔

شکریہ۔ ادارہ

☆☆☆☆☆

اُردو ڈائجسٹ جولائی کا شمارہ اپنی تمام تر خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ رہا۔ سبھی مضامین مکمّل اور بھرپور تھے۔ ایک گزارش ہے کہ اگر ممکن ہو تو سالانہ خریداری فارم کو صفحے پر کسی ایسی جگہ چھاپا کریں کہ اسے علیحدہ کرتے وقت اس کے پیچھے موجود کسی اچھی تحریر کی قربانی نہ دینا پڑے۔ اس مرتبہ فارم کے دوسری طرف اشفاق احمد صاحب کی تحریر تھی۔ فارم کاٹتے وقت دل بہت دُکھا۔ اُمید ہے آپ اس گزارش پر غور کریں گے۔

(محمد سلیم۔ راولپنڈی)

محترم! واقعی آپ نے ایک نہایت اہم نکتے کی طرف نشاندہی فرمائی ہے۔ نادانستگی میں ایسا کچھ ہو جاتا ہے جس پر قارئین کے توجہ دلانے پر فوری طور پر ہم نہ صرف اس خامی کو درست کرتے ہیں بلکہ ہماری یہ بھی کوشش رہتی ہے کہ آئندہ ایسی کوئی کوتاہی نہ ہو جو ہمارے معزز قارئین کو گراں گزرے۔ آپ ہمیں فون پر اپنا ای میل بتا دیجیے گا۔ ہم آپ کو اشفاق صاحب کی وہ کہانی بذریعہ ای میل بھیج کر آپ کے دکھ کا مداوا کرنے کی کوشش کریں گے۔

شکریہ۔ ادارہ